خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
سسپنس ڈائجسٹ
اہنامہ
مارچ ۱۹۸۷ء
men
demand
CAPSTAN
the world
over
CAPSTAN
FILTER
CAPSTAN
FILTER KINGS
سرورق مطبوعہ ہمدرد پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ۔ فون: ۲۱۳۲۶۲

پبلشر:
ماہ مبین ایم اے

پرنٹر:
ابنِ حسن

مطبوعہ:
ابنِ حسن پرنٹنگ پریس
ہاکی اسٹیڈیم۔ کراچی

یکے از مطبوعات:
جاسوسی ڈائجسٹ پبلیکیشنز
سعید مینشن
بلیموریا اسٹریٹ
آئی آئی چندریگر روڈ
کراچی

جلد: ۱۶
شمارہ: ۳
قیمت فی پرچا: ۱۲ روپے
زرِ سالانہ: ۱۸۰ روپے

مقامِ اشاعت:
سعید مینشن
بلیموریا اسٹریٹ
آئی آئی چندریگر روڈ
کراچی

خط و کتابت کا پتا:
پوسٹ بکس نمبر ۲۱۵
کراچی

In order to Join WhatsApp group

1. Go to an individual or group chat.
2. Tap the camera icon.
3. Select the image with the QR code to scan.
4. Tap Add to contacts.

THE BOOK'S HIVE

WhatsApp group

آپ کے خط

معراج رسول

عزیزانِ من! السلام علیکم۔

امید ہے سسپنس فیملی خیریت سے ہوگی۔ ہماری خیریت کے بارے میں عرض یہ ہے کہ آگ اور دھوئیں کے جو بادل چھائے ہوئے تھے، وہ کافی حد تک چھٹ گئے ہیں۔ اس لیے سانس لینے میں آسانی ہونے لگی ہے۔ تاہم اب بھی کبھی کبھار دھوئیں کا کوئی مرغولا پاس سے گزر جاتا ہے جس کی وجہ سے کھانسی آنے لگتی ہے۔ کبھی کبھی زکام بھی ہو جاتا ہے اور آنکھوں سے پانی بہنے لگتا ہے لیکن بعد میں پتا چلتا ہے کہ کسی علاقے سے ہوا میں آنسو گیس شامل ہو کر ہم تک آ پہنچی تھی۔ بہرحال... زیادہ بُرے مناظر دیکھنے کے بعد کم بُرے مناظر پر خدا کا شکر ہی ادا کرنے کو جی چاہتا ہے۔

عزیز قارئین! اس مرتبہ ہمیں کچھ اپنا رونا بھی رونا ہے۔ ہر تھوڑے عرصے کے بعد یہ رونا رونا پاکستانی اخبارات و رسائل کا مقدر بن چکا ہے۔ نیوز پرنٹ جو دنیا کے بیشتر ممالک میں ردّی ترین کاغذ سمجھا جاتا ہے، ہمارے ہاں ہمیشہ سونے سے زیادہ اہم رہا ہے۔ پالیسیاں ہمیشہ سے ایسی رہی ہیں کہ یا تو نیوز پرنٹ اکثر و بیشتر غائب ہو جایا کرے، تمام اخبارات و رسائل نیوز پرنٹ کے حصول کے لیے کسی نہ کسی ادارے کے محتاج رہیں یا ہر تھوڑے عرصے بعد اس کی قیمت میں ہوشربا اضافہ ہوتا ہے۔ اس وقت بھی صرف رسائل ہی نہیں، بڑے بڑے اخبارات بھی کاغذ کے بحران میں مبتلا ہیں۔ پچھلے چھ ماہ میں کاغذ کی قیمتوں میں تقریباً چالیس فیصد اضافہ ہوا ہے۔ طباعت سے متعلق دیگر اخراجات میں بھی تقریباً پچیس فیصد اضافہ ہوا ہے۔ صرف چھ ماہ میں! مجبوراً تمام اخبارات و رسائل اپنے صفحات میں کمی کر رہے ہیں۔ ہم بھی مجبوراً سسپنس کے بتیس صفحات کم کر رہے ہیں۔ اگر مندرجہ بالا اخراجات کے اضافے کو مدِنظر رکھا جائے تو صفحات کی یہ کمی نہایت معمولی ہے۔ دوسرا راستہ قیمت میں اضافے کا تھا لیکن اس مرحلے پر ہم نے قیمت بڑھانا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ بہت سے قارئین اگر اسے برداشت کر سکتے ہیں تو بہت سے قارئین ایسے بھی ہیں جن کے لیے یہ ناقابلِ قبول یا کم از کم ناپسندیدہ ضرور ہوتا۔ صفحات کی اس کمی کو فی الحال تو مستقل ہی سمجھیے کیونکہ یہ بات تو طے ہے کہ ہمارے ہاں نیوز پرنٹ کا کارخانہ تو کبھی لگے گا نہیں۔ اس مکروہ حقیقت پر شرمندہ تو اوروں کو ہونا چاہیے لیکن فی الحال ہماری ہی شرمندگی اور معذرت قبول کیجیے۔

دوسری اطلاع یہ ہے کہ آئندہ ماہ سے سسپنس کا مستقل اور مقبول سلسلہ "میرا خیال" ختم کیا جا رہا ہے کیونکہ سسپنس میں یہ سلسلہ شروع ہونے کے بعد تقریباً سبھی ماہناموں وغیرہ میں بھی اس کا آغاز ہو گیا تھا۔ اس کی جگہ ہم کوئی اور سلسلہ شروع کرنا چاہتے ہیں جس میں زیادہ سے زیادہ قارئین دلچسپی سے حصّہ لے سکیں۔ اس ضمن میں قارئین سے درخواست ہے کہ وہ اپنی تجاویز ارسال فرمائیں۔ جن صاحب یا صاحبہ کی تجویز پسند آئی اور اس پر عملدرآمد کا فیصلہ کیا گیا، ان کی خدمت میں سسپنس اس وقت تک اعزازی طور پر ارسال کیا جائے گا جب تک وہ سلسلہ سسپنس میں شائع ہوتا رہے گا۔ امید ہے قارئین اپنی تمام تر ذہنی صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے تجاویز ارسال فرمائیں گے۔

پچھلے دو ماہ سے سسپنس کی اشاعت میں قدرے تاخیر اور خطوط کے صفحات میں ہمارے جوابات شاملِ اشاعت نہ ہونے پر قدرے خفگی کا اظہار کیا ہے لیکن ساتھ ہی ہمارے حالات سے آگاہ ہونے کی وجہ سے اظہارِ ہمدردی بھی کیا ہے۔ تمام مہربانوں اور کرم فرماؤں کے پُرخلوص جذبات کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔ اب آئیے خطوط کی طرف۔

حیات گل سوگڑھ، مسلم باغ سے لکھتے ہیں "میں بی ایس سی کا اسٹوڈنٹ ہوں۔ پڑھائی میں سے بمشکل دو تین دن نکال کر سسپنس کے مطالعے میں صرف کرتا ہوں یعنی صرف اتنا وقت کہ جس سے تعلیم پر اثر نہ پڑے۔ ہمارے علاقے میں رسالہ پہنچتا بھی دیر سے ہے۔ اس لیے شاید ہمارا لکھا ہوا خط بھی لیٹ ہو جاتا ہے تبھی آپ نے کبھی جواب نہیں دیا۔ فروری کا شمارہ میرے سامنے ہے اور یہ ایک ایسا گلدستہ ہے جس کا ہر پھول تر و تازہ اور کھلا ہوا ہے۔ سرورق بھی بہت خوب ہے لیکن لڑکی کا ایک کان چھوٹا نظر آ رہا ہے۔" برادرم حیات! اللہ تمھاری حیاتی دراز کرے۔ عرض یہ ہے کہ اگر سرورق کی لڑکی کے کان خرگوش جتنے لمبے ہوتے تب بھی اسے وہ بات سنائی نہ دیتی جو آپ اس کے کان میں کہنا چاہتے ہیں۔

محمد وحید، کوہاٹ سے رقمطراز ہیں "میں نے تقریباً پانچ مرتبہ آپ کے نام خط لکھا لیکن پھر خود ہی ہر بار پھاڑ دیا۔ کیونکہ سسپنس کے لیے میرے دل میں جو جذبات ہیں انھیں نہ تو میرا قلم تحریر کر سکتا ہے اور نہ ہی کسی اور کا۔ ویسے تو سسپنس کی تمام کہانیاں خوب ہوتی ہیں لیکن میری سب سے زیادہ پسندیدہ کہانیاں دیوتا، تاریخی کہانی اور موت کے سوداگر ہیں۔ میں سسپنس کا زیادہ پرانا تو نہیں لیکن شدید سے بہرحال عاشق ہوں اور اب عالم یہ ہے کہ سسپنس اگر مجھ کو نہ ملے تو میں کھانا نہیں کھا سکتا۔" حیرت ہے! ویسے بھائی وحید! آپس کی بات ہے... خواہ کان میں بتا دیں۔ آپ کہیں سسپنس کو پلیٹ کے طور پر تو استعمال نہیں کرتے؟

ناصر شفیق راجپوت، کراچی سے لکھتے ہیں "آپ دوسروں کی وضاحت سنے بغیر شرمندہ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

ے پچھلے خط کے جواب میں آپ نے لکھ دیا کہ یہ وہی ناصر شفیق پتھر ہیں جو اپنے آپ کو پہلے پارس لکھا کرتے تھے۔ دشمن چاچا! میں نے اپنا تخلص پارس سے بدل کر پتھر اس لیے کر لیا کہ اب انسان پتھر ہی تو بن گیا ہے۔ آپ خود ہی بتائیں انسانوں میں کون سی بات انسانوں والی رہ گئی ہے؟ پارس تو بہت دور کی بات ہے۔ لہٰذا ہم اپنا تخلص پتھر نہ رکھیں تو اور کیا رکھیں؟" برادرم! آپ خوامخواہ پتھروں کو انسانوں سے تشبیہ دے رہے ہیں۔ پتھر برا منا جائیں گے۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ پتھر بے چارہ کتنی بے ضرر سی چیز ہے۔ خاموشی سے ایک طرف ساکت پڑا رہتا ہے۔ یہ تو انسان ہی ہے جو اسے ہاتھوں میں اٹھا کر پتھراؤ شروع کرتا ہے اور دوسروں کو لہولہان کرتا ہے۔

جہان سسٹرز، ملتان سے اس بار خط کا آغاز ایک شعر سے کر رہی ہیں "ع ہمیں اس کا کوئی بھی حق نہیں کہ شریکِ بزمِ خلوص ہوں ۔ نہ ہمارے پاس نقاب ہے نہ کچھ آستیں میں چھپا ہوا۔ آپ کی شرارتی بھتیجیاں حاضر ہیں۔ نئے سال کی مبارکباد کچھ پرانی سی ہو گئی ہے لیکن خلوص شامل ہو تو باسی چیز بھی قبول کر لینی چاہیے۔ نئے سال کے بارے میں کیا عرض کریں۔ جو گزر چکا وہ بہتر تھا، جو گزر رہا ہے وہ بہترین ہے۔ جو گزرنے والا ہے وہ نامعلوم ہے۔ معلوم سے زیادہ نامعلوم کا خوف طاری رہتا ہے۔ انتظار کتنی بے رحم چیز ہے لیکن..... اس کے ساتھ ہی امید بہت حسین چیز ہے۔ امید اسی وقت حسین ہو سکتی ہے جب خوش آئند ہو اور خوش آئند امید کے لیے بھی انتظار جیسی بے رحم چیز درمیان میں حائل ہے..." خدا کی پناہ بھتیجیو! شکر کریں کہ ہم نے آخر میں آپ کا نام پڑھ لیا۔ ورنہ ہم تو یہ خط سیدھا لاہور ٹی وی سنٹر کو بھجوانے لگے تھے۔ ہم سمجھے تھے کہ شاید ڈراما ۸۰ء کا کوئی گمشدہ ورق ہے اور غلطی سے ہماری ڈاک میں آ گیا ہے۔

محمد حسن رضا مظفر گوندل، منڈی بہاؤالدین سے لکھتے ہیں "ہر بار سسپنس آنے پر ہمیں کالج کی لیبارٹری میں جانا پڑتا ہے تاکہ خوردبین مستعار لے کر دیکھ سکیں کہ کسی کونے کھدرے میں ہمارا بھی نام موجود ہے یا نہیں۔ یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہے۔ کبھی تو ہمارا نام بھی موٹے قلم سے لکھوا دیا کریں۔ سرورق پر ہمیشہ ہی غم میں ڈوبی ہوئی ایک اداس قسم کی لڑکی نظر آتی ہے۔ یہ اداسی اور پریشانی اب ختم کریں اور کبھی کبھار کسی فیشن ایبل دوشیزہ کو ایکشن میں بھی دکھا دیا کریں۔" بھئی چاہتے تو ہم بھی یہی ہیں لیکن معلوم نہیں کیا بات ہے کہ لڑکی... (ہمارا مطلب ہے لڑکی کا تخیّل) جب ہمارے ذہن سے نکل کر ذاکر صاحب تک پہنچتی ہے تو اداس ہو جاتی ہے، غم میں ڈوب جاتی ہے۔ اب ہم سوچتے ہیں کہ چلو... سرورق کا مزاج ہی کچھ ایسا بن گیا ہے تو بنا رہنے دو۔ ویسے بھی اداس اور غم میں ڈوبی ہوئی لڑکی کان ذرا کم ہی کھاتی ہے۔

محمد عاطف عرف فرہاد علی تیمور ثانی، لاہور سے لکھتے ہیں "سسپنس جس دن آتا ہے، میں اسی دن اسے پورا پڑھ ڈالتا ہوں۔ میں خدا کے فضل سے ایک مصنّف بھی ہوں۔ بے شک میری عمر صرف اٹھارہ سال ہے لیکن میں چھ ناول اور متعدد افسانے لکھ چکا ہوں جو سب کے سب میرے پاس پڑے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میری سلسلہ وار کہانی سسپنس میں چھپے۔ کافی عرصے سے میں ایک کہانی لکھ رہا ہوں جس کا ابھی کوئی عنوان تجویز نہیں کیا۔ اگر آپ اجازت دیں تو مسوّدے کا پہلا حصّہ بھیج دوں۔ دیوتا بہت اچھی کہانی ہے۔ خدا کرے نواب صاحب اسے یونہی لکھتے رہیں۔" برادرم تیمور ثانی! آپ خود سوچیں، پہلے تیمور اوّل کی کہانی ختم ہو تبھی تیمور ثانی کی کہانی کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے نا۔ ویسے بھی ہو سکتا ہے فرہاد اوّل آپ کا نام پڑھ کر خفا ہو جائیں کیونکہ انھوں نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ میرا کوئی ثانی نہیں ہے۔

جاوید اقبال ظفر، شاہ نکودر سرگودھا سے لکھتے ہیں "فروری کا شمارہ پڑھا۔ پسند آیا۔ جناب! کیا آپ کے مصوّر کے پاس کوئی نئی تصویر نہیں جو ہر بار ایک ہی قسم کی تصویر تھوڑے سے ردّوبدل کے ساتھ سرورق پر چھاپ دی جاتی ہے۔ براہِ مہربانی اچھے اچھے ٹائیٹل چھاپا کیجیے۔" ہم نے اپنے مصوّرِ غم تک آپ کا شکوہ پہنچایا تو وہ آہ بھر کر بولے "کیا کروں... مجھے بھی سب لڑکیاں تقریباً ایک جیسی نظر آتی ہیں۔ معمولی سا ہی ردّوبدل ہوتا ہے، کسی کا رنگ ذرا سانولا ہوتا ہے، کسی کا گورا۔ کسی کی ناک ستواں ہوتی ہے، کسی کی ذرا بیٹھی ہوئی، کسی کے ہونٹ پتلے ہوتے ہیں، کسی کے ذرا موٹے، میں نے کہیں دو ایسی لڑکیاں نہیں دیکھیں جن میں سے کسی کی دو ناکیں ہوں اور کسی کی تین۔ کسی کی چار آنکھیں ہوں اور کسی کی ایک،" اب آپ ہی بتائیں ان سے کیا کہا جاتا؟ فون پر ٹرنک کال زیادہ لمبی بھی تو نہیں کی جا سکتی نا۔

طارق محمود پرنس، کراچی سے رقمطراز ہیں "کئی بار خیال آیا کہ آپ کو خط لکھوں مگر پھر سوچا کہ مایوس ہونے سے تو نہ لکھنا ہی بہتر ہے۔ آپ کے پاس اتنی جگہ نہیں ہوتی کہ نئے قارئین کے خطوط کا جواب دے سکیں اور ہمارے پاس بھی اتنا فالتو کاغذ نہیں ہے کہ آپ کی ردّی کی ٹوکری کا پیٹ بھر سکیں۔ مگر اب اتنے عرصے بعد سوچا ہے کہ چلو ایک ورق ضائع کر ہی دیں۔ شاید آپ کو ترس آ ہی جائے۔" آپ بہت اچھا کر رہے ہیں کہ ابھی سے کاغذ کی قدر کرنا سیکھ رہے ہیں۔ وہ تو شکر کریں کہ خط و کتابت میں عموماً نیوز پرنٹ استعمال نہیں ہوتا ورنہ شاید ابھی سے آپ ہر خط کے ساتھ اہم نوٹ کے طور پر یہ لکھنا شروع کر چکے ہوتے۔ "جوابی لفافہ ہمراہ ارسالِ خدمت ہے۔ براہِ کرم خط پڑھ کر واپس ارسال فرما دیں تاکہ اسے ڈرائی کلینرز سے کلین کروا کے دوبارہ خط لکھنے میں استعمال کیا جا سکے۔"

راحیلہ انور، گجرات سے لکھتی ہیں "اتنا ستم نہ کیا کریں۔ اتنی محنت سے سرورق کے لیے اشعار ارسال کرتی ہوں مگر آپ نظرانداز کر دیتے ہیں۔ یہ خط سسرال سے لکھ رہی ہوں۔ ۲۹ جنوری کو شادی ہوئی ہے۔ میرے سسرال والے بھی سسپنس ہی پڑھتے ہیں۔ اس بار اپنی مصروفیات سے وقت نکال کر زندگی سے چند لمحے چُرا کر جو اشعار ارسال کر رہی ہوں انھیں نظرانداز مت کیجیے گا۔" بی بی راحیلہ! یہ تو واقعی خوشی کی بات ہے کہ آپ کو سسرال میں بھی سسپنس میسّر رہے گا ورنہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شادی کے بعد سسپنس زندگی سے رخصت ہو جاتا ہے۔

سجاول خان، عبدالواحد قاسمی تنولی، کوٹ غلام محمد سے رقمطراز ہیں "عرصۂ دراز سے سسپنس اور جاسوسی کا خاموش

قاری ہوں۔ آپ کی محفل کے آداب سے ناواقف ہوں۔ کیونکہ یہ ناچیز پردیسی ایک ٹرک ڈرائیور ہے اور ہمارا معاشرہ ویسے بھی ٹرک ڈرائیوروں اور کنڈکٹروں وغیرہ سے الرجک ہے۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں میری اس پہلی ہی کوشش کو ’ردّی کی کوٹھری‘ نہ دکھا دیں۔ آپ کے دونوں پرچے بے پناہ معیاری ہیں اور ان کے معیار کو پہنچنا بہت مشکل ہے۔ البتہ کتابت کی غلطیاں ضرور ہوتی ہیں لیکن انسان بہر حال غلطیوں اور نسیان کا معجونِ مرکبّ ہے اس لیے ان کا علاج بھی مشکل ہے۔ آپ کے ہاں لکھنے والے تمام قلمکار بھی اپنی اپنی جگہ منفرد صلاحیتوں کے مالک ہیں۔۔‘‘ برادرم! ایک تو ہم یہ نہیں سمجھ سکے کہ آپ تینوں چاروں میں سے ٹرک ڈرائیور اصل میں کون ہے؟ یا آپ سب بیک وقت ایک ہی ٹرک پر سفر کرتے ہیں؟ یا پھر درحقیقت یہ ایک ہی شخص کا نام ہے؟ بہر حال... آپ کا خط ہلکے پھلکے خطوں کو ’سائڈیں‘ مارتا ہوا سب سے آگے نکل آیا۔ خط کافی طویل بھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کوٹ غلام محمد سے روانہ ہونے کے بعد آپ نے کراچی پہنچ کر ہی بریک لگائی۔

ظفر اقبال گھمن، منڈیالہ تیگہ سے لکھتے ہیں ”معقول وقفے کے بعد ایک بار پھر آپ کی محفل میں کودنے کی کوشش کر رہے ہیں امید ہے کہ کسی جگہ فٹ ہو ہی جائیں گے۔ اس بار سلسلے وار کہانیاں اچھی تھیں۔ ش۔ صغیر ادیب کی ’آگہی‘ پڑھ کر اندازہ ہوا کہ انسان واقعی برائی کی دلدل میں کتنا ہی گہرا کیوں نہ اتر چکا ہو اسے باہر نکلنے میں دیر نہیں لگتی۔“ جی ہاں۔ درست لکھا آپ نے۔ البتہ کبھی کبھی ایک کم گہری دلدل سے نکلنے کے بعد، وہ اس سے زیادہ گہری دلدل کی تلاش میں چل دیتا ہے۔

محمد اقبال طاہر وڑائچ، پنپاکہ گوجرانوالہ سے لکھتے ہیں ”یوں تو سسپنس کی ہر کہانی سبق آموز اور معاشرے کی عکاس ہوتی ہے لیکن کچھ عرصے سے ’قیامت‘ نام کی جو کہانی سسپنس کے صفحات پر تہلکہ مچاتی تھی۔ وہ اب نظر نہیں آتی۔ مگر اب یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ سے کس کس قیامت کا ذکر کریں۔ اس قیامت کا جو فلسطین کے مظلوم مسلمانوں پر گزر رہی ہے یا اس قیامت کا جس نے لاکھوں افغانیوں کو بے گھر کر رکھا ہے یا اس بے اتفاقی کو قیامت کا نام دوں جو عراق و ایران کے مسلمانوں کو آپس میں لڑوا رہی ہے یا پھر اس قیامت صغریٰ کا تذکرہ کروں جو کراچی میں برپا ہوئی۔ کراچی میں جو کچھ ہوا ان سب واقعات کا ذمّے دار کون ہے؟ شاید یہ ایسا سوال ہے جو ہر کسی کی زبان پر آتا ہے لیکن اس کا جواب میں آپ پر چھوڑتا ہوں۔“ برادرِ عزیز! اتنے مشکل سوالوں کا جواب ہم پر کیوں چھوڑتے ہیں؟ ہم نے تو خود یہ سوال جن پر چھوڑ رکھے تھے، ان کی طرف سے ہنوز کوئی جواب نہیں آیا بلکہ شاید سوالات ان کی نظر و سماعت تک پہنچے ہی نہیں۔ سکوت سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے۔ شاید کبھی ان بے چاروں کو پلاٹوں کی بندر بانٹ، سیٹوں کی کھینچا تانی، کرسیوں کی جنگ اور سمیٹنے بٹورنے کی آپا دھاپی جیسے عظیم کاموں سے فرصت ملے تو وہ ہماری طرف نظرِ کرم فرمائیں اور ایک آدھ سوال کا کوئی ریڈی میڈ جواب عنایت فرمائیں تو ہم وہ جواب آپ کی طرف بڑھا دیں گے۔

زرینہ علی، نعیمہ علی، کراچی سے رقمطراز ہیں ”ہم سسپنس کے بہت پرانے پڑھنے والے ہیں۔ بارہ تیرہ سال تو ہو ہی گئے ہوں گے۔ اس وقت فرہاد صاحب بھی تشریف نہیں لائے تھے۔ سمندر اور ریتو کے عنوان سے سلسلے وار کہانیاں چل رہی تھیں بہر حال اس وقت کے اور اب کے سسپنس میں زمین آسمان کا فرق ہے اور اب سسپنس ہمیں زیادہ پسند ہے۔ میرے بڑے بھائی خاص طور پر صرف سسپنس کی آخری کہانی کے لیے سسپنس خریدتے ہیں۔ ہمیں موت کے سوداگر اور دیوتا اچھی لگتی ہے۔ ہم زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہیں۔ اس لیے کوئی غلطی ہو تو معاف کر دیجیے گا۔ کہانیوں پر تبصرہ تو ہم بہت کر سکتے ہیں لیکن ڈرتے ہیں کہ آپ ناراض نہ ہو جائیں۔“ لو بھئی! ہم کیوں ناراض ہونے لگے؟ کہانیاں کوئی ہم تھوڑا ہی لکھتے ہیں۔ ویسے آپ کا اندیشہ درست ہی ہے، ’آپس کی بات ہے‘ زیادہ سخت تبصرہ کیجیے گا بھی مت۔ جو لکھتے ہیں وہ واقعی ناراض بھی ہو سکتے ہیں۔

حبیب الرحمٰن غمزدہ، کشروٹ گلگت سے لکھتے ہیں ”پہلے تو میں ڈائجسٹ کی شکل بھی دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا لیکن پھر ایک دوست کے اصرار پر دیوتا پڑھی تو دل و دماغ میں ہلچل سی مچ گئی۔ آرزو پیدا ہوئی کہ اس کو پوری پڑھوں لیکن آخر میں لکھا تھا ’باقی آئندہ‘ چنانچہ اگلے مہینے پھر نیا سسپنس لینے کے لیے پندرہ روپے اللہ کے نام پر کتب فروش کو دیے۔ اب تو ہر ماہ باقاعدگی سے اس کا مطالعہ کرتا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس رسالے نے میرے دل و دماغ میں اپنے لیے اچھی جگہ تلاش کر ہی لی ہے۔“ بڑے مشکوک سے انداز میں آپ یہ بات لکھ رہے ہیں۔ لگتا ہے آپ کو خود بھی یقین نہیں تھا کہ آپ کے دل و دماغ میں کسی کو ’اچھی جگہ‘ میسّر آسکے گی۔ اور ہاں... بھائی غمزدہ! یہ آپ نے کیا لکھ دیا کہ پندرہ روپے اللہ کے نام پر کتب فروش کو دیے؟ کتب فروش نے پڑھ لیا تو وہ آپ کو مزید غمزدہ بنا دے گا۔

فتح محمد فانی، کرگ آلائی سے رقمطراز ہیں ”معمول کے مطابق اس بار بھی سسپنس سنبھالا اور جونہی پڑھنے کے لیے ورق الٹا، ایک گرجدار آواز سنائی دی ’تم نے پھر میرا ڈائجسٹ چرا لیا؟ میں کل سے تلاش کر رہا ہوں‘ اس کے ساتھ ہی ایک بھرپور گھونسا جبڑے پر پڑا۔ گھونسا کیا تھا ’آگہی‘ کا عذاب تھا۔ شکل مسخروں جیسی ہوگئی۔ مدد کے لیے دیوتا کو پکارا کیونکہ موت کا سوداگر سرہانے کھڑا تھا۔ اب شاید آپ کو اندازہ ہو گیا ہو کہ سسپنس چرانے کے نتیجے میں مجھے کیا کیا مصائب اٹھانے پڑتے ہیں اور بڑے بھائی کے ہاتھوں کس طرح خوار ہونا پڑتا ہے۔ آپ کو مجھ جیسے قارئین کی قدر کرنی چاہیے۔“ اس قدر مصائب آپ صرف بارہ روپے کی خاطر برداشت کرتے ہیں؟ بھیّا فانی صاحب! فانی صرف آپ ہی نہیں، یہ دنیا بھی فانی ہے اور دولت آنی جانی ہے۔ کیا کریں گے اتنی بچت کر کے؟ اپنا الگ سسپنس خرید لیا کریں۔

اور اب جگہ کی کمی کے باعث کچھ خطوط بلا تبصرہ۔

اعجاز احمد معروفی، للہ ٹاؤن سے شکوہ طراز ہیں ”سسپنس کے قیمتی صفحات کو اشتہارات کی جو بیماری لاحق ہے، آئے دن اس میں اضافہ ہو رہا ہے۔ خدارا اشتہارات میں کچھ کمی کیجیے۔ اس ماہ تمام کہانیاں معیاری تھیں۔ خصوصاً ’آگہی‘ نقاب کشائی اور نیلامی بہت پسند آئیں۔ تحریروں کے بے تاج بادشاہ الیاس سیتاپوری کو بہترین تاریخی کہانی لکھنے پر مبارکباد۔“ (برادرم! اشتہارات کی تعداد کم ہی رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے تبھی تو یہ حال ہے۔ یقین کریں کئی اشتہارات تو میزوں کی درازوں میں رکھے رہ جاتے ہیں)

حسیب الرحمٰن زخمی، فارم لنڈ جام سے لکھتے ہیں ”آپ اگر کہیں ہمیں مل جائیں تو آپ کے ساتھ وہ سلوک کریں کہ ٹی وی پر خبر نامے میں آپ کا ذکر بلکہ شاید چھوٹا موٹا انٹرویو بھی نشر ہو اور آپ ہچکیاں لے لے کر ہمارے ’ظلم کی داستان‘ سنائیں۔ جتنی محبت آپ کو اس کمبخت ردّی کی ٹوکری سے ہے اتنی اگر ہم سے ہوتی تو آج ہمارا دل یوں خون کے آنسو نہ رو رہا ہوتا۔“

سیّد واجد علی کاظمی، ماڑی شاہ شریف چکوال سے لکھتے ہیں ”بھیّا! سسپنس کافی عرصے سے پڑھ رہا ہوں مگر آپ کی محفل میں پہلی بار اور ڈرتے ڈرتے قدم رکھ رہا ہوں۔ ’موت کے سوداگر‘ اور ’دیوتا‘ اچھی جا رہی ہیں۔ آپ کے پاس جگہ کی کمی کے باعث زیادہ تفصیل تبصرہ نہیں کر رہا۔ اُمید ہے آپ میرا دل پاش پاش کرنے کے بجائے باغ باغ کر دیں گے۔“

طاہر خورشید، منگھو پیر روڈ کراچی سے لکھتے ہیں ”میں بھی سسپنس کے بہت سے پرستاروں کی طرح پرانا فضول خرچ ہوں اور ہر ماہ بڑی باقاعدگی سے بقول والدہ صاحبہ کے، پورے بارہ روپے اندھے کنوئیں میں پھینک دیتا ہوں۔ مدّت پہلے دیوتا کے بارے میں خط لکھ کر ایک غلطی کی نشاندہی کی تھی جسے آپ نے اپنے منصب کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے گول کر دیا۔ اس کے علاوہ آپ کو یاد دلانا تھا کہ آپ نے ایک مرتبہ وعدہ کیا تھا کہ کبھی باری باری تمام مصنّفین کے انٹرویو شائع کریں گے۔ کیا اُمید رکھیں کہ قیامت سے پہلے آپ اپنا وعدہ پورا کر دیں گے؟ چونکہ اس خط کے شائع ہونے کا کوئی امکان نہیں اس لیے لگے ہاتھوں کچھ اور برائیاں کرتا چلوں... لیکن افسوس، اس وقت کوئی یاد نہیں آ رہی۔“

صفی اللہ خان سیفی، مظفر گڑھ سے لکھتے ہیں ”پچھلے کئی ماہ سے خط تو درکنار آپ نے ہمارا کوئی شعر بھی شائع نہیں کیا بلکہ معذرت کے خانے میں نام تک نہیں دیتے۔ جانے کیوں آپ اپنے قارئین سے اتنے بیزار ہو گئے ہیں؟ شاید آپ بھی کرکٹ اور ہاکی والوں کی طرح پرانوں کو فراموش کرتے جا رہے ہیں۔ ہم تو کسی سے سفارش بھی نہیں کروا سکتے البتّہ اپنی کارکردگی کو بہتر بنانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ بقول شاعر ؎

شاید کہ تر ے دل میں اتر جائے مرا شعر۔“ (بعض اشعار تو ایسے پڑھنے کو ملتے ہیں کہ دل کے بجائے آدمی کے جوڑوں میں اتر جاتے ہیں)

رضا خان صادق، قمبر سوات سے رقمطراز ہیں ”فروری کی تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ ’دیوتا‘ اور ’موت کے سوداگر‘ بے مثال تھی۔ ش صغیر ادیب کی کہانی بھی شاندار تھی۔ اگر کچھ گزارشات پر غور کریں تو نوازش ہوگی۔ ایک تو ذاکر صاحب سے عرض ہے کہ کبھی سرورق پر پوری لڑکی بھی بنا دیا کریں۔ سسپنس میں کوئی انعامی سلسلہ بھی شروع کریں۔ نواب صاحب کی کہانی اگر ہر ماہ نہیں تو کم از کم ہر تیسرے مہینے ضرور شائع کریں۔ درمیان میں باری باری دوسرے مصنّفین کی کہانیاں ہونی چاہئیں جو بہت اچھا لکھتے ہیں مثلاً صبا احمد، ناہید سلطانہ اختر، احمد اقبال، محمود احمد مودی وغیرہ۔ نک ویلوٹ کو کچھ عرصہ آرام کرنے دیں۔ ’آپ کے خط‘ کے صفحات کچھ بڑھا دیں۔ تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔“

سید قیصر میر قادری، لیاقت آباد کراچی سے لکھتے ہیں ”کئی ماہ بعد اکٹھے کئی شمارے پڑھنے کو ملے ہیں کیونکہ میں کچھ عرصے کے لیے علاج کی غرض سے جرمنی گیا ہوا تھا اور وہاں سسپنس ڈھونڈنے کے باوجود نہیں مل سکا۔ واپس آکر سسپنس ملا تو دل کو قرار آیا۔ ’دیوتا‘ کے دس سال مکمل ہونے کی مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ نومبر سے لے کر فروری تک کے شماروں کے سرورق ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ لوگوں کو خطوط کے جواب ملتے دیکھ کر قلم خود بخود چلنے لگتا ہے لیکن پھر خط لمبا ہوتا چلا جاتا ہے اور جواب ندارد ہو جاتا ہے۔“

ظہور احمد شاہین، کوٹ غلام محمد سے رقمطراز ہیں ”کچھ لوگ وقت گزاری کے لیے رسالہ پڑھتے ہیں، کچھ جنرل نالج بڑھانے کے لیے۔ کچھ کو پڑھنے کا چسکا لگ جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کو عموماً پڑھاکو کہا جاتا ہے۔ گھر والے سمجھتے ہیں کہ ہمارے بچّے بہت ہوشیار ہیں، سارا دن پڑھتے ہیں۔ ان کو یہ خبر نہیں ہوتی کہ ان کے لاڈلے سارا دن رسالے پڑھتے ہیں۔ ہمارا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے اس کے باوجود خدا کا شکر ہے کہ پڑھائی میں بھی اوّل رہے ہیں۔ ہم صرف سسپنس ہی نہیں، جاسوسی کی بھی تمام کہانیوں کے اسیر ہیں۔“

محمد انور خان نیازی نے کیڈٹ کالج پٹارو سے نوجوانوں کو اپنے خط میں کچھ اسی قسم کی جھاڑ پلائی ہے جیسی آج کل ڈراموں، تقریروں اور خبروں وغیرہ میں عموماً پلائی جاتی ہے۔ ”تاریخی کہانی کا بڑی بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔ ’میرا خیال‘ دو صفحات پر مشتمل ہوتا ہے اور اسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ آج کل تمام نوجوانوں پر عشق کا بھوت سوار ہے۔ کسی کو اسلامی تاریخ، اسلامی جرنیلوں، اتحاد اور یقینِ محکم سے پیار نہیں، یہ کالم صرف زلفِ یار کا اسیر ہو کر رہ گیا ہے۔ خدارا کوئی ایسا عنوان دیں جس میں علامہ اقبال جیسے شعراء کے اشعار استعمال ہو سکیں۔“ (وہ تو موجودہ ٹائیٹلوں پر بھی ہو سکتے ہیں۔)

راؤ ساجد علی قیصر، راجن پور سے لکھتے ہیں ”دو دن میں سسپنس ختم اور اس کے بعد لمبا انتظار۔ آپ سسپنس کے صفحات بڑھا دیں یا پھر اسے پندرہ روزہ کر دیں ورنہ ہم تو انتظار کرتے کرتے سنگِ میل بن جائیں گے۔ بہر حال... اچھی چیز پانے کے لیے انتظار تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ مثلاً ابھی آخری صفحات پر ہی ہمیں ادیب صاحب کی کیسی اچھی کہانی پڑھنے کو ملی ہے۔ کراچی کے حالات ہم سب کو شرمندہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔ خدا ہم سب پاکستانیوں کے حال پر رحم کرے۔“

تصدق حسین، علی پور چٹھہ سے رقم طراز ہیں: "پرچہ دیر سے ملا لیکن چونکہ وجہ معلوم ہے اس لیے شکوہ نہیں کیا جاسکتا۔ آپ ہی کی طرح اس وقت میرا بھی جی نہیں چاہ رہا کہ خط میں کوئی شوخ و شگفتہ بات لکھنے کی کوشش کروں۔ شمارہ مجموعی طور پر اچھا تھا۔ ننک ویلوٹ کو آپ نے پھر جگہ دے دی۔ 'طوطے کی چوری' تو چھپ ہی چکی تھی۔ اس میں صرف 'مخ' کا اضافہ کرکے یہ 'مخطوطے کی چوری' ہوگئی۔ 'آگہی' اس ماہ کی سب سے اچھی کہانی تھی۔"

محمد سلیم شہزاد، میانوالی سے لکھتے ہیں: "ادیب صاحب کے توشۂ خاص 'آگہی' نے مجھے خط لکھنے پر مجبور کیا ہے۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے۔ "... فاضل وکیلوں کے دلائل سُننے اور مسماۃ جنّت اور گواہوں کے بیانات سُنے..." مجھے ادیب صاحب سے اس غلطی کی توقع نہ تھی کیوں کہ مسماۃ جنّت پہلے مُرجاتی ہے اور دستی کی زندگی میں انقلاب بہت برسوں بعد آتا ہے۔ مسماۃ جنّت کیا قبر سے نکل کر گواہی دینے آتی ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ آپ اس خط کو شائع نہیں کریں گے۔ کیوں کہ اس میں غلطی کی نشان دہی کی گئی ہے۔"

چوہدری طاہر محمود، تریل سے رقمطراز ہیں: "معلوم نہیں اس بار بھی آپ خط کا کیا حشر کریں۔ لیکن ہم بھی ہمت ہارنے والے نہیں ہیں۔ کراچی کے لیے ہماری بھی یہی دُعائیں ہیں کہ وہاں کا ماحول خوش گوار ہو تاکہ ہمیں بھی اچھی اچھی کہانیوں اور آپ کی باتوں کی صورت میں خوشیاں میسّر آتی رہیں۔ گزشتہ اور اس سے پچھلے ماہ آپ نے خطوں کے جواب نہیں دیے لیکن جو کچھ آغاز میں لکھا وہ تمام تبصروں سے بڑھ کر تھا۔ اس مرتبہ 'دیوتا' اور 'موت کے سوداگر' اچھی تھیں۔ ادیب صاحب کی 'آگہی' بھی بہت پسند آئی۔"

محمد انیس نے بہاولپور سے اپنے طویل خط میں لکھا ہے: "کراچی میں جو کچھ ہوا وہ جتنا دردناک اور المناک ہے کہ اس کے لیے الفاظ بے وقعت ہیں، مسلمانوں کے لیے یہ مقامِ عبرت ہے۔ جس قوم کا شیرازہ بکھر جائے اور جو گروہوں اور قومیتوں میں بٹ جائے' وہ محمد عربیؐ کی اُمّت کہلانے کی مستحق کس طرح ہوسکتی ہے؟ کیا ہمیں تب ہوش آئے گا جب پانی سر سے گزر جائے گا؟"

جاوید اختر شہباز، نگوالہ سے لکھتے ہیں: "فروری کا شمارہ پڑھا۔ دیوتا اور موت کے سوداگر کا زور ہے، باقی سب بور ہے۔ قیامت اور احمد اقبال کی کہانی بھی نہیں تھی۔ نکّے کو بھی کبھی کبھار کارگزاری دکھانے دیا کریں۔ اس کے علاوہ ہم پانچ دوستوں کی پُرزور اپیل ہے کہ موت کے سوداگر کے صفحات بڑھادیں۔"

نائیلہ قمر بٹ، سوہدرہ سے لکھتی ہیں: "اس بار وہ سسپنس اُڑا کر پڑھا جو بھائی جان نے اپنے لیے خریدا تھا۔ یہ شمارہ سسپنس کے بجائے جاسوسی ڈائجسٹ لگ رہا تھا۔ 'آگہی' بے حد پسند آئی لیکن انجام کچھ فلمی سا لگ رہا تھا۔ نجمہ مودی کی ترجمہ کہانی 'نیلامی' بہت پسند آئی۔ ہما اقبال کی نقاب کشائی اور سنجیدہ کاظمی کی ترجمہ کہانی کوئی خاص نہیں تھی۔ ریوالور کی نال کنپٹی پر رکھ کر اس اعتماد سے گولی چلانا کہ صرف غدّار ہی مرے گا، اس قسم کی چیزیں بہت سی کہانیوں میں پڑھ چکے ہیں۔ بے خبر، تضاد، مسخرہ، ناوقت اور جدّت پسند بھی اچھی کہانیاں تھیں۔ موت کے سوداگر یعنی مدہوشوں کی کہانی، ہوش مندوں کی عبرت کے لیے خوب ہے۔ دیوتا پڑھ کر خیال آتا ہے کہ کاش کچھ بہت ہی اعلیٰ اور مقتدر ہستیوں کو بھی ٹیلی پیتھی آتی ہوتی تاکہ وہ کہیں منتظمین مقرر کرتے وقت ذرا اُن کے دماغ ٹٹول لینے کی زحمت کرلیا کرتے کہ آخر وہ کس قسم کے انسان ہیں اور کیا عزائم رکھتے ہیں۔" (وہ تو انھیں اب بھی معلوم ہوتا ہے لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے!)

رئیس اعظم خاں شیرازی، کراچی سے رقم طراز ہیں: "مَیں بھی دیکھتا ہوں کہ آخر آپ کب تک میرا خط کمبخت ردّی کی ٹوکری کو کھلاتے رہیں گے۔ کبھی نہ کبھی تو آپ کو میرا خیال آئے گا اور اگر نہ بھی آئے تو کوئی ہرج نہیں کیوں کہ مَیں تنقید کرنے سے باز نہیں آؤں گا۔ اور نہ ہی آپ کو مُسکا لگاؤں گا۔ مَیں تو اپنے دل کی تسکین کے لیے خط لکھتا ہوں۔ فروری کا ٹائیٹل بالکل پسند نہیں آیا۔ 'آگہی' اس ماہ کی بہترین کہانی رہی۔ ویسے معاہدہ، دلِ نازک، تضاد، جدّت پسند اور بے خبر بھی اچھی تھیں۔ نکّ کو آپ چھٹی پر بھیج دیں اور اس کی جگہ پرنس دلاور کو لے آئیں۔ نواب صاحب سے کہیں کہ 'آدھا چہرہ' جیسی کوئی کہانی لکھیں۔ پروف ریڈنگ کی غلطیاں کافی ہوتی ہیں۔"

پروین ممتاز، چنی گوٹھ سے شکوہ طراز ہیں: "کافی عرصے مجھے سسپنس کی خاموش قاری بن کر رہنا پڑا ہے جس کی وجہ آپ کا حوصلہ شکن رویّہ ہے۔ کراچی کے واقعات سُن کر ہر پاکستانی مضمحل اور افسردہ ہے اور اسی کی بنا پر ہمیں سسپنس کے لیٹ ہونے کا کوئی گلہ نہیں۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حالات بہتر فرمائے، آمین۔ دیوتا کی قسط بھرپور تھی۔ سچّی کہانیوں کا سلسلہ بھی سبق آموز اور بہت اچھا ہے' اس سلسلے کی سب سے اچھی کہانی 'نافرمان' تھی۔ مختصر کہانیوں میں 'نیلامی' اور 'معاہدہ' پسند آئیں۔"

ملک محمد اسلم خان شاہد، مرکھال سے رقمطراز ہیں: "کراچی کے واقعات کا بنیادی سبب لالچ ہے۔ دولت کی ہوس نے لوگوں کے دل ایسے سیاہ کردیے ہیں کہ اس کی خاطر وہ دنیا کا ہر کام کر گزرنے پر تُل گئے ہیں۔ اگر صرف دولت کی ہوس ختم ہوجائے تو نوّے فیصد جرائم، بدامنی اور فساد ختم ہوجائیں — لیکن جہاں ہم پہنچ چکے ہیں وہاں سے واپسی کسی معجزے کے تحت ہی ممکن ہے۔ سسپنس مجموعی طور پر ایک بہترین رسالہ ہے۔ 'دیوتا' تاریخی کہانی اور موت کے سوداگر، سسپنس کا دل، دماغ اور آنکھیں ہیں۔ انگریزی کہانیوں کے بجائے زیادہ تر اپنے معاشرے کی کہانیاں دیا کریں تو اچھا ہوگا۔"

غلام حسین بابر، قلعہ شیخوپورہ سے رقمطراز ہیں: "دیوتا، موت کے سوداگر، تصوّف اور تاریخی کہانی میرے پسندیدہ سلسلے ہیں۔ دیوتا کی جنوری کی قسط پسند نہیں آئی تھی لیکن فروری کی قسط بہت اچھی تھی۔ نواب صاحب سے درخواست ہے کہ وہ یہی معیار برقرار رکھیں۔ نیز اب اسے کسی انجام تک پہنچائیں کیوں کہ اس کا 'ختم شد' پڑھنے کے انتظار میں بہت سے لوگ 'ختم شد' ہوگئے ہیں۔ نکّے کی کہانی اور اثر نعمانی صاحب کی کہانیاں بھی ضرور شائع کریں۔ جب ہم سسپنس ختم کرلیتے ہیں تو بے اختیار یہ شعر زبان پر آجاتا ہے
؎ کیسی بہار، کیسا چمن اور کہاں کے پھول — سسپنس کیا گیا کہ نظارے چلے گئے"

صابر علی شاد، چک نمبر ڈبلیو، بی / ۶۵ سے لکھتے ہیں۔ "پچھلے دو ماہ سے خطوط انکل کے تبصروں کے بغیر شائع ہورہے ہیں! اس لیے مزہ نہیں آرہا۔ لُطف تو ہر چیز کا ہی کراچی کے واقعات نے غارت کردیا ہے۔ معلوم نہیں کس ظالم کمینے کی نظر لگ گئی ہے کراچی کو — بہرحال کہانیاں سب اچھی جارہی ہیں۔ دیوتا اور موت کے سوداگر آج کل میاں داد کی طرح فارم میں ہیں — خدا کرے یہ ہمیشہ مارشل کی گیندوں کی طرح تیزی سے چلتی رہیں۔"

آصف محمود، جلال پور جٹاں سے لکھتے ہیں: "جب سے سونیا دوبارہ فرہاد سے ملی ہے، دیوتا بالکل بور ہوگئی ہے کیوں کہ آدھے صفحات پر سونیا کی تعریفیں ہوتی ہیں اور آدھے صفحات پر پومی وغیرہ کی جب کہ ہمارے فرہاد صاحب صرف باتیں اور تعریفیں کرتے رہتے ہیں۔ سونیا سے ملنے سے پہلے کی قسطوں میں دیوتا ایکشن میں تھا۔ اب وہ سُستی میں پڑ چکا ہے۔ اس کو دوبارہ راہِ راست پر لائیں۔ شیطان کو تو آپ نے اس طرح غائب کردیا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ تاریخی کہانی زوروں پر جارہی ہے۔"

شیخ عبدالحمید مجاہد اور شیخ محمد شفیق ضیاء، سکھیکی منڈی سے رقمطراز ہیں: "سلامِ عقیدت! جی ہاں عقیدت کا سلام اس لیے کہ ہمیں آپ کی تحریر سے یہ اندازہ کرکے دلی خوشی ہوئی ہے کہ آپ کے سینے میں ایک دردمند دل دھڑکتا ہے جو ہم وطنوں کے دکھوں اور مصائب پر اشکبار اور دکھی ہونا جانتا ہے۔ ورنہ ہمارے ملک میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو صرف اپنے عیش و آرام میں غرق ہیں۔ انھیں کسی کی تکلیف سے کوئی غرض نہیں — اور اُن ضمیر فروشوں کی بھی کمی نہیں جو محض پیسے کی خاطر کہیں بم رکھ کر یا فتنہ و فساد پھیلا کر ذرا بھی عار محسوس نہیں کرتے اور ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچتے کہ ان کے ذرا سے لالچ کی وجہ سے کتنے افراد لقمۂ اجل بنیں گے، کتنے بچے یتیم ہوں گے، کتنی عورتوں کے سُہاگ اُجڑیں گے — ہم آپ کے جذبات سے متاثر ہیں۔ بہرحال اب سنبھلیں اور رسالے کی طرف توجہ دیں۔ براہِ کرم تاریخی کہانی ختم کرکے اس کی جگہ انگلش ناول کی تلخیص شروع کریں۔ دیوتا کو گمراہ کی طرح انجام تک پہنچائیں' موت کے سوداگر، البتہ جاری رہنے دیں۔ 'آگہی' اچھی کہانی تھی مگر مَیں سمجھ نہیں سکا کہ اس میں ماحول کس ملک کا تھا؟"

رفیق احمد، راولپنڈی سے لکھتے ہیں: "میرے دو تین خط ردّی کی ٹوکری کی 'زینت' بن چکے ہیں۔ اب تو کرم فرمائیں ورنہ مجھے کوئی اور طریقہ سوچنا پڑے گا۔ کافی عرصے سے سسپنس، سسپنس سے بالکل خالی ہے اور یکسانیت کا شکار ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ دیوتا اور موت کے سوداگر کو یا تو ختم کیا جائے یا انھیں بہتر بنایا جائے۔ کافی عرصے سے آپ نے پرنس دلاور یا نکّے کی کوئی کہانی شائع نہیں کی ہے۔ احمد اقبال کی مزاحیہ تحریر بھی پڑھنے کو نہیں ملی ہے۔ پرنس دلاور اور رنگا جہاں بھی ہوں آپ انھیں پکڑ کر قارئین کے سامنے پیش کریں، یہ آپ کی اخلاقی ذمّے داری ہے۔"

بخت حاضر اور بخت اکبر، سوات چالیار سے لکھتے ہیں: "کبھی ہمارا شعر یا خط شائع نہیں کیا گیا۔ کب تک ہمارے خط ردّی کی ٹوکری میں جایا کریں گے؟ ہر ماہ ہم سوالات کی وادیوں میں بیٹھ کر سوالات پوچھتے ہیں اور خط میں لکھتے ہیں مگر آپ کو بالکل احساس نہیں ہے۔ اگر آپ کے دل میں کوئی خار ہے تو واضح طور پر ہمیں مطلع کریں تاکہ ہم اپنی تحریروں کو ضائع کرنے سے باز آئیں اور اپنے کام سے کام رکھیں تاکہ آپ کو بھی تکلیف نہ پہنچے۔"

رانا ظہیر احمد خاں، سرگودھا سے لکھتے ہیں: "سسپنس آتا ہے تو مَیں غمِ روزگار بلکہ ہر چیز کو بھول کر اس کے مطالعے میں محو ہوجاتا ہوں۔ سب سے پہلے خط پڑھتا ہوں۔ آپ کی تحریر پڑھ کر تمام واقعات کے بارے میں جتنا دکھ ہوا اتنا ریڈیو، ٹی وی سے خبریں سُن کر اور اخبارات میں خبریں پڑھ کر بھی نہیں ہوا تھا۔ یوں کہیں غم تازہ ہوگیا — تاہم آپ سے ایک شکوہ ہے کہ جنوری اور فروری کے شماروں میں خطوں کے صفحات پر سرگودھا کا نام تک نہیں ہے کیا سرگودھا سے آپ کو ہی کوئی ناراضگی ہے یا واقعی اتنے بڑے شہر میں سے کوئی سسپنس کو خط نہیں لکھتا۔"

خالد جاوید، گوجر خان سے رقمطراز ہیں: "فروری کے شمارے میں تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ خصوصاً 'آگہی' نے تو دل پر بے حد اثر کیا۔ خطوط میں بعض خط بڑے معلوماتی ہوتے ہیں۔ دو ماہ سے آپ نے خطوط پر تبصرہ نہیں کیا۔ واقعی ایسے حالات میں کون خوش رہ سکتا ہے اور کون شگفتہ باتیں کرسکتا ہے۔ دوسروں کے ہاتھوں میں کٹھ پُتلی بننے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔ ہماری تو سوچ بھی اپنی نہیں رہی!"

عبدالعزیز منگریو، جیکب آباد سے نہایت خفگی کے عالم میں لکھتے ہیں: "آج سے میں آپ کا دشمن بھتیجا ہوں۔ آپ نے جیکب آباد کے غلام مصطفےٰ کا خط تو شامل کیا ہے جبکہ مجھے صرف نام دے کر ٹرخادیا۔ شاید اس لیے کہ میں آپ کو وہ چکنی چپڑی باتیں نہیں لکھتا جو دوسرے لکھتے ہیں۔ یہ میرا آخری خط ہے اور میں کسی بھی کہانی کی تعریف نہیں کروں گا۔"

رائے نور احمد وجھیرہ، تھانہ گوادر سے لکھتے ہیں: "تین بار خطوط کی رسید وصول کرچکا ہوں۔ چلیں یہی کافی ہے کہ ہمارا نام تو سسپنس کی زینت بن جاتا ہے۔ سسپنس ہماری کمزوری ہے اور دیوتا کے ہم زبردست شوقین ہیں۔ اس کے علاوہ میں صرف 'موت کے سوداگر' اور تصوّف کا مضمون پڑھتا ہوں۔"

ملک محمد اعجاز پرنس، کنجاہ سے لکھتے ہیں: "یہ میرا اسلور جوبلی خط ہے کیونکہ اس کا نمبر پچیسواں ہے۔ اُمید ہے آپ مجھے سلور جوبلی کی مبارکباد دیں گے۔ پچھلے ماہ کچھ غموں سے دوچار رہا اس لیے اس مرتبہ دو شمارے اکٹھے پڑھے اور انھوں نے مجھے غم بھلانے میں بڑی مدد دی۔ جنوری کے شمارے میں 'ناراض نسل' ٹاپ پر رہی۔ مودی صاحب کو باسی مبارک باد۔ فروری کے شمارے میں ناوقت، مسخرہ، تضاد، مخطوطے کی چوری اور معاہدہ بہت پسند آئیں۔ تصوّف کا مضمون اور تاریخی کہانی تو ہمیشہ ہی لاجواب ہوتی ہے۔ موت کے سوداگر بھی قابلِ تحسین کہانی ہے۔"

رخسانہ یاسمین، کھوڑ کمپنی سے لکھتی ہیں۔ "نک ویلوٹ کی کہانی تو ہر ماہ شامل ہوتی ہے جبکہ پرنس دلاور کی کہانی ایک خواب بن چکی ہے۔ اُمید نہیں ہے کہ آپ کبھی میرا خط یا شعر شائع کریں گے کیونکہ ہم سسپنس کے قاری ہیں اور آپ مدیرِ اعلیٰ۔ گویا ایک طرح سے ہم آپ کے رحم وکرم پر ہیں۔ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔ اور ہاں۔۔۔ فرہاد صاحب آہستہ آہستہ بے بس ہوتے جا رہے ہیں۔ 'موت کے سوداگر' اچھی کہانی ہے لیکن اسے دیوتا کی طرح شیطان کی آنت نہ بنائیں۔ تاریخی کہانی شاندار ہے۔ احمد اقبال کی مزاحیہ کہانی کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ اس خط کا جواب ضرور دیں کیونکہ اس کے بعد امتحان شروع ہونے والے ہیں۔" تو کیا آپ امتحانات میں ہمارے جواب سے مدد لینا چاہتی ہیں؛ یقین کیجیے آپ کا حال اچھا نہیں ہوگا کیونکہ ممتحنوں میں حسِ مزاح کی خاصی کمی ہوتی ہے۔

محمد مشتاق نے فیصل آباد سے اس ماہ کا مختصر ترین خط لکھا ہے۔ "ڈیئر سسپنس!۔۔۔۔ خدا حافظ۔" اب معلوم نہیں خدا حافظ انھوں نے سسپنس کو کہا ہے یا ہمیں؟

تجمل حسین حیدری نے پنڈ دادنخان سے لکھا ہے۔ "کنجوس۔ کنجوس۔۔۔" ہم گن نہیں سکے کہ انھوں نے اپنے خط میں کتنی مرتبہ کنجوس لکھا ہے۔ کاش ہم تھوڑے سے مزید کنجوس ہوتے اور ان کے خط کا ذکر گول کر کے یہ دو سطریں بھی بچا لیتے۔

محمد سلیم مرزا، کھیوڑہ سے رقمطراز ہیں۔ "اس مرتبہ آپ میرا خط اور اشعار کرارے پاپڑوں کی طرح ہضم کر گئے۔ سرورق کی تعریف کرنا سورج کو زیرو کا بلب دکھانے کے مترادف ہوگا۔ لیکن ایک گھنٹے تک یہی سمجھ میں نہیں آیا کہ سرورق کی محترمہ ہنس رہی ہیں یا رو رہی ہیں؟" بھئی، جب یہاں سے چلیں تب تو ہنس رہی تھیں۔ ہوسکتا ہے کھیوڑہ پہنچنے تک اور آپ سے سامنا ہونے پر رونے لگی ہوں۔

شفقت اعوان، دندی گھیپ سے ایک خاصے تفصیلی خط میں لکھتے ہیں۔ "عرصہ دراز سے آپ کی محفل میں گھسنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن آپ کی محافظ ردّی کی ٹوکری سے سامنا ہوتے ہی ہمت ہار دیتا تھا۔ بہرحال اس بار کاغذی گینڈا ارسال کر رہا ہوں۔ شاید ٹوکری کو ٹکر مار کر ایک طرف لڑھکانے میں کامیاب ہو جائے۔ اس مرتبہ پرانے قارئین کی بھرمار دیکھ ایک تجویز پیش کر رہا ہوں۔ اُمید ہے منظور فرمائیں گے یا اس پر قارئین سے ریفرنڈم کروائیں گے۔ پاکستان اور آزاد کشمیر کے تمام اضلاع کو ملا کر آپ ہر ضلع کا ایک خط اختصار کے ساتھ شائع کریں اور اس کا جواب بھی دیں اور ان اضلاع کے باقی قارئین کے نام معذرت کے ساتھ شائع کر دیا کریں۔ اگلے ماہ معذرت کے خانے میں آنے والے خطوط میں سے ایک خط فی ضلع کے حساب سے شائع کر دیں اور جن قارئین کے خط آپ نے پہلی محفل میں شامل کیے تھے انھیں معذرت والے خانے میں رکھ دیں۔۔۔" بھائی شفقت! آپ نے بے حد شفقت فرمائی کہ ہمارے مسئلے کا اتنا 'آسان' حل تجویز فرمایا۔ تین چار مرتبہ پڑھنے کے بعد آپ کی لمبی چوڑی تجویز ہماری سمجھ میں آسکی۔ افسوس کہ اس پر عملدرآمد کے لیے ہمیں ایک تو کوئی بہت بڑی میموری والا کمپیوٹر خریدنا پڑے گا جو سارا حساب کتاب رکھ سکے کیونکہ حساب کے معاملے میں ہم بڑے کمزور ہیں۔ اوپر سے ہمارا جغرافیہ بھی کمزور ہے۔ کبھی ہم خط پکڑ کر سوچتے ہی رہ جائیں گے کہ باگڑ سرگانہ کس ضلع میں آتا ہے اور سسپنس کی اشاعت کی تاریخ گزر جائے گی۔ ویسے بھی ہم نہیں چاہتے کہ کل کو ہمارے خلاف بھی جلوس نکلنے لگیں کہ کوٹہ سسٹم ختم کرو۔

محمد صدیق، پوکل الائی سے رقمطراز ہیں۔ "میں سسپنس کی ابتدا خطوط سے کرتا ہوں۔ خطوط بہت اچھے تھے۔ سب کے دل میں کراچی کے لیے درد تھا۔۔۔ لیکن آپ اس محفل میں نہیں تھے۔ آپ کے بغیر یہ محفل سونی سونی لگتی ہے۔ آپ کے شہر کے لیے دعاگو ہیں۔ تاہم پلیز آئندہ خطوط بلا تبصرہ نہ شائع کیا کریں کیونکہ آپ کے بغیر سسپنس ادھورا ہے۔ آخری صفحات پر 'آگہی' پڑھ کر کچھ مایوسی ہوئی۔ رائٹر نے اسے بہت طول دیا تھا اور غیر ضروری باتوں کو بھی شامل کیا تھا۔ آئندہ میں ادیب صاحب سے زیادہ اچھی کہانی کی توقع رکھوں گا۔ اور ہاں۔۔۔ یہ نواب صاحب کہاں غائب ہوگئے ہیں؟" بھیا! 'آگہی' چیز ہی ایسی ہے۔ آگہی حاصل ہونے لگتی ہے تو غیر ضروری باتوں کے بارے میں بھی ہو جاتی ہے۔ اسی لیے تو 'عذابِ آگہی' والی اصطلاح مشہور ہے۔

ماہتاب علی راؤ، جہانیاں منڈی سے قدرے خفگی کے عالم میں لکھتے ہیں۔ "ہم سسپنس کے قاری کب سے ہیں، اس سے تو بھلا آپ کو کیا سروکار ہوگا۔ بہرحال جب سے اس کا مطالعہ شروع کیا ہے، تنقید، تعریف سبھی کچھ کرتے رہے ہیں۔ ایک بار اشعار کے سلسلے میں انعام بھی حاصل کیا تھا جو ہم تک نہیں پہنچا۔ ایک دو خط شائع ہوئے تو بلا تبصرہ۔ اور ہاں۔۔۔ اہلِ پنجاب آپ کو ڈراما ۸۷ دکھاتے ہیں۔ اس کا انتقام آپ نے غالباً آگہی شائع کر کے لیا ہے۔ آخری دو صفحات کی چند سطوریں حاصل شدہ 'آگہی' کو لانگ پلے بنا دیا۔ کافی عرصہ ہوگیا کسی ناول کی تلخیص عنایت کیے۔ کبھی کبھی یہ مہربانی بھی فرما دیا کریں۔ فروری کے شمارے میں سانگھڑ کے الیاس خان صاحب نے جس طرح 'دیوتا' کی طوالت کا موازنہ گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ سے کیا اور فریحہ طاہر صاحبہ نے فردوسی اور شاہنامے کی وضاحت کی، دونوں کی مختلف محنت اور دماغ سوزی قابلِ تحسین ہے۔ ان کے خطوط الگ سے اندرونی صفحات پر شائع ہونے چاہئیں تھے لیکن آج کل نہ جانے کیوں آپ اتنے ڈنڈی مار رہے ہیں۔" عزیزم! ہم تو صرف ڈنڈی مار رہے ہیں، کاغذ والے ہمیں ڈنڈے مار رہے ہیں اور ڈنڈے بھی ایسے جو دوسروں کو نظر نہیں آتے۔ اور ہاں۔۔۔ دیکھیں کم از کم اتنا مبالغے سے تو کام نہ لیں کہ 'آگہی' کو طویل دورانیے کے ڈرامے سے تشبیہ دینے لگیں۔ ڈائجسٹ کی کوئی بھی خصوصی کہانی تو طویل دورانیے کے ڈراموں کے لیے سال بھر کے کوٹے کا کام دے سکتی ہے۔

ملک محمد اشفاق اعوان، نور پور سیٹھی سے رقمطراز ہیں۔ "سسپنس کا بڑا پرانا عاشق ہوں مگر جب بھی خط لکھا آپ نے آخر میں ہمارا نام آٹے میں نمک کی طرح ڈال دیا۔ آپ کو نہیں معلوم کہ سسپنس ہمیں کتنا عزیز ہے لیکن میں زیادہ پڑھا لکھا آدمی نہیں ہوں۔ زیادہ بڑھا چڑھا کر سسپنس کی تعریف نہیں کر سکتا۔ اس مرتبہ سسپنس نے بڑا انتظار کرایا لیکن وجہ ہمیں معلوم تھی ورنہ بارش ہو یا پت جھڑ، آندھی ہو یا طوفان، سسپنس ہم تک پہنچ ہی جاتا ہے۔" برادرم! آخر ملک ناموں کی تعداد دیکھنے کے بعد بھی آپ انھیں آٹے میں نمک سے تشبیہ دے رہے ہیں؟ بھائی! ہماری محفل میں تو نمک ہی نمک ہوتا ہے اسی لیے تو یہ محفل کم اور نمکدان زیادہ نظر آتی ہے۔ جو تھوڑا بہت آٹا باقی ہے اسے ہم بچانے کی کوششوں میں لگے رہتے ہیں کہ کہیں 'غریبی میں آٹا گیلا' والی مثل صادق نہ آجائے۔

ھادی بخش شاہ غالب، چھتر نصیر آباد سے لکھتے ہیں۔ "آپ کا رسالہ پڑھتے ہوئے کئی سال گزر گئے لیکن معلوم نہیں کیوں کبھی قلم کو جنبش نہیں دی۔ رسالے یوں تو بہت پڑھے لیکن کوئی اتنا متاثر نہ کر سکا جتنا سسپنس نے کیا اور اب ہر ماہ شدت سے اس کا انتظار رہتا ہے۔ اس ماہ کی کہانیوں میں سب سے زیادہ 'آگہی'، اور پھر 'نقاب کشائی' پسند آئی۔"

منور شاہ نے میرپور خاص سے اپنی ایک طویل کہانی کا خلاصہ ارسال کیا ہے اور لکھتے ہیں۔ "میں نے بڑی کاوشوں کے بعد سسپنس کے لیے ایک پُراسرار اور سسپنس سے بھرپور کہانی مرتب کی ہے جو میری محنت کا حاصل ہے۔ یہ کہانی جمیل احمد کی سرگزشت ہے۔ یہ کہانی فرضی ہے جو میرے ذہن سے نکلے الفاظوں کا مجموعہ ہے۔ میری کہانی کسی بھی کہانی یا واقعے کی نقل نہیں۔ یہ میرا حلفیہ بیان ہے۔ جمیل احمد جو طاقت اور علم کی دولت سے مالا مال ہے اور اُس کی زندگی عذاب سے بدتر گزر رہی ہے۔ کہانی ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے۔ جہاں تک میرے قلم نے ساتھ دیا اور جہاں تک میں نے ابھی کہانی لکھی ہے اس کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے۔ اگر الفاظوں کی ترتیب غلط ہو تو معاف فرمانا، مہربانی۔"

اس کے ساتھ ہی ہمیں اجازت دیجیے ۔۔۔ ان مہربانوں سے معذرت کے ساتھ جن کے نوازش نامے شریکِ اشاعت نہ ہوسکے۔ ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں ۔۔۔ خدا حافظ۔

ارشد علی مہر، منڈیالہ تیگہ۔ شیخ نسیم، کہروڑ لعل عین۔ شاہ نواز ڈار، لالیاں۔ مقصود احمد سیار، مردان۔ طارق بشیر مرزا عاصی، کھیوڑہ۔ سعید ناز، ملتان۔ عبدالحمید زرگر، چک بیلی خاں۔ عطا محمد خان، مخدوم رشید۔ سید محمد غازی شاہ، کراچی۔ شیخ الیاس ربانی، لاہور۔ عبدالخالق ناز سیرا، سمبڑیال۔ سید اسرار حسین شاہ، میلسی۔ مشتاق احمد راہی، کشروٹ گلگت۔ محمد طارق انجم شیخ، میاں چنوں۔ ڈاکٹر شبیر احمد، پیرجو گوٹھ۔ سجاد مصطفیٰ، بہاول پور۔ محمد علی الدین، معظم آباد۔ خالدہ شفقت بے بی، حاصل پور۔ امان اللہ خاں قائم خانی، ڈگری۔ خالدہ احمد، سرائے عالمگیر۔ محمد حنیف خان، ہمراہی بگٹی، بستی۔ نصراللہ جگری، کہروڑ لعل عین۔ ظفر اقبال شاہد، نکودر چک نمبر ۸۹۔ ر۔ ب۔ نثار احمد خاں، ملتان۔ حسن شاہ کاظمی، گلگت۔ محمد اکبر نعیم، دودیال۔ قمر رضا انجم تجمل، دودیال۔ سید تجمل حسین قمر، دودیال ۔۔ اظہار احمد، لاہور۔ عبدالجاوید سدھالیو، جیکب آباد۔ اعجاز احمد، لیہ ٹاؤن۔ فاطمہ شیریں گیلانی، جھنگ صدر۔ اسد بلند خان ٹونکی، کراچی۔ سید حشمت علی شاہ، عبدو۔ مصری خاں تبسم، موضع چینہ۔ محمد مظہر عظیم اعوان، نور پور سیٹھی۔ شمعو شام، گجرات۔ ظہیر ملنگی، کھیوڑہ۔ پپو لال، اسٹیشن لنڈو۔ لانس نائک محمد شیر ہیدھن۔ خواجہ غلام جعفر وحید، چک رادھن۔ شکیلہ ہاشم تبسم، چنیوٹ۔ شبیر احمد بھٹو، رتو ڈیرو۔ محمد انور، نوشکی۔ محمد خالد جاوید چیمہ، اچھا پا نوالی۔ خیر الولی خان تشنہ، نوشہرہ۔ عزت خان اورکزئی، خان شاہ آفریدی، نصراللہ جان محمود، ظاہر گل مہمند، مکران اسکاؤٹس تربت۔ محمد بلال نازی، مٹھن کوٹ۔ فتح محمد فانی، کرگ آلائی۔ مسرت حکیم ۔ خالد منیر خالد، چکوال۔ امیر نواس راہی، سرڈھیری۔ مقصود احمد، کوٹ بھسر پورہ۔ ایم شیر خان رحمانی، پھگوڑہ بٹرام۔ سلمیٰ بیگم، بہاولپور۔ راؤ محمد اقبال موٹھیا، ملتان کینٹ۔ سید اسلم توقیر شاہ ہاشمی، پنڈدادن خان۔ پریتم کمار شاد، سوئی گیس فیلڈ۔ بابر جاوید گلیانہ، چودھری علی حسن، کھپرو۔ جمعہ خان بلوچ، منگچر۔

دو متصادم معاشروں کی داستان۔ ان میں ایک تو تنگ نظری اور تنگ دلی میں مبتلا تھا اور دوسرا اپنی سوچ اور ذات میں وسیع پھیلاؤ رکھتا تھا۔ ان دونوں میں ایک جنگ تو کھلے میدانوں، شہروں اور قلعوں کے اندر برپا ہو رہی تھی اور دوسری ذہنوں، خیالوں اور افکار اور اعمال میں جاری تھی۔ میدانوں میں ہارنے والے ایک ایسی منصوبہ بندی کرنے لگے جس سے شیر، رُوباہ بن جائے۔ وہ بہادروں کی صف میں انقلاب برپا کر دینا چاہتے تھے۔ ایک ایسا فکری انقلاب جو اُن کو اُن کے ہتھیاروں سے محروم کر دے۔ میدانوں میں جنگیں ہوتی رہیں۔ ہار جیت کے فیصلے ہوتے رہے لیکن جیتنے والے مدتوں یہ نہ سمجھ سکے کہ ان کے ذہنوں اور فکروں میں جو سیندھ لگا دی گئی ہے اس کا کسی دن بھیانک اور عبرتناک نتیجہ نکلے گا۔ اس عملِ رستخیز میں اُن کا مؤرخ بھی شامل ہو گیا۔ اس مؤرخ کا کام یہ تھا کہ سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کر دکھائے۔ حملہ آوروں کو مدافع اور مدافع کو حملہ آور بنا دے۔ یہ کام کل بھی ہو رہا تھا اور آج بھی جاری ہے۔

تاریخ کا ایک جھوٹ جو سچ بنا کے پیش کیا جاتا رہا۔ تاریخ کا ایک مظلوم جس کو ظالم بنا کے پیش کیا گیا۔

خندقیں کھودی جا چکی تھیں، یہ خندقیں انگریزی کے حرف ایل کی شکل میں تھیں۔ یو اس لیے نہ بن سکیں کہ اس کے ایک طرف غیر ہموار زمین تھی اور اُدھر سے ہندوؤں کا آنا محال تھا۔ ندی نالے، ٹیلے اور چھوٹی موٹی بے ترتیب پہاڑیاں، جن کو گھوڑوں کے ذریعے عبور نہیں کیا جا سکتا تھا۔

سلطان ہر روز جنگی منصوبہ بندی کرتا رہتا، فوج کی کثرت نے سلطان کی فوج میں بھی بے چینی اور خوف پیدا کر دیا تھا۔

اس طرح تین دن گزر گئے اور ہندوؤں کی فوجی قوت اور تعداد

میں اضافہ جاری رہا۔

سلطان نے اپنے جنگی ماہرین کی مجلسِ مشاورت بٹھائی اور ان کے سامنے موجودہ مشکل اور تشویشناک صورت بیان کر دی، پوچھا "اب آپ لوگ بتائیں کہ ہم کیا کریں؟"

ارسلان جاذب نے جواب دیا "جب تک ہمارا دشمن بھی صف بند نہ ہو جائے ہم جنگ کا آغاز کس طرح کریں گے۔"

عبداللہ طائی نے مشورہ دیا "وہ تعداد میں بہت زیادہ ہیں، اگر ہماری فوج ان کی مزاحمت کے بغیر ہی ان کو قتل کرنا شروع کر دے تو یقیناً ایک ایسا مرحلہ آجائے گا کہ ہمارے سپاہیوں کے ہاتھ شل ہو جائیں گے اور ہندوؤں کی تعداد ختم نہ ہوگی۔"

سلطان کو اس رائے سے بالکل اختلاف نہیں تھا، بولا۔ "یہ تو ٹھیک ہے مگر ہمیں اس سے ہمت نہیں ہارنا چاہیے، ان کی کثرت سے خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، میں نے اس کثرت کا حل بھی سوچ لیا ہے۔"

ابو علی کرمانی بھی مجلسِ مشاورت میں موجود تھا، اس نے انکشاف کیا "یہ ننگ دھڑنگ قوم بڑی خطرناک ہے، اس کو ہندوستان میں گکھڑ کہا جاتا ہے، سرفروشی اور دلیری ان کا.... طرۂ امتیاز ہے۔"

عبداللہ طائی نے کہا "کیا حملے کا آغاز ہم کریں گے؟"

سلطان نے جواب دیا "نہیں، یہ بات قبل از وقت ہے۔ ویسے اس کا بھی امکان ہے کہ آغاز ہم ہی کر دیں۔"

ابو علی کرمانی سب سے زیادہ فکرمند تھا "میں تو اب بھی سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا ہوں کہ ہم اس جمِ غفیر کا مقابلہ کس طرح کریں گے؟"

سلطان نے جواب دیا "جنگی منصوبہ بندی میرا کام ہے، اسے میں سوچوں گا اور سوچ رہا ہوں۔"

عبداللہ طائی نے پوچھا "اگر ہم سردست پشاور ان کے حوالے کر دیں اور بعد میں تیاری کر کے ان کا مقابلہ کریں تو کیا ہرج ہے؟"

سلطان نے جواب دیا "اس طرح تو کبھی سوچنا بھی نہیں۔ اگر ہم پشاور کو مقابلے کے بغیر ہی ان کے حوالے کر دیں گے تو اس سے ہندوؤں کے حوصلے بڑھ جائیں گے اور ہمارے حوصلے پست ہو جائیں گے اور پھر یہ کہ ایک بار اپنے ہاتھ سے نکل جانے والی چیز دوبارہ دشواری سے ہاتھ آتی ہے۔"

ابو علی کرمانی نے عرض کیا "بات پھر وہیں پہنچ گئی، ان طاغوتی لشکروں کا مقابلہ کیوں کر ہوگا، یہ شیاطین کی فوج ہے، ایک کو مارا جائے گا تو اس کی جگہ نئے آجائیں گے۔"

سلطان نے ابو علی کرمانی کو حکم دیا "ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ پہلے ہم جنگی نقشہ تیار کریں، راجگانِ ہند میں سے کون کہاں ہو گا، یہ جاننا بہت ضروری ہے اور ان سب سے زیادہ یہ جاننا ضروری ہے کہ ان سب کا سرخیل آنند پال کہاں ہوگا، پھر میں صحیح جنگی منصوبہ بندی کر لوں گا۔"

پانچ دن اور گزر گئے۔ پینتیس دن بعد بھی ہندوستانی لشکروں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا، وہ برابر آتے چلے جا رہے تھے۔

ابو علی کرمانی نے عرض کیا "حضورِ والا! ایسا لگتا ہے جیسے یہ سلسلہ کبھی ختم ہی نہ ہوگا اور انسان کہیں بلوں سے نکلے چلے آرہے ہیں۔"

سلطان نے بھی اس کا اقرار کیا کہ اب انتظار مناسب نہیں ہے۔

ہندوؤں کے لشکر کی طرف سے ایک تیر سلطان کے لشکر میں گرا، کسی سپاہی نے اسے اٹھایا تو پتا چلا کہ یہ ایک خط ہے جو آنند پال نے سلطان کو بھیجا ہے، اس میں آنند پال نے نہایت نرم اور شیریں لہجے میں سلطان کو مطلع کیا:

"سلطانِ عالی شان کو معلوم ہونا چاہیے کہ اب حالات بالکل بدل چکے ہیں، ہم مظلوم ہیں اور سلطان ظالم، لیکن اس کی بھی کوئی حد ہوتی ہے، پشاور ہمارے حوالے کر دو، کیوں کہ وہ ہمارا ہے اور ہم اس سے کبھی بھی دستبردار نہیں ہوں گے، اس کے علاوہ سلطان کی حدودِ سلطنت میں ایک شہر ہے ہرات۔ یہ شہر بھی ہمارا ہے کیوں کہ اس کو ہرات تو تم لوگوں نے کر دیا ہے ورنہ اس کا قدیم نام ہری ہے اور ہری ہمارے دھرم میں پرمیشور، بھگوان، ایشور اور وشنو کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہ اس ذات کے مختلف نام ہیں، مہادیو بھی ہری ہے، لیکن ہم سلطان سے ہرات نہیں مانگتے، ہم تو صرف پشاور طلب کر رہے ہیں، سلطان کا بڑا بھرم ہے، دبدبہ ہے، ترکستان اور ایران پر سلطان کی دہشت طاری ہے لیکن اگر پشاور ہمارے حوالے نہ کیا گیا تو ہم اس کو زبردستی چھین لیں گے، سلطان نے ہماری فوج دیکھ لی، یہ اتنی ہی نہیں ہے جتنی اس وقت نظر آرہی ہے، اس میں اضافہ ہوتا رہے گا اور اب میں پورے یقین اور اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اسے کر دکھانا کوئی مشکل بات نہیں اور سلطان کو اس بُری گھڑی پر ضرور غور کرنا چاہیے کہ جب میں پشاور زبردستی حاصل کر لوں گا اور سلطان کی اس ہار کا اثر اس کے دوسرے شہروں اور علاقوں پر بھی پڑے گا اور سلطان کے کمزور دشمن بھی شیر ہو کر اپنے اپنے شہر اور علاقے واپس لینے کی فکر کریں گے۔

سلطان نے ماضی میں میرے سورگ باش پتا جے پال پر احسان کیا تھا اور میں خود بھی سلطان کا احسان مند رہ چکا ہوں، بس یہی احسانات آڑے آرہے ہیں ورنہ میں اتنی بات بھی نہ کرتا اور پشاور پر زبردستی قبضہ کر لیتا۔ میں سلطان کے احسانات کا حقیر سا بدلہ یوں دے رہا ہوں کہ پشاور مانگ رہا ہوں، چھین نہیں رہا۔ سلطان کو میری اس پیش کش پر غور کرنا چاہیے، میں جواب اور جواب سے زیادہ اس پر عمل درآمد کا منتظر ہوں۔"

سلطان نے یہ خط پڑھا تو آنند پال کی جسارت پر اسے افسوس بھی ہوا اور غصہ بھی آیا۔ پہلے تو اس کے جی میں آئی کہ اس خط کا کوئی جواب ہی نہ دے لیکن ذرا دیر بعد ہی اس نے اپنا فیصلہ بدل دیا اور جواب لکھ دیا:

"آنند پال! تیری طبیعت کے فساد نے تجھ کو جو راستہ دکھایا ہے، وہ کسی کے لیے بھی اچھا نہیں، پشاور کے خیال کو اپنے دل سے نکال دے۔ وہ تجھ کو نہیں دیا جائے گا، ہرات اور ہری کے بارے میں تم نے جو گہر افشانی فرمائی ہے، وہ کسی لطیفے سے کم نہیں۔ تم کہتے ہو کہ تم نے مفاہمت اور شرافت کی راہ اختیار کی ہے اور میں کہتا ہوں، تم نے شرارت کی راہ پکڑی ہے، پورے ملک کی فوجیں میرے سر پر لے آنے والا مفاہمت کی بات کس طرح کر سکتا ہے، اب تو ہم دونوں کی ثالث تلوار ہی بنے گی۔ میں تمھارا منتظر ہوں۔"

جواب کو اسی طرح آنند پال کے پاس روانہ کر دیا گیا جس طرح آنند پال کا خط آیا تھا۔

چالیس دن تک دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابل کھڑی رہیں اور چالیسویں دن بھی آنند پال کی افواج میں اضافے کا عمل جاری رہا۔

ابو علی کرمانی نے میدانِ جنگ کا ایک نقشہ بنایا اور اس نقشے میں یہ بتایا گیا تھا کہ کون کہاں پر ہے۔ آنند پال گکھڑوں کے پیچھے کھڑا تھا۔ اس نے سلطان کو بتایا کہ سامنے کی فوج میں نیم وحشی گکھڑ سب سے آگے اور خطرناک ہیں، انھوں نے راجا آنند پال کو تحفظ فراہم کیا ہے، اس لیے جب تک ان کا صفایا نہیں کیا جائے گا، بات نہیں بنے گی۔

سلطان نے اچانک اپنی فوج میں اعلان کر دیا۔ جنگ کا آغاز اس کی جانب سے ہوگا۔

عبداللہ طائی نے عرض کیا "کیا یہ مناسب ہے؟"

ارسلان جاذب نے جواب دیا "ہاں یہ مناسب ہے کیوں کہ یہ حکم سلطان نے دیا ہے۔"

ایک ہزار ماہر تیر اندازوں کو آگے بلایا گیا اور انھیں حکم دیا گیا کہ وہ تیر چلاتے ہوئے آہستہ آہستہ ہندوؤں کی طرف بڑھیں۔

ہندوؤں میں ہاہاکار مچ گئی، گکھڑ تیر اندازوں کی پروا کیے بغیر دیوانہ وار آگے بڑھے اور ننگے پاؤں، ننگے سر اور ننگے دھڑ مسلمانوں کی طرف بڑھے۔ یہ تیس ہزار گکھڑ اپنے سامنے کی خندق اس طرح عبور کر گئے جیسے کوئی نالی پھاند گئے ہوں۔ ان لوگوں نے سلطان کی فوج میں گھس کر تباہ کاری مچا دی۔ سلطان کی فوج کو یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ گکھڑ خندق عبور کر لیں گے، یہ جو کچھ ہوا تھا، غیر متوقع ہوا تھا۔ اس لیے آناً فاناً تین ساڑھے تین ہزار مسلمان قتل کر دیے گئے اور بقیہ پر ان کی دہشت طاری ہو گئی۔

عبداللہ گھبرایا ہوا آیا "سلطانِ محترم! اب کیا ہوگا، ہماری فوج میں ابتری اور بددلی پھیل چکی ہے، اس کے پاؤں اکھڑ رہے ہیں۔"

سلطان نے جواب دیا "ہندوؤں پر حملہ جاری رکھا جائے، میں گکھڑوں کا انتظام کرتا ہوں۔"

ارسلان جاذب نے گکھڑوں کی پشت سے ان پر حملہ کر دیا۔ اور تیزی سے ان کا صفایا شروع کر دیا۔ اب گکھڑوں نے مدافعت شروع کر دی۔

سلطان چھلاوے کی طرح کبھی یہاں نظر آتا اور کبھی وہاں۔ وہ کسی ایک جگہ ٹک ہی نہیں رہا تھا۔

عبداللہ طائی نے گکھڑوں کو ارسلان جاذب کے حوالے رہنے دیا اور خود اپنے دستے کے ساتھ پیچھے ہٹ گیا، اب وہ ہندوؤں کے میسرہ پر حملہ کر دینا چاہتا تھا لیکن سلطان نے اس کو روک دیا اور پوچھا۔ "آنند پال کہاں ہے، مجھے اس جنگ کو طول نہیں دینا ہے، میں فیصلہ جلدی اور اپنے حق میں چاہتا ہوں۔"

عبداللہ طائی نے جواب دیا "گکھڑوں کے عقب میں آنند پال اپنے ہاتھی پر سوار ہماری فوج میں داخل ہونے کا منتظر ہے۔"

سلطان نے اپنے دمدموں سے کام لینے کا پختہ عزم کر لیا۔

ابو علی کرمانی نے سلطان کو خبردار کیا "آنند پال اپنے ہاتھوں

کے اشاروں سے اپنی فوج کو آگے بڑھنے کی تلقین کر رہا ہے۔ آگے بڑھو اور سلطان کو قید کر لو۔"

سلطان نے اعلان کر دیا۔"جو بھی آنند پال کو گرفتار کر کے لائے گا اس کو اس کی مرضی کا علاقہ دے دیا جائے گا۔"

فوج میں نیا حوصلہ آ گیا۔ نیا ولولہ پیدا ہو گیا۔ وہ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی فکر میں اپنی جانیں قربان کر رہے تھے۔

دونوں فوجوں کو آمنے سامنے پڑے ہوئے چالیس دن گزر گئے۔ ہندوؤں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا۔ اب سلطان کے لیے مزید انتظار مناسب نہیں تھا کیونکہ ہندوؤں کی موجودہ تعداد میں مسلسل اضافے کا مطلب یہ تھا کہ پانی سر سے اونچا ہو جائے۔

ابو علی کرمانی کبھی ہندوؤں کے ٹڈی دل عساکر کو دیکھتا اور کبھی سلطان کے طور طریق اور حرکات و سکنات سے اس کے اطمینان یا پریشانی کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتا لیکن سلطان اپنے احساسات اور جذبات کو چھپائے رکھنے پر قادر تھا۔

عبداللہ طائی اور ارسلان جاذب سلطانی احکام کے منتظر تیار اور مستعد تھے۔

سلطان نے اپنی فوج سے ایک ہزار ماہر تیر اندازوں کو الگ کیا اور انھیں ایک جگہ سے خندق کو عبور کرا دیا۔ وہ خود بھی ان کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ آخر ایک جگہ رُک کے اس نے اپنے تیر اندازوں کو ہدایت کی۔" دیکھو تم سب آگے بڑھ کے تیر اندازی شروع کر دو، ہندو جوابی کارروائی کرے گا۔ تم سب اس کی معمولی سی مزاحمت کرو گے اور پھر ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت آہستہ آہستہ پسپائی اختیار کرو گے۔ ہندو تمھارا پیچھا کریں گے اور اپنی جگہ چھوڑ کے کھلے میدان میں خندق کے قریب آ جائیں گے۔"

ایک تیر انداز نے پوچھا۔" پھر اس کے بعد؟ وہ بہت زیادہ ہیں اور ہم بہت کم۔"

سلطان نے اپنی سپاہ کی بددلی اور مایوسی کو محسوس کیا۔ ان کی ہمت بندھاتا ہوا بولا۔" میں اپنی پوری فوج کو آگے نہیں لے جا سکتا۔ کیونکہ اس طرح میں خود کو ان کے حصار میں دے دوں گا۔ انھیں پسپائی اختیار کر کے یہاں تک لے آؤ۔"

سلطان تیر اندازوں کو روانہ کر کے خندق کے اس پار واپس آ گیا اور اپنی فوج کو کسی متوقع صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے چوکس کر دیا۔

ہزار تیر انداز ہندوؤں پر تیروں کی بارش کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ سلطان کی طرف سے حملے کا آغاز ہو چکا تھا۔ دوسری طرف ہندوؤں کی فوج میں گکھڑ قوم سب سے آگے تھی۔ ننگے پاؤں، ننگے سر اور ننگے بدن گکھڑ جوان کھانڈے اور تلوار ہوا میں لہراتے ہوئے خندق کی طرف بڑھے اور بڑی آسانی سے دوسری طرف اتر گئے۔ اب تیس ہزار گکھڑ جوان سلطانی سپاہ میں کھلبلی مچانے کے لیے وارد ہو چکے تھے۔ ہزار تیر انداز اپنے محاذ پر مصروف تھے۔ ان کو گکھڑوں کی یلغار کا کچھ پتا نہ تھا۔

گھکڑوں نے اچانک حملہ آور ہو کر تہلکا مچا دیا اور مسلمان سپاہیوں کا قتلِ عام شروع کر دیا۔ یہ تقریباً تیس ہزار تھے اور خندق کو پار کر کے سلطانی لشکر میں داخل ہو گئے تھے۔ سلطان اس جارحانہ کارروائی سے لاعلم تھا۔ اس نے گکھڑوں کی سرفروشی سے پوری ہندو سپاہ کا اندازہ لگایا تو کانپ گیا۔

مسلمان بھی اس اچانک حملہ آوری سے خوفزدہ ہو گئے تھے۔ انھیں گکھڑوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے کا موقع ہی نہ ملا اور گکھڑ انھیں بآسانی قتل کرتے رہے۔ مسلمان مسحور اور مبہوت قتل ہوتے رہے۔ ایسا لگتا تھا گویا مسلمان کسی عملِ تنویم کے زیرِ اثر ہیں۔

سلطان نے اس اثر کو ختم کرنے کا تہیہ کر لیا اور اپنے خاص دستے کو حکم دیا کہ گکھڑوں کو تیروں کی باڑھ پر رکھ لیا جائے اور ان کو جلد از جلد خندق کے اس پار دھکیل دیا جائے۔

گکھڑوں پر تیروں کی بارش کر دی گئی۔ وہ اس کے لیے بالکل تیار نہ تھے۔ وہ گھبرا کے خندق کی طرف بڑھے۔ سلطان نے انھیں تلواروں کی دھار پر رکھ لیا۔

آنند پال ہاتھی پر سوار اپنی سپاہ کو آگے بڑھنے کی تلقین کر رہا تھا۔ اس کو بالکل یقین نہ تھا کہ اتنی قلیل سپاہ سے اس کی افواج پر حملہ کر دیا جائے گا۔ وہ سلطان اور مسلمانوں کی بہادری اور حوصلے کا قائل ہو گیا۔

ہزار تیر انداز اپنا مقصد حاصل کر چکے تھے اور اب وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہے تھے اور آنند پال کے حکم کے بموجب اس کی سپاہ تیر اندازوں کو پیچھے دھکیل رہی تھی۔ گویا اب دو محاذوں پر جنگ چھڑ چکی تھی۔

سلطان کا دستۂ خاص ننگے حملہ آوروں کو پیچھے دھکیلنے میں کامیاب ہو چکا تھا لیکن اتنی دیر میں چار پانچ ہزار مسلمان قتل کیے جا چکے تھے۔

گکھڑوں کو خندق سے نکال باہر کیا گیا۔

اب باقاعدہ جنگ شروع ہو چکی تھی۔ آنند پال اپنی فوج سے چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔" سورماؤ! تم تعداد میں بہت زیادہ ہو اور مسلمان بہت کم۔ اگر تم چاہو تو انھیں چند گھڑی میں خاک میں ملا دو۔ تم اگر سب مل کے ان پر تھوک دو تو پوری مسلم فوج اس میں ڈوب جائے۔ آگے بڑھو اور انھیں خاک میں ملا دو۔"

ہندو سورما مسلمانوں پر پل پڑے۔ مسلمان خندق کو عبور کر کے ہندو سپاہ کو آگے بڑھنے سے روک رہے تھے۔ سلطان ان کو بتا رہا تھا۔" مسلمانو! تم اپنے جس دشمن سے لڑ رہے ہو وہ اگر ہار جائے گا تو اپنے وطن واپس چلا جائے گا۔ ہندوستان ایک وسیع ملک ہے۔ آنند پال اور اس کی فوج کی وسیع و عریض جائے پناہ۔ لیکن اگر تم کو شکست ہو گئی تو تم اس بازی میں اپنا سب کچھ ہار جاؤ گے۔ تمھاری کوئی جائے پناہ نہیں۔ تم طارق بن زیاد کی طرح اپنے جہاز جلا کے لڑ جاؤ۔"

ہندوستان کے دوسرے راجا بھی اس جنگ میں حصہ لینے کے لیے بے چین تھے لیکن یہاں میدان میں اتنی گنجائش ہی نہ تھی اور ساری فوج ایک ساتھ مسلمانوں پر حملہ آور نہیں ہو سکتی تھی۔

آنند پال اور اس کی فوج پوری کوشش کے باوجود مسلمانوں کو پیچھے دھکیلنے میں ناکام رہی اور دن عروجِ آفتاب سے گزر کے زوالِ آفتاب میں داخل ہو چکا تھا۔ آنند پال اپنے ہاتھی کی پشت سے مسلمانوں کو للکارتا اور ہندوؤں کے حوصلے بڑھاتا رہا۔

تھانیسر کا راجا بھی آگے بڑھا اور آنند پال کے قریب پہنچ کے پوچھا۔" کیا میری سپاہ کو جنگ کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی؟"

آنند پال نے جواب دیا۔" کیوں نہیں، کیوں نہیں، اپنی سینا کو آگے بڑھاؤ اور مسلمانوں کو خاک اور خون میں ملا دو۔"

تھانیسر کا راجا واپس گیا اور کچھ دیر بعد اپنی سینا کو آگے بڑھا لایا۔ سلطان نے اس یلغار کو روکنے کے لیے عبداللہ طائی کو آگے بڑھایا اور اسے حکم دیا کہ تھانیسر کے راجا اور اس کی فوج کو وہیں روک دیا جائے جہاں تک وہ آ چکی ہے۔"

عبداللہ طائی اپنی فوج کے ساتھ آگے بڑھا اور تھانیسر کے راجا کے سامنے فولادی دیوار کی طرح کھڑا ہو گیا۔ تھانیسر کا راجا کوشش کے باوجود عبداللہ طائی کو پیچھے ہٹانے میں ناکام رہا۔

آنند پال کو اپنی ناکامی پر غصہ آ رہا تھا اور اس کی فوج اپنی بے بسی اور ناکامی پر مایوس اور شرمندہ تھی۔

تھانیسر کے راجا نے آنند پال کو مشورہ دیا۔" آنند پال جی! اگو کہ مسلمان بہت کم ہیں لیکن ان کا حوصلہ ہمیں یہ بتا رہا ہے کہ یہ لوگ بمشکل ہی ہرائے جا سکتے ہیں اور اگر ہم ان کو آج ہی شکست نہ دے سکے تو اس کا ہماری سینا پر بہت برا اثر پڑے گا۔"

اب شام زیادہ دور نہیں تھی۔ آنند پال نے اپنے مہاوت کو حکم دیا" ہاتھی کو پیچھے لے چل۔ دوسرے راجاؤں سے ملاقات اور مشورے ہی کر لیں۔"

مہاوت نے عجلت میں ہاتھی کا رخ موڑا اور اس کو پیچھے کی طرف بھگانے لگا۔

آنند پال کے پیچھے کی طرف ہاتھی دوڑانے کی وجہ سے ہندوؤں کو یہ شبہ ہو گیا کہ کسی وجہ سے آنند پال کو شکست ہو گئی ہے اور اب وہ راہِ فرار اختیار کر رہا ہے۔ اس خبر نے ہندو سپاہ میں ابتری اور انتشار پھیلا دیا اور وہ بھی ادھر اُدھر دوڑنے بھاگنے لگے۔ جس کا جدھر منہ اٹھا، بھاگ کھڑا ہوا۔

آنند پال چیخ چیخ کے اپنی سینا کو بتا رہا تھا" دیکھو ختم نہیں ہوئی، مجھے شکست نہیں ہوئی۔ میرا ہاتھی مہاوت کے قابو سے نکل چکا ہے اور یہ میری مرضی کے خلاف بھاگا چلا جا رہا ہے!"

لیکن اس ہنگامۂ دار و گیر میں آنند پال کی آواز کسی نے بھی نہیں سنی اور آنند پال کا ہاتھی اپنی ہی فوج کو روندنے اور برباد کرنے لگے۔

سلطان کی تیز اور معاملہ فہم نظروں نے اس جنگ کے انجام کو سمجھ لیا تھا، ہندو جنگ کے پہلے دن ہی شکست کھا چکے تھے۔ ہندو فوج کا بیشتر حصہ جنگ لڑے بغیر ہی راہِ فرار اختیار کر چکا تھا، انسانوں کا جنگل بے سر و پا اور بے اختیار اِدھر اُدھر بھاگنے میں مشغول تھا۔

آنند پال نے جب یہ محسوس کر لیا کہ شومئی قسمت سے شکست ہو ہی چکی ہے تو اس نے واقعی راہِ فرار اختیار کر لی۔

سلطان نے عبداللہ طائی کو حکم دیا" عبداللہ! ہم نے خوش قسمتی سے فتح حاصل کر لی ہے آنند پال بھاگ کھڑا ہوا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ راستے میں کہیں دم لے اور اپنے شکست خوردہ لشکر کو دوبارہ منظم اور مرتّب کر کے ہمارے مقابلے پر واپس آجائے، تم اس کا پیچھا کرو اور کوشش کرو کہ وہ زندہ گرفتار کر لیا جائے۔"

عبداللہ طائی کو حکم کی تعمیل میں ذرا بھی دیر نہیں لگی۔ اس نے اپنے حصّے کی فوج ساتھ لی اور آنند پال کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔

میدانِ جنگ میں ہر طرف لاشیں ہی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ راجاؤں کے خیمے خالی پڑے تھے۔ ان کا قیمتی ساز و سامان اب سلطان کے قبضے میں تھا۔ ابو علی کرمانی جنگ کے نتیجے پر حیرت زدہ تھا، کہنے لگا" جنابِ والا! آج مجھے معلوم ہوا کہ اقبال مندی کیا ہوتی ہے؟"

ارسلان جاذب نے اپنے بارے میں معلوم کیا" میرے لیے کیا حکم ہے؟"

سلطان نے جواب دیا" تو اپنی نگرانی میں میدانِ جنگ کو صاف کروا۔"

ارسلان جاذب نے ہندوؤں کے خیموں کی صفائی کا کام اپنی نگرانی میں کرانا شروع کر دیا۔

سلطان نے اپنی فوج کو یک جا کیا اور ابو علی کرمانی سے پوچھا" بتاؤ" اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

ابو علی کرمانی نے جواب دیا" آپ نے خدا کے فضل و کرم سے جنگ جیت لی۔ ہمارے لیے یہی کافی ہے اب ہمیں نمازِ شکرانہ ادا کرنا چاہیے اور غزنی واپس جا کے ملکی نظم و نسق پر پوری توجہ دینا چاہیے کیونکہ اب ہم پوری یک سوئی سے . . ."

سلطان نے اس کی بات کاٹ دی" نہیں، ابھی خطرات ٹلے نہیں؟ آنند پال کو شکست تو ہو گئی ہے مگر جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی۔"

ابو علی کرمانی نے عرض کیا" عبداللہ طائی، آنند پال کے تعاقب میں جا چکا ہے۔ اللہ نے چاہا تو اسے گرفتار کر لیا جائے گا۔ پھر جنگ کس طرح ختم ہو گی؟"

سلطان بہت ناراض تھا۔ فتح کے بعد اس کا غصّہ ظاہر ہو رہا تھا" ہندوؤں نے مجھے بہت ستایا ہے۔ میں ان سے نہیں لڑنا چاہتا تھا مگر انھوں نے بار بار مجھے جنگ پر مجبور کر دیا اور اس بار تو آنند پال نے یہ غضب کر دیا کہ اپنے ملک کے تمام راجوں، مہاراجوں کو میرے مقابلے پر گھسیٹ لایا۔ میں باری باری ان سب سے لڑوں گا، ان سب کو سبق دوں گا۔ اب میری حکومت کی سرحدیں بھی بدل جائیں گی۔ پہلے ہمارا آخری شہر پشاور ہوا کرتا تھا مگر اب ہمارا آخری شہر لاہور قرار پائے گا۔"

سلطان نے سکون کی سانس لیے بغیر یورش و یلغار کی تیاری جاری رکھی۔ وہ اپنی فوج کو اندرونِ ہند تک لے جانا چاہتا تھا۔

چنانچہ وہ یہاں کے میدانِ جنگ سے ہندوستان جانے کا پکّا ارادہ کر چکا تھا۔ اس جنگ میں کچھ ہندو گرفتار کر لیے گئے تھے۔ ان گرفتار ہونے والوں میں کئی آنند پال کے ساتھی بھی تھے۔ سلطان کا منصوبہ ساز دماغ اپنے مستقبل کا تانا بانا بُننے میں مشغول تھا۔ اب وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ آنند پال شکست کھانے کے بعد کہاں جا سکتا ہے؟

آنند پال کی شکست کے بعد جو ہندو قید کیے گئے تھے ان میں تربھون نامی ایک پنڈت بھی تھا۔ یہ شخص ان ہنگامی دنوں میں آنند پال سے زیادہ قریب رہا تھا اور کسی حد تک اس کو آنند پال کے منصوبوں کا علم بھی تھا۔ سلطان نے ان سے بہت اچھا سلوک کیا۔ ہندو قیدی بھی سلطان کے اس سلوک سے بہت متاثر ہوئے۔

سلطان نے انھیں بتایا کہ" میں ہندوؤں سے جنگ نہیں کرنا چاہتا تھا، مجھے جنگ پر مجبور کر دیا گیا۔ میں نے ہندوستان پر ایک بار بھی حملہ نہیں کیا، حالانکہ ہمارے شہروں پر کئی بار حملے کیے گئے۔ پورے ملک کے راجے، مہاراجے مجھ سے لڑنے آ گئے، مجھے جنگ پر مجبور کر دیا گیا۔"

تربھون اور دوسرے ہندوؤں کے لیے یہ بالکل نیا انکشاف تھا۔ حیرت سے پوچھا" آپ کو جنگ پر مجبور کر دیا گیا، یعنی؟"

سلطان نے جواب دیا" یعنی یہ کہ میں غزنی میں سکون سے بیٹھا تھا کہ میرے وقائع نویس یہ خبر لائے کہ ہم پر پچّیس تیس راجے، مہاراجے حملہ آور ہونے والے ہیں۔ میں میدانِ جنگ سے منہ نہیں موڑ سکتا تھا اس لیے وہاں ڈٹا رہا۔"

ان لوگوں نے سلطان کے چرچے تو خاصے سن رکھے تھے لیکن ملاقات پہلی بار ہوئی تھی۔ انھوں نے خود کو سلطان کے حوالے کر دیا اور عرض کیا" سلطان جی! ہم سب جنگی قیدی ہیں۔ آپ چاہیں تو ہمیں ہلاک کر دیں لیکن ابھی تک آپ نے ایسا نہیں کیا، پتا نہیں کیوں؟"

سلطان نے جواب دیا" میں مجبور آدمیوں کے قتل کا قائل نہیں لیکن میں ان کو معاف نہیں کروں گا جو مجھ سے جنگ کریں گے۔ میں نے ان راجوں، مہاراجوں کے نام لکھ لیے ہیں جو اس جنگ میں لڑنے آئے تھے۔"

تربھون نے پوچھا" کیا آپ پچّیس تیس راجوں سے جنگ لڑ لیں گے؟"

سلطان نے جواب دیا" کیوں نہیں۔ میں باری باری ان سب سے لڑوں گا اور انھیں یہ سبق دوں گا کہ کسی کو بلا وجہ تنگ کرنے کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔"

تربھون نے پیش کش کی" میں سلطان کی مدد کے لیے حاضر ہوں۔"

سلطان کو اس پر سادھو ہونے کا شبہ تھا، پوچھا" تیرا نام؟ کیا تو سادھو ہے؟"

تربھون نے جواب دیا" میں سادھو نہیں ہوں۔ مجھے تربھون کہتے ہیں۔"

سلطان نے اس کی پیش کش قبول کر لی اور کہا" میں تجھ سے مدد ضرور لوں گا لیکن خالی خولی مفت نہیں، میں ہندو سپاہیوں کو اپنی فوج میں رکھنا چاہتا ہوں، اگر تو پسند کرے گا تو میں اپنے اس ارادے کا آغاز تیرے نام سے کر دوں گا اور تم سب قیدی سے میرے سپاہی بن جاؤ گے۔"

تربھون کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا، پوچھا۔ "کیا ہم ہندو بھی سلطان کی فوج میں شامل ہو سکتے ہیں؟"

سلطان نے جواب دیا" ہاں، میں تم کو بھی اپنی فوج میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔"

تربھون اور اس کے قیدی ساتھی تیار ہو گئے اور سلطان نے انھیں اپنے سپاہیوں میں شامل کر لیا۔ اب سلطان نے ان سے آنند پال کا پتا پوچھا" اب تم ہمارے ملازم ہو اور میں تمھاری مدد سے آنند پال تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ وہ شکست کھانے کے بعد کہاں جا سکتا ہے؟"

تربھون نے جواب دیا" نگر کوٹ۔ وہاں کے قلعے کا نام ہے بھیم دیو۔ یہ قلعہ پہاڑیوں میں ہے اور آنند پال نے کئی بار ہمیں یہ بتایا تھا کہ اگر اس نے کبھی سلطان سے راہِ فرار اختیار کی تو نگر کوٹ چلا جائے گا کیونکہ یہ قلعہ پہاڑیوں میں واقع ہونے کی وجہ سے بہت محفوظ ہے۔"

سلطان نے کہا" میں نگر کوٹ جاؤں گا اور ملاقات ہونے پر اس سے پوچھوں گا کہ وہ ہمیں بار بار کیوں ستا رہا ہے؟"

تربھون اور اس کے ساتھیوں کو آزاد کر کے فوج میں شامل کر لیا گیا۔ سلطان نے تربھون کی نشاندہی پر نگر کوٹ کا رُخ کیا۔

ارسلان جاذب کو ہندو فوج بھرتی کرنے کے معاملے میں اختلاف تھا اور اس کی دلیل یہ تھی کہ ہندو فوج وفادار نہیں رہے گی۔

لیکن سلطان نے ارسلان جاذب کے خیال سے اتفاق نہیں کیا۔ فوج نگر کوٹ جانے کے لیے تیار تھی۔ ارسلان جاذب نے ابو علی کرمانی کا سہارا لیا اور کہا" کرمانی جی! آپ سلطان کو سمجھائیں کہ وہ ہندوؤں کو اپنی فوج میں نہ شامل کریں۔"

ابو علی کرمانی اس حیرت انگیز خبر پر چونک پڑا، پوچھا" کیا یہ خبر درست ہے؟"

ارسلان جاذب نے جواب دیا" صد فی صد۔ ہندو قیدیوں کو سپاہی بنا کے فوج میں شامل کر لیا گیا۔ اس دَور کا یہ بدترین واقعہ ہے۔"

ابو علی کرمانی کو اب بھی ارسلان جاذب کی خبر پر شبہ تھا، کہا۔ "میں ان ہندوؤں سے ملنا چاہتا ہوں جو سپاہی بن کے سلطان کی فوج میں شامل ہو گئے۔"

ارسلان جاذب نے ابو علی کرمانی کو تربھون سے ملوا دیا۔ ابو علی کرمانی کچھ دیر کھڑا اس سادھو نما انسان کو دیکھتا رہا۔ اس کے بعد تیوریوں پر بل ڈالے اور تربھون کو ڈانٹنے لگا" تو کون ہے بھتو تو

قیدی تھا۔ پھر یہ آزاد کس نے کر دیا تجھ کو؟"

تربھون ڈر گیا۔ کہنے لگا "اس سلسلے میں آپ کو جو سوال بھی کرنا ہو، اپنے سلطان سے کیجیے۔"

ابوعلی کرمانی نے عرض کیا "بات صرف اتنی سی ہے کہ ..."

ابھی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ سامنے سے سلطان آ گیا۔

تربھون تیز تیز قدم چل کے سلطان کے بائیں جانب کھڑا ہو گیا اور ابوعلی کرمانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سلطان سے پوچھا۔

"سلطان جی! یہ کون ہے؟"

سلطان نے جواب دیا "میرا اتالیق، کیوں؟"

تربھون نے عرض کیا "اچھا۔ تو یہ بات ہے؟"

سلطان نے پوچھا "کیوں کوئی خاص بات؟"

ابوعلی کرمانی نے تربھون کو سرگوشیوں میں بات کرتے دیکھا تو خود بھی ان دونوں کے پاس چلا گیا۔

سلطان نے ابوعلی کرمانی کو کن انکھیوں سے دیکھا اور تربھون کو ہدایت کی "دیکھ، میں نے تجھ کو اختیار دیا تو ہندوؤں کو میرے پاس لا۔ میں ان کی فوج الگ تیار کروں گا۔"

تربھون نے ابوعلی کرمانی کی طرف فاتحانہ انداز سے دیکھتے ہوئے سلطان کو جواب دیا "میں اپنی قوم کے بہترین آدمیوں کو آپ کے پاس لاؤں گا اور مجھے یقین ہے کہ وہ بہت خوشی اور شوق سے آپ کی فوج میں داخل ہوں گے۔"

اب سلطان، ابوعلی کرمانی سے مخاطب ہوا "کرمانی! تم میرے ساتھ آؤ۔"

ابوعلی کرمانی بہت جذباتی ہو رہا تھا، بولا "جنابِ والا! اب میں اتنا حقیر ٹھہرا کہ ..."

سلطان اپنے فیصلوں میں کسی کی مداخلت نہیں برداشت کرتا تھا۔ وہ کرمانی کی ناگوار روش کو برداشت کر رہا تھا اور کوشش کر رہا تھا کہ یہ ناگواری چہرے سے ظاہر نہ ہو۔

سلطان اس کو اپنے خیمے میں لے گیا اور وہاں ایک طرف بیٹھتے ہوئے پوچھا "ہاں تو کیا بات ہے؟ تیرا چہرہ اترا ہوا کیوں ہے؟"

ابوعلی کرمانی نے پوچھا "وہ ہندو جو جنگ میں قید کر لیے گئے تھے، وہ آزاد کر دیے گئے؟"

سلطان نے جواب دیا "ہاں، میں نے انھیں آزاد کر دیا اور اپنی فوج میں ملازم رکھ لیا۔"

ابوعلی کرمانی نے اپنی رائے دی "لیکن سلطانِ معظم! میری ناچیز رائے میں تو ..."

سلطان نے اپنا ہاتھ اس طرح اٹھایا گویا اس کے ہونٹوں پر رکھ کے صاف صاف کہہ دے گا کہ اچھا تو اب تم اداس کیوں ہو؟

ابوعلی کرمانی نے شکایتاً کہا "آج سے پہلے سلطان مشورے لیا کرتے تھے لیکن اب معلوم نہیں کیوں؟ شاید میری کسی بات نے سلطان کے دل میں گرہ ڈال دی ہے۔"

سلطان نے وضاحت چاہی "ابوعلی کرمانی! جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کہو، مبہم انداز مت اختیار کرو۔"

ابوعلی کرمانی نے عرض کیا "جیسا کہ سلطان بخوبی جانتے ہیں کہ فوج میں ہمارے دشمن بھی داخل ہو رہے ہیں۔ کیا اس سے ہمیں نقصان نہیں پہنچ جائے گا؟"

سلطان نے جواب دیا "کسی سے مشورے لینے کا مطلب! میں ایک خود مختار حکمران ہوں۔ میں سب کچھ اپنی مرضی سے کر سکتا ہوں لیکن کبھی کبھی میں مشورے اس لیے لے لیتا ہوں کہ اس کا حکم رسول ﷺ نے دیا تھا۔ ورنہ میں اس کی خاص ضرورت نہیں محسوس کرتا۔"

ابوعلی کرمانی نے دبی زبان میں عرض کیا "میں تو بس یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کیا ہم اس قوم سے وفاداری کی امید رکھ سکتے ہیں جس کو ہمارے ہاتھوں شکست کی ذلتیں اٹھانا پڑی ہوں؟ کیا وہ ہمیں دھوکا نہیں دے سکتی؟"

سلطان نے جواب دیا "میں سب کچھ جانتے بوجھتے یہ تجربہ کروں گا اور میرا خیال ہے کہ مجھے شرمندگی نہیں اٹھانا پڑے گی۔"

ابوعلی کرمانی نے آہستہ سے کہا "خدا کرے ایسا ہی ہو۔ جس کی امید تو نہیں۔"

سلطان نے پیشانی پر بل ڈال لیے "بات اس طرح تو نہیں کی جاتی۔"

ابوعلی کرمانی خاموش ہو گیا۔

سلطان کہنے لگا "میں ہندوؤں کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں حق پر ہوں اور حق کی اس معرکہ آرائی میں اپنے ساتھ ہندوؤں کو بھی شامل کرنا چاہتا ہوں۔"

ابوعلی کرمانی کو ہندوؤں پر بالکل اعتبار نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ہندو کسی نہ کسی موقع پر دغا بازی سے ضرور کام لے گا۔ لیکن سلطان اپنے اتالیق کرمانی سے متفق نہیں تھا۔

سلطان، تربھون کی رہنمائی میں نگر کوٹ روانہ ہو گیا۔ عبداللہ طائی آنند پال کے تعاقب میں دو دن اور دو راتیں گزار چکا تھا۔ اس کو راستے میں کئی جگہ ہندوؤں سے جنگ کرنا پڑی تھی اور ان معرکہ آرائیوں میں دشمن کے سات آٹھ ہزار آدمی کام آ چکے تھے اور ان ہارنے والوں سے اس نے تیس ہاتھی اور بے شمار مال و دولت حاصل کیا تھا۔

سلطان دورانِ سفر عبداللہ طائی سے ملاقات کرنا چاہتا تھا۔ آخر ایک جگہ راستے میں ملاقات ہو گئی اور یہیں عبداللہ طائی نے سلطان کی خدمت میں تیس ہاتھی اور دوسرا قیمتی سامان بھی پیش کیا اور سلطان کو بتایا کہ آنند پال نگر کوٹ کے قلعہ بھیم میں چھپا ہوا ہے۔ یہ کوہستانی حدود میں واقع قلعہ عبداللہ طائی کے بس کا نہیں تھا۔ اس لیے وہ سلطان کی خدمت میں واپس آ گیا تھا۔

سلطان آگے بڑھتا چلا گیا اور آخر کار قلعہ بھیم کے سامنے پہنچ گیا۔ یہ قلعہ پہاڑی کی چوٹی پر تعمیر کیا گیا تھا اور کئی میل دور سے سیاہ دھبّے کی طرح نظر آنے لگتا تھا۔ سلطان اس پہاڑی پر چڑھتا چلا گیا اور عین قلعے کے سامنے پڑاؤ ڈال دیا۔ نگر کوٹ کے ہندو قلعے کی فصیل سے سلطان کی فوج کا نظارہ کر رہے تھے۔

تربھون نے سلطان سے پوچھا "آپ نگر کوٹ والوں سے کیا چاہتے ہیں؟"

سلطان نے جواب دیا "آنند پال کو۔ میں اس کے بغیر واپس نہیں جاؤں گا۔"

تربھون نے سلطان کو سمجھایا "سلطان جی! قلعہ بھیم کے مندر میں میرے علم کے مطابق اتنا مال موجود ہے کہ آپ اس کی موجودگی میں مال و زر سے بے نیاز ہو جائیں گے۔"

سلطان نے ازراہِ مذاق پوچھا "کیا تو کسی مندر میں پجاری بھی رہ چکا ہے کیونکہ تیری وضع قطع اور حلیہ پجاریوں ہی جیسا ہے؟"

تربھون نے جواب دیا "ہاں، میں پجاری بھی رہ چکا ہوں لیکن اب میں چھتریوں کے بیچ میں اٹھ بیٹھ سکتا ہوں۔ میں صرف برہمن بن کے نہیں جینا چاہتا۔ اب میں نے تلوار سنبھال لی ہے۔"

سلطان دور سے قلعے کی مضبوطی اور کمزوری کا اندازہ لگا رہا تھا۔

تربھون نے مزید عرض کیا "کیا یہ درست ہے کہ آپ لوگ جنگوں سے جو کچھ حاصل کرتے ہیں، وہ آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں؟"

سلطان نے جواب دیا "ہاں، ایسا بھی ہوتا ہے۔"

تربھون نے کہا "اگر یہ بات ہے تو میں اگلی جنگوں میں بھی حصہ لوں گا۔ میں اپنے گھر سے کمانے نکلا ہوں۔"

سلطان نے جواب دیا "تو اگر جنگوں میں حصہ لے گا تو اس کا معقول صلہ ملے گا۔ تو دوسرے ہندوؤں کو بھی میری ملازمت میں لا۔ میں ہندوؤں کی فوج بھی بھرتی کرنا چاہتا ہوں۔ میں عام ہندوؤں سے جنگ نہیں کرنا چاہتا۔ ہاں ان راجاؤں کو ہرگز معاف نہیں کروں گا جو میرے مقابلے میں آ چکے ہیں۔"

تربھون نے یہ وعدہ کر لیا کہ وہ دوسرے ہندوؤں کو بھی سلطان کی ملازمت میں لے آنے کی کوشش کرے گا۔ اس نے سلطان سے کہا "نگر کوٹ کے راجا سے جو بات کرنا ہو، آپ میرے ذریعے کر سکتے ہیں۔ میں قلعے میں راجا کے پاس جانے کے لیے تیار ہوں۔"

سلطان نے تربھون کے ذریعے قلعے میں یہ پیغام بھیج دیا کہ "اگر تو میرے غضب سے بچنا چاہتا ہے تو آنند پال کو میرے حوالے کر دے۔ ورنہ میں قلعے میں زبردستی داخل ہو کے آنند پال کو برآمد کر لوں گا۔"

تربھون نے اپنے ساتھ چار ہندو ساتھیوں کو لیا اور قلعے کے در پر پہنچ گیا۔ دربانوں اور پہرے داروں نے چند ہندوؤں کو اپنی طرف آتے دیکھا تو انھیں شبہ گزرا کہ شاید یہ مسلمان ہیں جو ہندوؤں کے بھیس میں قلعے میں داخل ہونا چاہتے ہیں۔ انھوں نے تربھون اور اس کے ساتھیوں کو اندر نہیں آنے دیا۔

تربھون نے اپنا تعارف کرایا اور کہا "اگر مہاراج آنند پال جی اندر موجود ہیں تو ان سے کہو کہ ان کا دوست تربھون ایک نہایت ضروری سے کام آیا ہے اور آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہے، اندر آنے کی اجازت دی جائے۔"

تربھون کا یہ پیغام اندر پہنچا دیا گیا۔ آنند پال بدحواس بھاگنے کی فکر میں تھا لیکن جب اس کو تربھون کے بارے میں بتایا گیا تو اس نے تربھون اور اس کے ساتھیوں کو فوراً اندر بلوا لیا۔

تربھون پہلی نظر میں آنند پال کو پہچان نہیں سکا۔ محمود کے خوف اور ملک چھن جانے کے غم نے اس کی صحت کو برباد کر دیا تھا۔ اب وہ تربھون کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اس کو سلطان نے قید کیوں نہیں کر لیا۔

نگر کوٹ کا راجا بھی بہت پریشان تھا۔ اس نے بھی تربھون اور اس کے ساتھیوں کو ذرا حیرت اور خوف کے ملے جلے جذبوں سے دیکھا۔

آنند پال نے پوچھا "تربھون! تیرے بارے میں تو یہ معلوم ہوا تھا کہ تو قید کر لیا گیا۔ اب اس وقت اس حال میں کہ سلطان اپنی فوج کے ساتھ قلعے کے سامنے موجود ہے اور تو اپنے ساتھیوں کو لیے ہوئے یہاں قلعے میں چلا آیا۔ یہ معاملہ کیا ہے؟"

تربھون مسکرایا "معاملہ بالکل سیدھا سادہ ہے۔ سلطان نے ہمیں قید کر لیا تھا لیکن اب میں سلطان کا قیدی نہیں اس کا ملازم، اس کا خدمت گار ہوں۔"

آنند پال نے پوچھا "وہ کس طرح؟"

تربھون نے سب کچھ صاف صاف بتا دیا اور کہا "اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہمارا فائدہ کس میں ہے؟ سلطان، ہندوؤں

کو اپنی فوج میں ملازمتیں دینے پر آمادہ ہے۔ آنند پال جی! اگر آپ چاہیں تو سلطان سے رابطہ قائم کریں اور اِدھر اُدھر بھاگنے اور منہ چھپانے سے فائدہ کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔"

نگر کوٹ کے راجا نے پوچھا "یہ سلطان، ہندوؤں کی فوج کیوں تیار کر رہا ہے؟"

تربھون نے سلطان کی بات چیت کا سارا حال بیان کر دیا اور کہا "سلطان نے ہمیں بطورِ خاص یہ بتایا کہ اس کا عام ہندو سے کوئی جھگڑا نہیں مگر وہ ان راجاؤں کو ہرگز معاف نہیں کرے گا جو اس پر حملہ آور ہوئے تھے۔"

آنند پال اور نگر کوٹ کے راجا نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ نگر کوٹ کے راجا نے پوچھا "وہ یہاں کیا لینے آیا ہے؟"

تربھون نے جواب دیا "راجا آنند پال سے ملاقات کرنے۔"

آنند پال نے پوچھا "ملاقات کرنے یا گرفتار کرنے؟"

تربھون نے جواب دیا "مہاراج! میں نے سلطان میں غیر معمولی شرافت محسوس کی ہے۔ اس شرافت کا آپ کو بھی تجربہ ہے پھر آپ بات خراب کیوں کر رہے ہیں۔ جائیے، ہمت کر کے سلطان سے ملیے، معذرت کیجیے اور تعلقات دوبارہ قائم کر لیجیے۔"

نگر کوٹ کا راجا تربھون کو شک و شبہے کی نظروں سے دیکھنے لگا "آنند پال جی کی گرفتاری پر تجھ کو کتنا انعام ملے گا؟"

تربھون کی پیشانی پر بل پڑ گئے "یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ آپ دونوں ہیں کس ہوا میں؟ سلطان کی فوج قلعے کے باہر پڑاؤ ڈالے پڑی ہے۔ سلطان جب چاہے گا قلعے کو سر کر لے گا۔ میں تو یہاں اس لیے چلا آیا تھا کہ دونوں کو مفید مشورے دے کر سلطان سے ہاتھ مِلوا دوں۔ مگر آپ دونوں شاید ایسا نہیں چاہتے۔"

آنند پال نے کہا "سلطان کتنا ہی شریف کیوں نہ ہو مگر اس بار شاید وہ ہمیں نہ معاف کرے۔"

تربھون نے آخری بات کی "آپ دونوں سلطان کی فوج میں ملازمت کے لیے ہندوؤں کو بھیج دیں، سلطان خوش ہو جائے گا اور آپ دونوں کے اس سے تعلقات خوشگوار ہو جائیں گے۔"

آنند پال کی ہچکچاہٹ میں کوئی کمی نہ آئی، بولا "یہ باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہیں۔"

نگر کوٹ کے راجا نے بھی آنند پال کی تائید کی "میرا بھی یہی خیال ہے۔ رہ گیا یہ کہ سلطان اس قلعے کو سر کر لے گا تو یہ تیری اور سلطان کی خوش فہمی ہوگی۔"

تربھون نے منہ بنایا "میں برہمن ہوں اس لیے آپ دونوں کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ اب میں واپس جا رہا ہوں۔ آپ کا یہ قلعہ پہاڑی پر واقع ہے اور اس کی موٹی موٹی پتھریلی دیواریں، بلند و بالا بام و در، آپ کی فوج اور پہرے دار۔ ان کی حیثیت آپ کے حوصلوں سے زیادہ نہیں ہے۔ میری بات نہ مان کر آپ دونوں اپنی زندگی کی بدترین غلطی کر رہے ہیں۔"

تربھون یہ کہہ کر چلا آیا۔ اس کے ہٹتے ہی نگر کوٹ کے راجا نے آنند پال سے کہا "جنابِ والا۔ آپ تو قلعے کے شرقی دروازے سے نکل جائیں۔ میں سلطان کا مقابلہ کروں گا۔"

آنند پال پوربی دروازے سے نکل کر کشمیر چلا گیا کیونکہ سلطان اُدھر کا رخ نہیں کر سکتا تھا۔

نگر کوٹ کے راجا نے فصیلوں پر پہرہ سخت کر دیا۔

تربھون منہ لٹکائے سلطان کے سامنے پہنچا تو سلطان نے اس سے یہ نہیں پوچھا کہ کیا ہوا؟

تربھون آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا "یہ راجا لوگ سوچتے کس طرح ہیں؟ بات اس وقت سمجھیں گے جب پانی سر سے اونچا ہو جائے گا۔"

سلطان نے جواب دیا "اللہ نے چاہا تو یہ دونوں بہت جلد میری باتیں سمجھنے لگیں گے۔"

قلعے کی فصیل پر راجا کے سپاہیوں کا ہجوم اِدھر اُدھر رواں دواں تھا۔

تربھون، راجا کے خلاف دیواروں پر لکھوا رہا تھا آنند پال کے خلاف، راجا نگر کوٹ کے خلاف۔ اس نے سلطان کو یہ بات بھی بتائی کہ "یہاں کے مندر میں ایسی دولت موجود ہے جس کی شاہانِ عالم تمنا کرتے ہیں کہ اے کاش یہ چیزیں..."

وہ باتیں کرتے کرتے خاموش ہو گیا۔ سلطان نے کہا۔ "ہاں تو بات کیا ہے؟ کچھ مجھے بھی تو معلوم ہو، تو مندر کے خزانے کا ذکر کر رہا تھا۔"

تربھون نے عرض کیا "میں برہمن ہوں، میں ہندو ہوں، اور میں جانتا ہوں کہ ایک مندر کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ وہاں جو کچھ ہے آپ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔"

سلطان نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا "دن کے اُجالے اور رات کے اندھیرے میں، بس ہر حال میں تم سب کے دل و دماغ میں یہی ایک بات رہنا چاہیے کہ ہمیں اس قلعے میں داخل ہونا ہے۔"

سلطان کی فوج قلعے کی مضبوطی اور اس کے محلِ وقوع سے سوچ رہی تھی کہ اس کی تسخیر آسان نہیں ہے لیکن سلطان اس کی فتح کا ارادہ کر چکا تھا اس لیے اس کو ہر حال میں فتح ہونا تھا۔

دوسری طرف راجا نگر کوٹ کی مختصر فوج خوف اور انتشار کا شکار تھی۔ اس کو کسی طرح یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ کوئی تربھون نامی برہمن، راجا اور سلطان میں مفاہمت کرانے آیا تھا لیکن راجا آنند پال اور راجا نگر کوٹ نے اسے بے نیل و مرام واپس کر دیا۔ قلعہ بھیم کے سپاہی جنگ نہیں چاہتے تھے، انھیں دونوں راجاؤں پر غصہ تھا کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا؟

قلعے کے سیناپتی نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا۔ "غزنی کا وہ بادشاہ، جس کا دیس کے پچّیس تیس راجے مہاراجے مقابلہ نہیں کر سکے، کیا ہم اس کا مقابلہ کر لیں گے؟"

سپاہیوں کے ہوش جاتے رہے کئی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں "نہیں، ہرگز نہیں۔"

سیناپتی نے کہا "سلطان کی فوجیں اِدھر کیوں آئی ہیں۔ کچھ پتا ہے؟"

جواب ملا "نہیں، بالکل نہیں۔ ہمیں نہیں معلوم۔"

سیناپتی نے کہا "لیکن میں جانتا ہوں، اس کا جواب میرے پاس ہے۔"

سپاہی گوش بر آواز تھے۔ وہ سیناپتی سے سلطان کی اِدھر آمد کا سبب جاننا چاہتے تھے۔

سیناپتی نے جواب دیا "سلطان کا اصل جھگڑا آنند پال اور پروہتوں پنڈتوں سے ہے۔ آنند پال کا تعاقب کرتے ہوئے سلطان اِدھر آ گیا اور یہاں پہنچ کے اس کو معلوم ہوا کہ نگر کوٹ کا یہ قلعہ بتوں کا مسکن ہے اور بہت سارے پروہت اور پنڈت اس قلعے میں موجود ہیں چنانچہ سلطان ان دونوں کو سبق سکھانے یہاں آ گیا۔ اب آپ لوگ بتائیں کہ ہم کیا کریں؟"

ایک جراُت مند سپاہی کھڑا ہو گیا اور مشورہ دیا "قلعے کا دروازہ اس شرط پر کھول دیا جائے کہ سلطان ہمیں نقصان نہیں پہنچائے گا۔"

اس تجویز نے سپاہیوں میں ہلچل مچا دی۔ کسی دوسرے سپاہی نے حیرت سے کہا "قلعے کا دروازہ کھول دیا جائے۔ لیکن سلطان ہمیں معاف کیوں کرے گا؟"

مجوّز نے جواب دیا "اگر آپ لوگ پسند کریں تو میں سلطان سے بات کر لوں جا کر، میرا خیال ہے سلطان مان جائے گا۔"

سیناپتی نے آہستہ سے کہا "سلطان تو مان جائے گا لیکن اپنا راجا ناراض ہو جائے گا۔"

کسی سپاہی نے جواب دیا "اپنے راجا کی ناراضگی کا ہم پر کیا اثر پڑے گا۔"

سیناپتی نے کہا "اس کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ آنند پال، جس کے تعاقب میں سلطان یہاں تک آیا ہے، اپنے راجا نے اس کو بھگا دیا۔ اب وہ یہاں قلعے میں نہیں ہے۔ راجا کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

فوج ذرا سی دیر میں نگر کوٹ کے راجا کے خلاف ہو گئی اور ہر طرف سے یہی آواز بلند ہونے لگی "سلطان سے مت لڑو، قلعے کا دروازہ کھول دو، سلطان کو اندر آنے دو۔"

قلعے کے جس حصّے میں یہ شورش برپا تھی، وہاں سے راجا کا محل زیادہ دور نہیں تھا، شور و غل کی آوازیں محل تک پہنچ گئیں۔ راجا سمجھا کہ شاید سلطانی فوج اندر داخل ہو گئی۔ وہ باہر نکلا اور بھاگتا ہوا سپاہیوں میں پہنچ گیا۔ انھوں نے اپنے راجا کو اپنے درمیان دیکھا تو خاموش ہو گئے۔

راجا ننگے پاؤں بھاگ کے آیا تھا، اس نے سیناپتی سے پوچھا "یہ شور و غل کیسا تھا؟"

سیناپتی نے کہا "ہم لوگ صلاح مشورے کر رہے تھے کہ ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

راجا نے پوچھا "پھر کیا طے پایا؟"

جس سپاہی نے دروازہ کھول دینے کا مشورہ دیا تھا، وہ پھر کھڑا ہو گیا اور راجا سے کہا "پھر ہم سب نے یہ طے کر لیا کہ قلعے کا دروازہ کھول دیا جائے اور سلطانی سپاہ کا آگے بڑھ کے استقبال کیا جائے۔"

راجا پریشان ہو گیا۔ گھبرا کے پوچھا "یہ کیا بات ہوئی؟ یہ تو کبھی نہیں ہوگا اور دیکھ اے شخص، ایسا کبھی نہیں ہوگا۔"

مجوّز نے جواب دیا "مہاراج! غلطیاں آپ لوگ کریں اور ان کی سزا ہم بھگتیں۔ ایسا نہیں ہوگا۔"

راجا ان سب میں بے تکلفی سے بیٹھ گیا۔ پوچھا "ہم نے غلطیاں کیں؟ کون سی غلطیاں؟"

مجوّز نے جواب دیا "آپ نے فوج سے مشورہ کیے بغیر راجا آنند پال کو مہمان بنا لیا اور پھر چپ چاپ اس کو نکال بھی دیا، آپ کو ایسا نہیں کرنا تھا۔"

راجا نے پوچھا "اور کچھ؟"

اس سپاہی نے جواب دیا "مذہبی پیشواؤں اور پروہتوں نے دیس اور دھرم کے نام پر آپ کو ورغلایا اور آپ سلطان سے جنگ کرنے پہنچ گئے۔"

راجا نے غصّے میں سیناپتی کی طرف دیکھا "تو کیسا سیناپتی ہے کہ ایک سپاہی تیرے قابو میں نہیں، میں یہاں کا راجا ہوں اور یہ معمولی سپاہی تیری موجودگی میں مجھ سے زیادتی کر رہا ہے۔"

سیناپتی نے راجا سے نظریں نہیں ملائیں اور جواب دیا۔ "مہاراج! ہمارے پاس اتنی فوج نہیں ہے کہ ہم سلطان کا مقابلہ کر سکیں۔"

راجا نے سیناپتی کو ڈانٹنا شروع کر دیا "تو تُو یہ کیوں نہیں کہتا کہ تو بھی غداری پر مائل ہے"۔

سیناپتی نے جواب دیا "اس کو غداری نہیں کہتے۔ میں سلطان کے پاس اپنے چند آدمی بھیج رہا ہوں، یہ آدمی سلطان سے امان طلب کریں گے اور جب سلطان امن وسلامتی کا وعدہ کرے گا تو ہم دروازہ کھول دیں گے"۔

راجا نے غصے میں کہا "میں نے تجھ کو معطل کیا۔ اب تو میری فوج کا سیناپتی نہیں رہا۔ میں نے تجھ کو اس منصب سے الگ کر دیا"۔

سیناپتی اکڑ کے کھڑا ہو گیا "مہاراج! اب ایسی غلطی نہ کریں۔ کیونکہ اب آپ کے پاس کچھ بھی نہیں۔ بس نام کے راجا رہ گئے ہیں آپ؟"

راجا نے ایک تنومند سپاہی کو اپنے قریب بلایا اور اس کو سیناپتی بنا دیا "آج سے تو ہے سیناپتی، اور میں تجھ کو حکم دیتا ہوں کہ اس غدار سیناپتی کو گرفتار کر لے۔ میں اس پر مقدمہ چلاؤں گا"۔

لیکن تنومند سپاہی اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں۔

راجا نے کہا "میں نے تجھ کو سیناپتی بنا دیا اور تو خاموش کھڑا کچھ سوچ رہا ہے؟"

اس شخص نے جواب دیا "مہاراج! میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اس فضول اور بے فائدہ منصب سے ہمیں فائدہ کیا پہنچے گا، سلطانی فوج ہم سے ہتھیار تو ڈلوا ہی لے گی پھر یہ ذلت آمیز کام میں کیوں انجام دوں۔ آپ یہ منصب کسی اور کے حوالے کر دیں"۔

راجا پریشان اور بدحواس ایک ایک کی شکل دیکھ رہا تھا۔

سیناپتی نے کہا "مہاراج! آپ راج بھون چلے جائیں اور آرام کریں، ہمیں جو کچھ کرنا ہے سوچ سمجھ کے اور مشورے کر کے کریں گے اور بھگوان نے چاہا تو اس سے آپ کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچے گا"۔

راجا کو اپنی بے عزتی زمین میں دھنسائے دے رہی تھی۔ دل شکستہ لہجے میں پوچھا "تو تم سب ایک ہو چکے ہو میرے ساتھ کوئی نہیں؟"

سیناپتی نے جواب دیا "مہاراج! ہم جو کچھ کریں گے، اس سے کسی کو بھی نقصان نہیں پہنچے گا۔ آپ نے پجاریوں، پروہتوں کے کہنے میں آ کے بڑے نقصان اٹھائے ہیں، یہ سلطان غزنی بھی انھی پجاریوں، پروہتوں کا لایا ہوا یہاں تک آ گیا ہے۔ اب ہم سلطان سے مفاہمت کریں گے اور سلطان کو یہاں سے عزت واحترام کے ساتھ واپس کر دیں گے"۔

راجا کی پریشانی اس کے چہرے سے عیاں تھی، کہنے لگا "تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ نگرکوٹ گیا اپنے ہاتھ سے"۔

سیناپتی نے جواب دیا "ایسا نہیں ہوگا۔ سلطان نے ہمارے دیس کے کسی شہر پر بھی خود سے حملہ کبھی بھی نہیں کیا، جب اس پر حملہ کیا گیا، اس سے چھیڑ چھاڑ کی گئی تو اس نے جوابی کارروائی کی اور ہمارا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آ گیا"۔

راجا لاجواب ہو گیا۔ وہ اپنے راج بھون واپس چلا گیا۔

سلطان محمود نگرکوٹ کے قلعے کا محاصرہ تنگ کرتا چلا گیا، قلعے کی فصیل کے سپاہی نیچے اُتر آئے اور سیناپتی نے قلعے کا دروازہ کھول دیا۔ اس نے سلطان کو پیغام بھیجا کہ وہ صلح اور مفاہمت کی بات کرنا چاہتا ہے۔

سلطان نے تربھون اور اس کے ساتھیوں کو اپنے ساتھ رکھا اور سیناپتی کو مطلع کیا کہ صلح اور مفاہمت کی بات کرنے میں کوئی ہرج نہیں لیکن ہمیں جو پریشان کیا گیا ہے اور غزنی سے نکل کر یہاں تک آنے میں جو نقصان اور پریشانی اٹھانا پڑی ہے اس کا حساب کتاب کیونکر ہوگا؟"

سیناپتی نے تربھون کو وسیلہ بنایا "تربھون! تو ہندو ہے اور برہمن بھی۔ کیا تو ہماری سفارش نہیں کرے گا؟"

تربھون پہلے ہی سے بیزار تھا "میں نے تو کوشش کی تھی کہ یہاں خون خرابہ نہ ہو لیکن تیرے راجا نے ناعاقبت اندیشی سے کام لیا اور مفاہمت سے انکار کر دیا۔ اگر وہ آنند پال کو پناہ نہ دیتا اور اگر پناہ دی تھی تو اسے سلطان کی خدمت میں پیش کر دیتا۔ اس نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ سلطان کو ناراض کر دیا، اب میں کیا کر سکتا ہوں"۔

لیکن جب سیناپتی اور اس کے ساتھیوں کو سلطان کی خدمت میں پیش کیا گیا تو سلطان نے حیرت انگیز طور پر نرم رویّہ اختیار کیا۔ سلطان نے سیناپتی سے کہا "اب یہاں قلعے کے باہر کوئی بات نہ ہوگی۔ میں اپنی فوج کے ساتھ قلعے میں چلتا ہوں، اب جو بات بھی ہوگی قلعے میں ہوگی"۔

سیناپتی نے جواب دیا "قلعے کا دروازہ کھل چکا ہے، آپ اندر تشریف لے چلیں"۔

سلطان اپنی فوج کے ساتھ قلعے میں داخل ہو گیا۔ وہاں ایک کھلی جگہ میں سلطان کی فوج نے قیام کیا۔ راجا راج بھون کی چھت سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس کی خوف سے چیخ نکل گئی اور نیچے اُتر کے رانیوں سے کہنے لگا "مجھے میرے

سپاہیوں نے برباد کر دیا۔"

رانیاں بھی خوفزدہ ہوگئیں، ہراسانی سے پوچھا "اب کیا ہوگا؟"

راجا آنسوؤں سے رو رہا تھا۔ کہنے لگا "پتا نہیں کیا ہوگا؟ لیکن راج پاٹ کا چھن جانا یقینی ہے۔"

اس وقت سلطان اپنے کئی سرداروں کے ساتھ راج بھون کے در پر دستک دے رہا تھا، سیناپتی اور تربھون فدویانہ انداز میں سلطان کے ساتھ تھے۔

راج بھون کے دربانوں نے راجا کو مطلع کیا "مہاراج! مسلمانوں کا بادشاہ اندر آنا چاہتا ہے۔"

راجا نے بے بسی سے جواب دیا "اگر وہ اندر آنا چاہتا ہے تو کیا اسے روکا جاسکتا ہے۔"

ایک دربان نے جواب دیا "نہیں۔ اس کو کون روک سکتا ہے؟"

راجا نے کہا "پھر یہ جھجک کیوں۔ دروازہ کھول دو اور سلطان کا خوش دلی سے سواگت کرو۔"

دربان سمجھے راجا اُن پر طنز کر رہا ہے، پھر پوچھا "آپ کیا حکم دے رہے ہیں؟"

راجا نے جواب دیا "دروازہ کھول دو، دیر کرو گے تو کوئی نئی مصیبت اٹھ کھڑی ہوگی۔"

دربانوں نے دروازہ کھول دیا۔ سلطان اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اندر داخل ہوا تو دیکھا، ایک ننگ دھڑنگ انسان ان کے سامنے کھڑا ہے۔ بس جسم پر ایک دھوتی تھی جو کمر کے گرد لپٹی ہوئی تھی اور اس کا نصف حصّہ کاندھے پر پڑا تھا۔ گلے میں سچے موتیوں کی چار لڑی مالا تھی اور کانوں میں قیمتی آویزے لٹک رہے تھے۔ یہ نگر کوٹ کا راجا تھا۔ سلطان نے اس عجیب ہیئت کذائی میں راجا کو دیکھا تو ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔

سیناپتی نے آگے بڑھ کے راجا کا تعارف کرایا۔

"سلطانِ محترم! یہ ہمارے مہاراج ہیں۔"

سلطان نے راجا پر ایک سرسری نظر ڈالی اور پوچھا۔ "آنند پال کہاں ہے؟"

راجا بہت خوفزدہ تھا، جواب دیا "آنند پال، اس قلعے میں نہیں ہے۔"

سلطان نے درشت لہجہ اختیار کیا "لیکن جب ہم یہاں آئے تھے آنند پال تیرے قلعے میں موجود تھا۔"

راجا، سلطان کو جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ جواب دیا "بیشک، آنند پال اس وقت یہاں موجود تھا لیکن پھر وہ جان کے خوف سے کشمیر کی پہاڑیوں میں روپوش ہوگیا۔"

سلطان نے حکم دیا "اس کو واپس بُلا۔"

راجا نے خوشامد شروع کر دی "سلطانِ محترم! میں اپنی غلطی مانتا ہوں اور اس کی معافی چاہتا ہوں۔"

سیناپتی کو اپنے راجا پر غصّہ آ رہا تھا۔ اس نے راجا کو اشاروں سے سمجھایا کہ پہلے سلطان کو عزت آبرو سے بٹھاؤ تو سہی، بعد میں باتیں کرنا۔

اب راجا نے خوش اخلاقی کی اداکاری شروع کر دی اور اس کو اپنے ساتھ ایک دیوان نما وسیع کمرے میں لے گیا۔ یہاں سلطان اور اس کے ساتھیوں کو بٹھایا گیا، راجا کے پاس اس کا سیناپتی بیٹھ گیا۔ سلطان کے پاس تربھون، ابوعلی کرمانی اور ارسلان جاذب بیٹھ گئے۔

راجا نے سلطان سے پوچھا "آپ کچھ کھانا پینا پسند کریں گے؟"

سلطان نے جواب دیا "تم لوگوں کے بقول ہم ناپاک، ملیچھ لوگ اگر کچھ کھالیں گے تو تم بھی ناپاک ہو جاؤ گے اس لیے اس کی تکلیف نہ کی جائے۔"

سیناپتی نے راجا کی طرف سے صفائی پیش کی "جنابِ والا! ایسی بات نہیں ہے ہمارے پنڈت اور پروہت ہمارے دلوں میں نفرت اور تعصب کے بیج بوتے رہے ہیں مگر اب ہم نے ان کو مسترد کر دیا ہے۔"

لیکن راجا کے چہرے کا اتار چڑھاؤ بتا رہا تھا کہ وہ سیناپتی کی باتوں سے متفق نہیں ہے۔

سلطان نے راجا کو خبردار کیا "میں یہاں آرام کرنے نہیں آیا۔ اپنے پنڈتوں اور پروہتوں کو میرے پاس لاؤ۔ میں ان کی موجودگی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

راجا بے بس تھا۔ وہ سلطان کے حکم کی تعمیل پر مجبور تھا۔ اس نے پنڈتوں اور پروہتوں کو اپنے راج بھون میں طلب کر لیا۔

اس دوران سلطان، راجا سے باتیں کرتا رہا۔ اس نے راجا کو بتایا "میں تیرے راج پاٹ میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا لیکن یہ بھی نہیں چاہتا کہ تو آئندہ پشاور یا غزنی کے بارے میں سوچے، تو جہاں ہے وہیں ٹھیک ہے۔ شہروں اور ملکوں پر چڑھائی اور تسخیر آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لیے عیش و عشرت سے کنارہ کشی اختیار کرنا پڑتی ہے۔ گھوڑے کی پشت پر نرم اور آرام دہ بستروں کو قربان کر دینا پڑتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ یہ کام حکمران اور فاتح اپنی فوج اور ساتھیوں کی مدد سے تنہا انجام دیتے ہیں، بہت سارے راجاؤں اور غیر منظم سپاہیوں کی مدد سے یہ کام نہیں ہو سکتا۔"

راجا نے عرض کیا "میں سلطان کی بات سمجھ رہا ہوں لیکن ہمیں تو پنڈتوں اور پروہتوں نے پشاور پہنچا دیا تھا۔"

تربھون نے کہا "میں نے یہی بات آنند پال اور مہاراج کو سمجھانا چاہی تھی۔"

ابوعلی کرمانی نے کہا "یہ لوگ بار بار غلطیوں کا اعادہ کرتے ہیں اور شرمندگی اٹھاتے ہیں۔"

سلطان نے راجا کے سامنے اپنی تجویز پیش کی "میں اب تم لوگوں سے دوستی کرنا چاہتا ہوں اور اپنی فوج میں ہندوؤں کو بھی بھرتی کروں گا، ان کو اپنے شہر غزنی لے جاؤں گا، ان کو وہاں آباد کروں گا۔ اس طرح آنند پال اور اس جیسے کئی راجاؤں کی یہ خواہش بھی پوری ہو جائے گی کہ ان کی رسائی غزنی تک ہو جائے۔"

راجا نے عرض کیا "یہ جو کچھ ہو گیا، آئندہ نہیں ہوگا۔ اب ہماری فوجیں پشاور نہیں جائیں گی۔"

سلطان نے جواب دیا "اب ایسا اس لیے بھی نہیں ہوگا کہ میں اپنی سرحدوں کی حد بندی بدل دوں گا اور ان راجگانِ ہند سے ملاقات کرنے خود ان کے شہروں اور راج دھانیوں میں جاؤں گا جو مجھ سے ملاقات کرنے پشاور پہنچ گئے تھے اور مجھ سے ملے بغیر ہی واپس آ گئے تھے۔ میں نگر کوٹ اسی سلسلے میں آیا ہوں۔ یہ میرے منصوبے کی ابتدا ہے۔"

راجا کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا "سلطان کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے اور ہم اس کا تاوان ادا کرنے کو تیار ہیں۔ اپنے حصّے کا تاوان۔"

سلطان راج بھون میں جتنی دیر موجود رہا، راجا کو آئینِ جہانبانی اور تسخیر و حکمرانی کے فراخ دلانہ انداز اور طریق کار کی باتیں بتاتا رہا۔

تربھون نے سلطان کو بڑے کام کی بات بتائی "حضورِ والا! پنڈت اور پروہت آنے والے ہیں۔ آپ ان سے جو بھی بات کریں اس میں یہ خیال رکھیں کہ وہ بہت دولت مند لوگ ہیں، یہ راجا ان کے مقابلے میں ایک غریب انسان ہے۔"

سلطان کو بڑی حیرت ہوئی پوچھا "پنڈت اور پروہت، راجا سے زیادہ دولت مند ہیں، وہ کس طرح؟"

سیناپتی نے سوچا کہ تربھون جو بات بتانے والا ہے اس سے تربھون، سلطان کا زیادہ اعتماد حاصل کر لے گا۔ اس لیے وہ درمیان میں بول اٹھا "ہاں پنڈت اور پروہت ہمارے مہاراج سے زیادہ دولت مند ہیں۔ ان کے مندر میں جو خزانہ اور دولت پائی جاتی ہے، وہ مہاراج کے خزانے میں بھی نہیں ملے گی۔"

تربھون کھسیا گیا کہ سیناپتی بازی لے گیا تھا۔

جب پنڈت اور پروہت راج بھون میں سلطان کے سامنے پیش کیے گئے تو سلطان نے ان عجیب غریب حلیے والوں کو بہت غور سے دیکھا اُن کی پیشانیوں پر قشقہ کا نشان سلطان کے لیے نئی چیز تھا۔

پنڈتوں اور پروہتوں نے سلطان کو اپنے سامنے اور قریب دیکھ کر بڑی دہشت اور خوف محسوس کیا یہی وہ ذات تھی جس نے پورے ہندوستان اور ہندو دھرم کو لرزہ براندام کر رکھا تھا۔ اس کے خلاف پجاریوں اور پروہتوں نے ملک بھر کے راجاؤں کو اکٹھا کر کے جنگ پر اُکسایا تھا — ان میں سے ایک میں بھی اتنی ہمت نہیں تھی کہ سلطان سے آنکھیں ملا سکتا۔

سلطان نے پنڈتوں اور پروہتوں کو مخاطب کیا "تم دین دار لوگوں کے ننگے جسم کو دیکھنے کے بعد میں سوچ رہا ہوں کہ آخر وہ کیا چیز ہے جو تمھیں میرے خلاف بے چین اور سرگرداں رکھتی ہے۔ بظاہر تم دنیا میں ملوّث بھی نہیں نظر آتے، تمھارے جسم پورے لباس تک سے محروم ہیں۔ میں نے تمھارے دین میں بھی مداخلت نہیں کی۔ میں نے تمھارے ملک پر حملہ بھی نہیں کیا پھر وہ کیا چیز تھی جو ہمیشہ تمھیں میرے خلاف کرتی رہی؟"

پنڈتوں اور پروہتوں کے پاس ان سوالات کا کوئی جواب نہ تھا۔

سیناپتی نے پنڈتوں اور پروہتوں سے کہا "سلطان بہت رحم دل اور انصاف پرور ہیں۔ آگے بڑھو اور سلطان سے معذرت کر لو۔"

تربھون کو سیناپتی کی باتیں گراں گزر رہی تھیں۔ اس نے سلطان کو مشورہ دیا "کیا آپ اِن مُفسدوں کو معاف کر دیں گے؟ آپ ان کے ساتھ مندر چلیں، وہاں بڑی دولت چھپی ہوئی ہے یہ دولت اور ہیرے جواہر برسوں اور سالوں سے یہاں جمع ہو رہے ہیں، آخر ان کا کوئی مَصرف بھی تو ہونا چاہیے۔"

سلطان نے مذہبی پیشواؤں سے کہا "میں تمھارے ساتھ مندر چلوں گا اور جس دولت کا یہ ذکر کر رہے ہیں، میں بھی دیکھوں گا۔"

ایک پجاری نے خوشامدانہ لہجے میں پوچھا "کیا آپ ہمارے مندر میں چلیں گے؟"

سلطان نے جواب دیا "ہاں میں تمھارے مندر میں وہ دولت اور ہیرے جواہر دیکھنا چاہتا ہوں جس کا لوگوں کی زبانوں پر بہت ذکر رہتا ہے۔"

ایک پروہت نے کہا "لیکن ہم ایک مسلمان کو مندر میں

کس طرح لے جائیں گے، ہندو قوم تو ہماری جان کو آجائے گی۔ وہ ہمیں بھی مندر سے نکال باہر کریں گے۔ آپ ابھی ان سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں۔"

سلطان نے درشت لہجہ اختیار کیا اور ڈانٹ کر حکم دیا۔ "تم سب میرے ساتھ چلو گے، اگر بھاگنے کی کوشش کرو گے تو مار دیے جاؤ گے۔"

سلطان نے ان سب کو اپنے ساتھ لیا اور مندر روانہ ہوگیا۔ پجاری اور پروہت خوف سے تھر تھر کانپ رہے تھے۔

راجا سلطان کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ سیناپتی، تربھون، ابوعلی کرمانی اور ارسلان جاذب پجاریوں اور پروہتوں کو اپنے حصار میں لیے سلطان کے پیچھے چل رہے تھے۔ راجا کے چند خدمت گار آگے آگے جا رہے تھے۔

نگر کوٹ کا یہ مندر مجمع الاصنام تھا، مندر کے دروازے پر سلطان ٹھہر گیا، مندر مخروطی شکل میں ایک بلند و بالا اونچے چبوترے پر تعمیر کیا گیا تھا، اس کی دیواریں بے شمار مورتیوں سے آراستہ تھیں اور مندر کی چوٹی پر سنہرا کلس سورج کی شعاعوں سے نظروں میں چکاچوند پیدا کر رہا تھا۔

ابوعلی کرمانی اور ارسلان جاذب کا خیال تھا کہ پجاریوں اور پروہتوں کو سلطان کے مندر میں داخلے پر اعتراض ہوگا لیکن تربھون اور سیناپتی نے آگے بڑھ کے مندر کا دروازہ کھول دیا۔ پجاری اور پروہت خاموش رہے۔ سلطان مندر میں داخل ہوگیا۔ یہاں مندر کے بیچ میں گوتم بدھ کی وہ مورتی رکھی ہوئی تھی جس کو ہندوؤں نے وشنو کا اوتار مان کے پوجا شروع کر دی تھی۔ مندر کے چاروں کونوں میں شنکر، سنیچر، راہو اور کیتو کی مورتیاں رکھی تھیں۔

سلطان کے لیے ایک مونڈھا ڈال دیا گیا، وہ اس پر بیٹھ گیا اور سیناپتی اور تربھون کو حکم دیا کہ مندر میں چھپے ہوئے خزانے کو نکلوا کے یہاں ڈھیر کر دیا جائے۔

پجاریوں اور پروہتوں کو ذرا سا تامل ہوا، راجا ڈرا ہوا تھا اور وہ دل سے یہی چاہتا تھا کہ سلطان کے حکم کی تعمیل ہونا چاہیے۔

سلطان کی تیوریوں پر بل پڑ گئے، اس نے کسی خاص شخص کو مخاطب کیے بغیر کہا "میں دوبارہ حکم دینے کا عادی نہیں۔ میں چاہتا تھا کہ اس مندر میں مسلمان سپاہی نہ داخل ہوں، لیکن اگر میرے حکم کی تعمیل نہ ہوئی تو میں اپنے سپاہیوں کو اندر بلا لوں گا اور وہ خود ہی خزانہ ڈھونڈ نکالیں گے۔"

راجا نے پجاریوں سے کہا "اب دیر نہ کرو، سلطان کے مزاج اور دبدبے کا تمھیں علم نہیں شاید۔"

پجاریوں اور پروہتوں نے لاعلمی کا اظہار کیا "یہ سلطان کس خزانے کی بات کر رہے ہیں؟ کہاں ہے وہ خزانہ؟ ہمیں تو اس کا علم نہیں۔"

سلطان نے تربھون اور سیناپتی کی طرف دیکھا اور کہا "تم دونوں ان کو جواب دے سکتے ہو۔"

تربھون نے پجاریوں سے کہا "پنڈتو! بات کو طول نہ دو۔ حالانکہ میں چاہوں تو مذکورہ خزانہ برآمد کر دوں۔"

سیناپتی گوتم کی مورتی کے پیچھے جانے لگا، بولا "میں اس خزانے تک پہنچنے کے راستے سے واقف ہوں۔ ابھی نکلواتا ہوں وہ خزانہ۔"

پجاری پریشان ہو گئے۔ ایک نے کہا "یہ تو بڑی زیادتی کی بات ہے۔"

سلطان نے جواب دیا "میں دس ہزار ہندوؤں کو اپنی فوج میں داخل کروں گا۔ یہاں سے جو کچھ لوں گا تمھی لوگوں پر خرچ کر دوں گا۔"

ایک پروہت سلطان کے سامنے آیا اور عاجزی سے عرض کیا "پجاری جھوٹے ہیں۔ مندر کے تہ خانے میں اتنا بڑا خزانہ موجود ہے کہ..."

دو پجاری پروہت کو دونوں ہاتھوں سے مارنے پیٹنے لگے "تو نے یہ کیا کر دیا۔ تو ہندو نہیں معلوم ہوتا۔"

سلطان نے دونوں پجاریوں کو ڈانٹا "یہ تم دونوں کیا کر رہے ہو۔ اگر تم نہ مانے تو میں مداخلت کروں گا۔" اس کے بعد ارسلان جاذب کو حکم دیا "جا اور اپنے ساتھ میرے لشکر کا ایک دستہ لیتا آ۔"

ارسلان جاذب فوراً چلا گیا اور سیناپتی مورتی کے پیچھے سے تہ خانے کے اندر داخل ہوگیا۔

پجاریوں نے شور و غل مچانا شروع کر دیا۔

سلطان نے مونڈھا چھوڑ دیا اور کھڑے ہو کر ابوعلی کرمانی سے کہا "یہاں تو اب بھی سرکشی کا وجود موجود ہے۔"

ابوعلی کرمانی نے تقریباً جارحانہ روش اختیار کر لی، تلوار کو نیام سے نکال کر ہاتھ میں لے لیا اور کہا "واللہ اگر سلطان کے حکم کو نظرانداز کیا گیا تو میری تلوار سب کو سیدھا کر دے گی۔"

شور و غل ایک دم بند ہوگیا۔ راجا نے پجاریوں کو سمجھایا۔ "بات کو بلاوجہ طول نہ دو، ورنہ بات بگڑ جائے گی۔"

پجاری رونے لگے "مہاراج! آپ کو تو ہمارا محافظ ہونا چاہیے تھا۔ نہ کہ آپ ہی ہمت ہار بیٹھے۔"

راجا نے پجاریوں کو منانا شروع کر دیا "پہلے تو تم لوگوں نے پرجا کو ورغلایا اور اس کو سلطان کے خلاف مشتعل کر دیا اور ہندوستان بھر کے راجاؤں کو بھڑکا دیا۔ اب سلطان کی باری ہے۔ جو کچھ ہم سب کے ساتھ پیش آ رہا ہے، اس کو اپنے بھاگ کا حصہ سمجھ کے قبول کر لینا چاہیے۔"

سلطان نے راجا کو منع کیا کہ "وہ پجاریوں سے مت اُلجھے کیونکہ مسلمان سپاہی آنے والے ہی ہیں۔ سیناپتی اور تربھون چاہیں تو ابھی سے اپنا کام شروع کر دیں۔"

راجا پجاریوں کی خوشامد کرنے لگا۔

ارسلان جاذب پچاس سواروں کے ساتھ واپس آگیا۔ سلطان نے اس کو حکم دیا کہ "وہ تہ خانے میں چلا جائے اور وہاں کی دولت کو باہر نکال لائے۔"

ارسلان جاذب اپنے پچاس نفری دستے کے ساتھ تہ خانے میں چلا گیا اور پھر جو سونے چاندی اور ہیرے جواہرات کا انبار لگنا شروع ہوا تو دیر تک لگتا ہی رہا۔

سلطان نے جو اتنے خزانے کو اپنے سامنے دیکھا تو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔

راجا روہانسا ہو رہا تھا۔ کہنے لگا "سلطانِ محترم! پجاریوں کی طرف سے میں معافی مانگ رہا ہوں۔"

ایک پجاری زور زور سے رونے لگا "بھگوان! تم کہاں ہو؟ دیکھو تمھارے سیوکوں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟"

سلطان پجاریوں کو نصیحتیں کرنے لگا "دولت کو کہیں رکنا نہیں چاہیے، اس کو کام میں آنا چاہیے۔"

ایک پجاری نے عرض کیا "سلطان جی! ہم نے آپ کا حکم مان تو لیا مگر یہ اچھا نہیں ہو رہا۔ یہاں مندر میں یم دیو کی مورتی بھی موجود ہے اور ہم جانتے ہیں کہ یم دیو اپنے سیوکوں کو مایوس نہیں کرتے۔"

سلطان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "ہم تمھارے یم دیو سے نہیں ڈرتے، جاتے جاتے ان کی گت بھی بنا دی جائے گی۔"

اب راجا بھی رونے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیل جاری ہو چکا تھا۔

مندر کے اندر زیادہ جگہ نہیں تھی، اس لیے یہ خفیہ دولت مندر کے باہر زمین پر ڈھیر کی جانے لگی۔

پھر یہ دولت گھوڑوں اور ہاتھیوں پر لاد کے سلطان کے لشکر میں پہنچا دی گئی۔ سیناپتی اور تربھون سلطان کے لیے جو خدمت انجام دے رہے تھے، سلطان اپنے دل میں ان کا معترف ہو گیا تھا۔

ایک پجاری نے سلطان سے درخواست کی "حضرت سلطان جی! اب میں یہاں نہیں رہوں گا کیونکہ آپ کے چلے جانے کے بعد مجھ پر زندگی دوبھر کر دی جائے گی۔"

سلطان نے جواب دیا "ایسا نہیں ہوگا۔ اگر یہ لوگ ایسا کریں گے تو میری تلوار انھیں سیدھا کر دے گی۔"

پجاری نے عرض کیا "آپ تو غزنی چلے جائیں گے۔ اس لیے مجھ پر کیا جانے والا ظلم غزنی تک..."

راجا نے غصّے میں کہا "کیا بک بک لگا رکھی ہے۔ میں جو یہاں موجود ہوں۔ میں سلطان کا نمائندہ۔ میرے ہوتے ہوئے کس میں اتنی ہمت ہے کہ تجھ کو ستائے۔"

اب شام قریب تھی۔ سلطان مندر سے نکلا اور اپنے لشکر میں چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد وہاں کہرام برپا ہوگیا۔ پجاریوں نے تربھون، سیناپتی اور راجا کو جی بھر کے بددعائیں دیں اور پورے یقین سے دوسروں کو بتایا کہ سلطان نے مندر میں جو کچھ کیا ہے، اس کا عذاب بہت جلد نازل ہوگا۔ یم دیوتا (موت کا فرشتہ) ان کو ہڑپ کر جائے گا۔

سلطان کو نگر کوٹ کے مندر سے جو خزانہ حاصل ہوا تھا وہ کئی ریاستوں کے خزانے سے کہیں زیادہ تھا۔

تربھون اور سیناپتی سلطان کی فوج میں ہندوؤں کو بھرتی کرا رہے تھے اور دونوں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔

سلطان کی نگر کوٹ میں موجودگی کا ہر طرف شہرہ ہو چکا تھا۔ اس نامی گرامی اور مشہورِ زمانہ ذات کی دید کا ایک زمانہ شائق تھا۔ لوگ دور دور سے چل کے نگر کوٹ پہنچ رہے تھے اور مشہور فاتح اور حکمران کو دیکھنا چاہتے تھے۔

نگر کوٹ میں جو کچھ ہو رہا تھا، اس کی خبریں آنند پال کو بھی پہنچ رہی تھیں، چونکہ نگر کوٹ میں بھی راجا کو معاف کر دیا گیا تھا، اس لیے اس نے ایک بار پھر ہمت کی اور سلطان کی خدمت میں معافی کی درخواست بھیج دی۔ اس درخواست میں آنند پال نے اپنے باپ اور اپنی سابقہ غلطیوں اور زیادتیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "آپ نے مراحمِ خسروانہ سے کام لے کر ہمیں بار بار معاف کیا ہے، مجھے بھی اور میرے سُورگباشی باپ کو بھی۔ میں نے آپ کے ساتھ جو زیادتیاں کی ہیں ان میں ہمارے پجاریوں اور پروہتوں کا بہت ہاتھ تھا۔ انھوں نے ہمیں ورغلایا اور ہمیں بار بار جنگ پر اُکسایا اور ہم ان کے کہنے میں آ گئے۔ آپ پوچھیں گے کہ ہم ان کے کہنے میں کیوں آ گئے۔ وہ ہمیں اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے جنگ پر اُکسایا کرتے تھے اور ہم ان کے اصرار اور تقاضوں پر آپ کے مقابل جا کھڑے ہوئے، آپ یوں سمجھ لیں کہ اگر کیلی

لکڑی کو سو پھونکیں ماری جائیں تو وہ بھی جلنے لگتی ہے" اسی طرح ہم بھی ان کی باتوں میں آگئے ہم اپنی غلطیاں مانتے ہیں اور آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ ہمیں ایک بار اور معاف فرما دیں، اب ہم زندگی بھر آپ کے فرماں بردار رہیں گے۔"

سلطان نے آنند پال کو جواب میں لکھ دیا کہ "تجھ کو یہ درخواست بدستِ خود پیش کرنا تھی، بہرحال میں نگرکوٹ میں موجود ہوں، میں نے تجھ کو معاف کر دیا اب تو بے خوف و خطر واپس آجا۔"

سلطان کا جواب پاتے ہی آنند پال واپس آگیا اور سلطان کے قدموں میں خادمانہ انداز میں بیٹھ کر آنسو بہانے لگا۔

ابو علی کرماتی نے سلطان سے سرگوشی میں کہا "حضورِ والا! راجا آنند پال قابو میں آچکا ہے اس لیے اس کو گرفتار کر کے غزنی لے چلیں۔"

لیکن سلطان نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا "میں نے اس کو معاف کر دیا ہے اس لیے میں اس کو گرفتار نہیں کر سکتا۔"

نگرکوٹ کا راجا سلطان سے بے حد متاثر تھا۔ فرطِ جذبات سے بے قابو ہو گیا "میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ سلطان سے زیادہ نیک اور شریف انسان میں نے نہیں دیکھا۔"

سیناپتی نے سلطان کو مشورہ دیا "حضورِ والا! ہمارے مہاراج جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ قابلِ اعتبار نہیں، اس لیے ان کی چکنی چپڑی باتوں میں نہ آیئے گا۔"

تربھون کیوں پیچھے رہتا، اس لیے سیناپتی کی بھی کاٹ کر دی "اور میں تو یہ کہوں گا کہ سلطان اپنے دوستوں اور دشمنوں کو پہچانیں۔ خود سیناپتی جی بھی زیادہ لائق اعتبار نہیں ہیں، یہ چڑھتے سورج کی پوجا کرتے ہیں۔"

سلطان کے پاس ان سب کے لیے ایک ہی جواب تھا۔

"میں کسی سے بھی جنگ و جدل نہیں چاہتا۔ میری جنگ تو اہلِ قرامطہ سے ہے۔ یہ ہندو راجے مہاراجے مجھ سے خواہ مخواہ الجھتے ہیں اور میں ان کو بار بار طرح دیتا ہوں۔"

تربھون نے عرض کیا "مجھے خوف ہے کہ کہیں سلطان کو پچھتانا نہ پڑے۔ قابو میں آئے ہوئے دشمنوں کو چھوڑ دینا موجبِ شرمندگی ہوتا ہے۔"

سیناپتی کو غصہ آ رہا تھا، بولا "جناب والا! یہ تربھون جی ہم سب کے بارے میں جو خوش گفتاری فرما رہے ہیں، وہ چاپلوسی اور خوشامد کے سوا کچھ بھی نہیں۔"

سلطان نے جب یہ محسوس کیا کہ اچھا خاصا خوشگوار ماحول بدمزگی میں بدل جائے گا تو فوراً بات بدل دی "اس وقت تو ہم سب ایک کنبے کے کئی فرد ہیں، اس لیے ہمیں آپس میں لڑنا نہیں چاہیے۔"

سیناپتی نے سلطان سے درخواست کی "اور حضورِ والا! میں تو اپنے ساتھیوں کے ہمراہ آپ کی ملازمت میں آچکا ہوں، اس لیے اب میرا ہندوستان کے کسی راجا یا سینا سے کوئی تعلق نہیں رہا۔"

تربھون نے جواب دیا "اور میں بھی سلطان کی نئی فوج میں شامل ہو چکا ہوں۔"

سلطان نے نگرکوٹ کے راجا اور آنند پال کو سمجھانے کی کوشش کی "میں یہ جاننے کی کوشش کر رہا ہوں کہ آنند پال اور نگرکوٹ کے شریف راجاؤں کو کون ورغلا کے میدانِ جنگ تک لے آتا ہے۔ اب میں ان ٹھکانوں پر حملے کر کے ان کے زہریلے دانت اور ناخن توڑ دوں گا۔ تاکہ وہ آئندہ ان شریف راجگان کو ورغلا نہ سکیں۔"

سلطان کی باتیں آنند پال اور نگرکوٹ کے راجا کے دلوں پر خوب اثر انداز ہو رہی تھیں۔ ان دونوں نے سلطان سے ایک ہی بات پوچھی "ہم سلطان کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟"

سلطان نے جواب دیا "یہ کہ میں ہندوؤں کو اپنی فوج میں ملازم رکھنا چاہتا ہوں، تم دونوں ہندوؤں کو ترغیب دو کہ وہ میری فوج میں شامل ہو جائیں؟"

دونوں نے اس کا وعدہ کر لیا اور اپنے وعدے پر اتنی تیزی سے عمل کیا کہ چند دنوں میں دس ہزار ہندو فوج میں ملازم رکھوا دیے۔

جب سلطان یہاں سے غزنی واپس ہوا تو دس ہزار ہندوؤں کو اپنے ساتھ لیے ہوئے تھا اور نگرکوٹ کے مندر کا بیش بہا خزانہ اس کے ساتھ چل رہا تھا۔

غزنی کے باہر سلطان نے ایک عالی شان قصر تعمیر کرایا۔ اس قصر میں سونے اور چاندی کے تخت بچھائے گئے اور اس قصر میں نگرکوٹ کے مندر کا خزانہ سجا دیا گیا۔ اس کے بعد اس نے اپنی رعایا کو اجازت دی کہ وہ آئیں اور اس کا نظارہ کریں چنانچہ شہریوں اور دیہاتیوں کے ہجوم نے اس خزانے...... کا نظارہ کیا اور سبھی بے حد محظوظ ہوئے۔

ہندوؤں کے لیے ایک نئی بستی بسائی گئی اور اس فوج کو سیناپتی کی نگرانی میں دے دیا گیا۔ تربھون کو یہ بات گراں گزری مگر اس کی حیثیت پر اس کا کوئی اثر نہ پڑا۔ تربھون ہندوستانی معاملات میں سلطان کا مشیر بن گیا۔

سلطان کو ہندوستان میں الجھا دیکھ کر غور کے قرامطیوں نے

سر اٹھایا اور سلطان کے خلاف بغاوت کر دی، کیونکہ اس نے اپنی آئندہ کی مہمات کو ہندوستان ہی کی حد تک محدود کر دیا تھا۔ ہندوستانی مہاراجے اس کو بار بار جنگوں پر مجبور کر رہے تھے۔ اس لیے سلطان یہ چاہتا تھا کہ وہ ان قوتوں کا قلع قمع کر دے جو اس کو بار بار دعوتِ مبارزت دے رہی تھیں۔

اس نے تربھون سے مشورہ کیا کہ وہ کون کون سے راجا ہیں جو میرے لیے دردِ سر بن گئے ہیں اور ان کو ٹھیک کر دینے سے ہندوستانی جنگوں کا سدِ باب ہو جائے گا۔

تربھون نے جواب دیا "صرف تین"

سلطان نے پوچھا "کون کون؟"

تربھون نے جواب دیا "تھانیسر، قنوج اور مہابن"

سلطان نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور آہستہ سے کہا۔ "بیشک۔ مجھ کو بھی یہی تین خطرناک معلوم ہوتے ہیں"

تربھون نے کہا "اس لیے میں سلطان کو مشورہ دوں گا کہ پہل تھانیسر سے کی جائے۔ سازشوں کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے اور سلطان کے خلاف سوچ کے سوتے یہیں سے پھوٹتے ہیں"

سلطان کی اپنی رائے بھی یہی تھی۔ وہ ایک سال تک تھانیسر کے خلاف فوج کشی کی منصوبہ بندی کرتا رہا۔ اس دوران ملتان سے خبر آئی کہ داؤد بن نصر اپنے عقائد سے پھر گیا اور برملا اپنے قرامطی ہونے کا اعلان کرتا پھرتا ہے۔ سلطان کو داؤد پر غصہ تو بہت آیا لیکن ضبط و تحمل سے کام لیا۔

وہ ملتان اور تھانیسر کے خلاف تیاریاں کرتا رہا۔

وہ پروہت جس نے کبھی آنند پال کا بہت ساتھ دیا تھا اور درمیان میں اچانک کہیں روپوش ہو گیا تھا، وہ اچانک نمودار ہوا اور نگر کوٹ کے راجا سے ملاقات کی۔ وہاں کے مندر کو اُجاڑ دیا گیا تھا اور اس کا خزانہ سلطان اپنے ساتھ غزنی لے گیا تھا۔ پروہت جی کو یہ ساری باتیں معلوم ہوئیں تو رونے لگے اور نگر کوٹ کے مندر کی بربادی پر بہت آنسو بہائے۔

پروہت نے راجا سے پوچھا "تو نے مندر کو برباد ہو جانے دیا اور خود زندہ و سلامت رہا"

راجا نے جواب دیا "پروہت جی! میں کیا کر سکتا تھا، میں تو بالکل بے بس اور لاچار ہو گیا تھا"

پروہت جی نے مشورہ دیا "اب بھی وقت نہیں گیا، ہم اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں"

راجا اس کی بات سننے کو تیار نہ تھا، جواب دیا "کوئی اور بات کرو پروہت جی۔ آپ فکر مت کریں، فکر سے انسان کی صحت چلی جاتی ہے"

پروہت جی نے پوچھا "اور آنند پال جی کا کیا ہوا؟ وہ تو بڑی باتیں کیا کرتا تھا، اب وہ کیا کر رہا ہے؟"

راجا نے جواب دیا "اب وہ آرام کر رہا ہے اور اس نے اس بار پھر سلطان سے معافی مانگ کر اپنی جان بچائی ہے"

پروہت جی بہت غمزدہ تھے، کہنے لگے "یہاں تو معاملہ ہی الٹ گیا۔ میں بدری ناتھ چلا گیا تھا۔ وہاں میں نے دیس اور دھرم کے بچاؤ کے لیے تپسیا کی اور جب مجھے یہ بتایا گیا کہ واپس جاؤ، دیس اور دھرم کو بچا لیا گیا ہے، اس خوش خبری کے بعد واپس آ گیا لیکن یہاں تو کچھ اور ہی ہو گیا"

راجا نے جواب دیا "دیس اور دھرم کو بچا تو لیا گیا۔ سلطان نے ہمیں شکست دی لیکن ہمارا کوئی علاقہ نہیں لیا۔ ہم سے مسلمان ہو جانے کے لیے نہیں کہا اور حد تو یہ ہے کہ اس بار سلطان نے اپنی فوج میں دس ہزار ہندو بھی شامل کر لیے۔ اب یہ ہندو سپاہی اگر چاہیں گے تو ہمارے دیس اور دھرم کو ان سے فائدہ پہنچ جائے گا"

پروہت جی اس خبر پر چونک گئے، پوچھا "یہ کیسی خبر ہے؟"

راجا نے وضاحت کی "سلطان کہتا تھا کہ ہم ہندوؤں سے جنگ نہیں کرنا چاہتے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ہر بار حملہ سلطان پر کیا گیا ہے۔ اس نے تو صرف بچاؤ کیا ہے، اپنا دفاع کیا ہے"

پروہت جی نے طنز کیا "یہ کیسا دفاع ہے کہ نگر کوٹ کو فتح کر لیا اور مندر کے نذرانے اور دولت بھی لوٹ لی۔ مندر کو اُجاڑ دیا۔ یہ سب کیا ہے"

راجا لاجواب ہو گیا۔ وہ سلطان کا دفاع کرنے میں ناکام ہو چکا تھا۔

پروہت جی کو راجا پر بھی غصہ آ رہا تھا "بے شک تم چاہو تو مجھ کو قتل کرا دو، ہلاک کر دو لیکن میں سچی بات کر کے رہوں گا۔ تم پر سلطان نے جادو کر دیا ہے کہ اب تم اس کی وکالت کرنے لگے ہو، اس کی صفائیاں پیش کرتے ہو۔ اس کا ساتھ دیتے ہو"

راجا نے پروہت جی کی ایک نہیں سنی اور معذرت کر لی۔ "پروہت جی! اب آپ جا سکتے ہیں۔ ہم نے آپ لوگوں کی باتیں مان کے اپنا بڑا نقصان کیا اور سلطان کو یہاں تک لے آئے۔ اب آپ دوبارہ بدری ناتھ جی چلے جائیں اور وہیں پوری زندگی تپسیا میں گزار دیں"

پروہت جی ادھر سے مایوس ہو کر آنند پال کے پاس پہنچ گئے لیکن وہ بھی پروہت جی کی باتیں سننے کو تیار نہ تھا۔ آنند پال نے بھی وہی باتیں کیں جو نگر کوٹ کا راجا کر چکا تھا۔

اب پروہت جی غصے میں آ گئے۔ کہنے لگے "آنند پال جی! آرام و آسائش کی فکر نے تجھ کو کہیں کا نہ رکھا لیکن میں ہمت ہارنے والا نہیں، جو کام تم نہ کر سکے، وہ کوئی دوسرا انجام دے گا لیکن میں اس خطرے کو ختم کر کے رہوں گا۔ میں پچھمی سرحدوں کی اس مصیبت کا خاتمہ کر کے رہوں گا"

پروہت جی جب اس قسم کی باتیں کر رہے تھے اس وقت آنند پال کا جوان بیٹا ترلوچن پال کسی طرف سے وہاں آ گیا اور پروہت جی سے پوچھا "پروہت جی! کیا بات ہے؟ آپ اتنے ناراض کیوں ہیں۔ خیریت تو ہے؟"

پروہت جی نے جواب دیا "اس دیس سے غیرت ختم ہو چکی۔ ملیچھ لوگ دیس کی پچھمی سرحدوں سے جب چاہتے ہیں داخل ہو جاتے ہیں اور ہم انھیں روک بھی نہیں سکتے"

ترلوچن پال، محمود سے متنفر تھا اور اسے اپنے باپ کے مصالحانہ اور مفاہمانہ رویّے سے سخت اختلاف تھا، پروہت جی سے کہنے لگا "بڑوں کے معاملات میں دخل دینے والا میں کون، لیکن اگر میں ہوتا اپنے پتا جی کی جگہ تو دنیا دیکھتی تماشا۔ میں سلطان کو ادھر کا رخ بھی نہ کرنے دیتا"

آنند پال نے اپنے بیٹے کو ڈانٹ دیا "سلطان کے ہم پر کئی احسان ہیں۔ اس لیے سلطان کی برائی نہ کر۔ میں سلطان کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سنوں گا"

ترلوچن پال کو بھی طیش آ گیا، باہر جاتے ہوئے کہا۔ "لیکن پتا جی! سلطان نے مجھ پر کوئی احسان نہیں کیا۔ میں اس سے نفرت کرتا ہوں"

پروہت جی کو ترلوچن پال سے مل کر بڑی خوشی ہوئی لیکن فی الحال ترلوچن پال، پروہت جی کے کام کا نہیں تھا۔

پروہت جی باہر نکلے اور یہ سوچنے لگے کہ اب انھیں کیا کرنا چاہیے۔ آخر وہ تھانیسر چلے گئے کیونکہ وہ خوب جانتے تھے کہ اب اگر سلطان کا مقابلہ کر سکتا ہے تو تھانیسر کا راجا ہی کر سکتا ہے۔ وہ یہاں سے تھانیسر چلے گئے۔ شاندار مندروں کا عظیم الشان شہر۔ وہ سیدھے تھانیسر کے راجا کے پاس پہنچ گئے۔ راجا نے پروہت جی کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور پوچھا "میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

پروہت جی نے اپنی روداد سنا دی اور کہا "آنند پال جی اور نگر کوٹ کا راجا دونوں ہی سلطان کے باج گزار بن چکے ہیں، اب وہ ہمارے کام کے نہیں رہے"

تھانیسر کے راجا نے پوچھا "میرے لائق کوئی کام بتائیں۔ میں آپ کی خدمت کرنا چاہتا ہوں"

تھانیسر کے راجا کا شریفانہ اور مفاہمانہ رویّہ پروہت جی کے لیے بڑا خوش آئند تھا، پوچھا ..... "میں نے ابھی ابھی پوچھا تھا کہ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

پروہت جی نے جواب دیا "مہاراج! میری تو بس ایک ہی خواہش ہے، مسلمانوں کا قلع قمع۔ میں چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے"

تھانیسر کے راجا نے آنند پال کی شکایت کی "پروہت جی! ہم سلطان سے جنگ کیوں ہار گئے؟ کس کی وجہ سے ہار گئے؟ آپ جانتے ہیں؟"

پروہت جی سوالیہ نشان بن گئے، پوچھا "کیوں، کس کی وجہ سے ہار گئے؟"

راجا نے جواب دیا "صرف آنند پال کی وجہ سے۔ اس کا ہاتھی میدانِ جنگ سے بھاگا، اس سے فوج کا حوصلہ پست ہو گیا اور وہ بھی بھاگ کھڑی ہوئی"

پروہت جی نے حیرت سے راجا کو گھورا "یہ بات تو مجھے کسی نے بتائی ہی نہیں"

راجا نے کہا "یہ بات آپ کو کون بتائے گا، آنند پال؟ مجھ کو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنند پال اور سلطان میں کسی قسم کا گٹھ جوڑ ہو چکا ہے، اور ہمیں آئندہ دو محاذوں پر لڑنا ہو گا"

پروہت جی سوچ میں ڈوب گئے۔ وہ ان جدید انکشافات کی روشنی میں یہ سوچ رہے تھے کہ اس تنگ و تاریک ماحول اور حالات میں سلطان کے خطرے کا سدِ باب کیوں کر ہو۔ ان کا دم گھٹنے لگا۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آ رہا تھا۔ اس اندھیرے میں سلطان کا فاتحانہ ہاتھ پورے دیس کو اپنی مٹھی میں لیتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ پروہت جی فوجی طاقت سے سلطان کو زیر کرنے کا منصوبہ ترک کرنے لگے۔ جس مہم کو ہندوستان کے پچیس تیس راجے اپنی متحدہ اور متفقہ کوششوں سے انجام نہیں دے سکے تھے، اب اس تجربے کو دہرانے سے حاصل۔

تھانیسر کا راجا سلطان سے نبرد آزما ہونے کے لیے اب بھی آمادہ تھا لیکن پروہت جی خوب جانتے تھے کہ جس ملک میں نااتفاقی ہو اور لوگ نفسا نفسی کا شکار ہوں وہ جنگ نہیں جیت سکتا۔ وہ متحد اور جنگجو قوم کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

پروہت جی کئی دن تک تھانیسر کے راجا کے مہمان رہے۔ راجا، پروہت جی سے بار بار ایک ہی سوال کرتا "کیا بدری ناتھ جی میں آپ کو یہ خوش خبری سنائی گئی ہے کہ ہم اپنے

دشمن پر قابو پالیں گے اور اپنے دیس اور دھرم کو اس سے بچالیں گے؟"

پروہت جی نے جواب دیا۔"ہاں، مجھے یہ خوش خبری سنائی گئی ہے اور ہوسکتا ہے کہ دیس اور دھرم کا یہ کام ہم دونوں مل جل کے انجام دیں۔"

کئی دن کی سوچ بچار کے بعد پروہت جی نے ایک ایسا منصوبہ بنالیا جس سے سلطان کو کمزور کیا جا سکتا تھا۔ اس نے تھانیسر کے راجا سے کہا۔"اب میں ایسا قدم اٹھاؤں گا کہ جس میں جیت یقینی ہو اور یہ جنگ اپنے دیس میں کم غزنی میں زیادہ لڑی جائے گی۔"

تھانیسر کا راجا گھبرا گیا، کہنے لگا۔"لیکن اب ہمارا کوئی لشکر پشاور یا غزنی نہیں جائے گا۔"

پروہت جی نے جواب دیا۔"غزنی ہمارا لشکر نہیں جائے گا۔ وہاں میں خود جاؤں گا۔"

راجا کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا، سوالیہ لہجے میں پوچھا۔"وہاں آپ خود جائیں گے؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

پروہت جی نے جواب دیا۔"مہاراج! میں بڑے سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بکریاں تو شیر بننے سے رہیں لیکن شیر کو بکری ضرور بنایا جا سکتا ہے۔"

راجا نے پوچھا۔"وہ کس طرح پروہت جی؟"

پروہت جی نے جواب دیا۔"میں غزنی جاؤں گا اور وہاں اپنے دس ہزار ہندوؤں کے دھرم کو بچاؤں گا اور مسلمانوں کو اپنی اعلیٰ اور عدم تشدد کی تعلیم دے کر بکری بنا دینے کی کوشش کروں گا۔ میری تعلیم کا ثمرہ جلدی حاصل نہیں ہوگا لیکن ایک مدت بعد جب اس کا اثر ظاہر ہونا شروع ہوگا... تو پھر یہ اثر بڑھتا اور پھیلتا ہی چلا جائے گا اور جب یہ اثر پوری قوم میں پھیل جائے گا تو یہ قوم اپنے ہاتھوں کے ہتھیار پھینک کر تسبیح اور مصلا سنبھال لے گی۔ اس دن میرا کام ختم ہو جائے گا اور میرا دیس اور میرا دھرم ان کی تاخت و تاراج سے بچ جائیں گے۔"

تھانیسر کے راجا کی سمجھ میں پروہت جی کی ساری باتیں نہیں آئیں لیکن کچھ کچھ سمجھ میں ضرور آگئیں پھر بھی پروہت جی کے منصوبے کا اثر چونکہ فوری طور پر ظاہر ہونے کا امکان نہیں تھا اس لیے راجا کی خاص توجہ نہیں حاصل کر سکا۔ اس نے کہا۔"پروہت جی! آپ کا منصوبہ طویل المیعاد ہے اس لیے میری سمجھ میں زیادہ نہیں آرہا۔ آپ غزنی میں جو کام کریں گے اس کے اثرات ہماری اور آپ کی موت کے بعد ظاہر ہو سکتے ہیں، اس سے ہمیں کیا فائدہ پہنچے گا؟"

پروہت جی نے جواب دیا۔"میں جو کچھ کروں گا اپنے یا آپ کے لیے نہیں کروں گا، یہ کام میں اپنی آئندہ نسلوں کے لیے کروں گا۔ آنے والے دنوں کے لیے کروں گا اس لیے میرا کل فائدہ اٹھائے گا، میرا دیس فائدہ اٹھائے گا۔"

راجا نے کہا۔"منصوبہ اچھا تو ہے لیکن کامیابی مشتبہ ہے، بہر حال میری دعا ہے کہ بھگوان آپ کو ضرور کامیاب کرے۔"

پروہت جی نے جواب دیا۔"میں اپنا کام پورے یقین سے کروں گا اور اس پر میرا یقین کامل ہے کہ جو کام یقین سے شروع کیا جائے گا اس میں کامیابی یقینی ہے۔"

راجا نے پروہت جی کے بارے میں سوچا کہ یہ آدمی بہت کام کا ہے اور اس سے کوئی بڑا کام لیا جا سکتا ہے۔ اس نے پروہت جی کے منصوبے کی بڑی تعریف کی اور وعدہ کیا کہ"میں اس سلسلے میں آپ کی جو مدد کر سکوں گا ضرور کروں گا لیکن شرط یہ ہے کہ آپ مجھ سے رابطہ قائم رکھیں گے۔"

اس منصوبے کی تیاری کے بعد پروہت جی اس کی جزئیات پر غور کرتے رہے۔ اس سلسلے میں انھیں پانچ چھ آدمی اور درکار تھے۔ راجا نے وعدہ کیا کہ یہ آدمی بھی مہیا کر دیے جائیں گے۔

پروہت جی نے کہا۔"لیکن وہ پانچ چھ آدمی میرے ہی جیسے ہونے چاہئیں، دنیا سے بے فکر اور بے نیاز۔ دھرم پر اپنا سب کچھ قربان کر دینے والے۔"

راجا نے جواب دیا۔"اس کی تو آپ چنتا ہی نہ کریں ایسے آدمی بھی مل جائیں گے۔"

پروہت جی نے غزنی جانے کی تیاری شروع کر دی۔

تھانیسر کا سب سے زیادہ مشہور مندر جگ سوم پورے ہندوستان میں بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ دہلی سے ستر میل دور تھانیسر اس مندر اور اس کے بُت جگ سوم کی وجہ سے شہرت و فضیلتِ خاص کا حامل تھا۔ پروہت جی اس مندر میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ راجا اور پروہت نے مل کے جو منصوبہ بنایا تھا اس کا کسی اور کو کوئی علم نہ تھا۔ پھر یکایک پروہت جی نے جگ سوم کے سامنے کھڑے ہو کے اعلان کر دیا۔"جگ سوم جی! میں مسلمانوں کے شہر غزنی جا رہا ہوں۔ جہاں کا سلطان کئی بار آپ کے دیس پر حملے کر چکا ہے۔ میں غزنی میں بیٹھ کے ایک ایسی تپسیا کرنا چاہتا ہوں جس سے مسلمانوں کے دل بدل جائیں... اور وہ آپ کا احترام کرنے لگیں۔ آپ مجھ میں اتنی طاقت پیدا کر دیں کہ میں جو کام کرنا چاہتا ہوں اس کو بخیر و خوبی اور بہت اچھی طرح انجام دے سکوں۔"

ایک پجاری نے پوچھا۔"پروہت جی! کیا آپ غزنی جائیں گے؟"

پروہت جی نے جواب دیا۔"ہاں میں غزنی جاؤں گا، اس غزنی شہر میں، جہاں کا سلطان محمود ہمارے دیس پر حملے کرتا رہتا ہے۔"

پجاری نے پوچھا۔"آپ کو وہاں جاتے ہوئے خوف نہیں محسوس ہوگا؟"

پروہت جی نے جواب دیا۔"بالکل نہیں، کیوں کہ میرے دل میں اپنے دیس اور دھرم کی بڑی محبت ہے اور اس محبت پر سلطان یا کسی اور مسلمان کا خوف غالب نہیں آسکتا۔"

کسی دوسرے پجاری نے پوچھا۔"آپ وہاں جا کے کریں گے کیا؟"

پروہت جی نے جواب دیا۔"جب سلطان نے نگر کوٹ کو فتح کیا اور وہاں کے مندر کے نذرانوں کو لوٹ لیا، میں ان دنوں بدری ناتھ جی میں تھا، وہاں مجھے حکم دیا گیا کہ غزنی جاؤ اور اُن ہندوؤں کے دھرم کو بچاؤ جنھیں سلطان اپنی فوج میں ملازم رکھ کے غزنی لیے جا رہا ہے۔ میں نے بدری ناتھ جی سے کہا کہ اتنا بڑا کام میں تنہا کیوں کر انجام دوں گا تو مجھے یہ خوش خبری سنائی گئی کہ تو یہ فضول باتیں مت سوچ، بلکہ تجھ سے جو کہا گیا ہے اس پر عمل کر، کامیابی اور ناکامی میرے ہاتھ میں ہے۔ وہیں بدری ناتھ جی نے یہ حکم بھی دیا تھا کہ غزنی جانے سے پہلے تھانیسر میں جگ سوم جی کی خدمت میں سیس نواس۔" یہ کہہ کے پروہت، جگ سوم کے قدموں میں گر گیا۔"جگ سوم جی! میں نے بدری ناتھ جی کا کہا کر دیا اب آپ مجھے اتنی ہمّت دیں کہ میں یہ مشکل کام بخیر و خوبی انجام دے سکوں۔"

پروہت جی کی باتیں سبھی پر اثر انداز ہو رہی تھیں۔ مندر کے پجاری اور دیو داسیاں، پروہت جی کے سحر میں گرفتار ہو چکی تھیں، وہ سب جذباتی ہو رہے تھے۔ پروہت جی نے کہا۔"چونکہ اتنا بڑا کام شاید میں اکیلا نہ انجام دے سکوں، اس لیے میں اپنے ساتھ چند مددگار بھی لے جاؤں گا، یہ چند مددگار غزنی میں میرے چیلے کہلائیں گے۔ اب بتاؤ تم میں سے کون کون ہمارے ساتھ جانا پسند کرے گا؟"

تقریباً پندرہ سولہ نوجوان، پروہت جی کے سامنے آ کھڑے ہوئے اور وعدہ کیا۔"پروہت جی! آپ ہمیں اپنے ساتھ لے چلیں، وہاں ہم سب آپ کے چیلے کہلائیں گے۔"

پروہت جی نے ان میں سے چھ نوجوان الگ کر لیے اور کہا۔"ہمارے لیے چھ جوان کافی ہیں، چھ سے زیادہ ایک بھی نہیں۔"

بقیہ جوان بھی جانے کی ضد کرتے رہے لیکن پروہت جی نے انھیں مایوس کر دیا۔

پروہت جی کے سامنے دیو داسیاں بھی کھڑی تھیں۔ یہ وہ لڑکیاں تھیں جو جگ سوم سے بے اولاد خواتین نے منّت کے طور پر مانگی تھیں اور جگ سوم سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر اس دعا کے بعد ان کے ہاں بچّہ پیدا ہوا تو وہ اپنی پہلی اولاد جگ سوم کی خدمت میں دے دیں گی۔ یہ ساری دیو داسیاں منّتوں کی پیداوار تھیں اور ان کو ان کے سادہ لوح والدین نے ہمیشہ کے لیے جگ سوم کی نذر کر دیا تھا۔ ان میں بعض بہت حسین تھیں، اتنی حسین کہ دیکھیے تو بس دیکھتے ہی رہ جائیے۔

دس دیو داسیاں پروہت جی کی خوشامد کرنے لگیں۔"پروہت جی! آپ ہمیں بھی اپنے ساتھ لے چلیں، ہمیں اس نیک کام میں کیوں شریک نہیں کرتے۔"

پروہت جی نے ان کے بارے میں تو سوچا بھی نہیں تھا لیکن اب ان کا بھی جی چاہنے لگا کہ اس سفر اور منصوبے میں دیو داسیاں بہت ضروری ہیں، اس نے دیو داسیوں سے صاف صاف کہہ دیا کہ ہمیں صرف پانچ درکار ہیں اور ان پانچ کا انتخاب بھی میں ہی کروں گا۔"

دیو داسیاں ایک قطار میں کھڑی ہو گئیں۔ پروہت جی کچھ دیر کھڑے رہے اور ان کی صورتیں دیکھتے رہے، پھر ایک دیو داسی کو الگ کر لیا۔ پوچھا۔"بی بی تمھارا نام؟"

دیو داسی نے جواب دیا۔"میرا نام لاجونتی ہے۔"

پروہت جی نے لاجونتی کو الگ کر لیا۔

کچھ دیر بعد دوسری دیو داسی کو الگ کر لیا اور پوچھا۔"او لڑکی! تیرا کیا نام ہے؟"

دوسری لڑکی نے جواب دیا۔"کوشلیا۔"

پروہت جی نے کوشلیا کو لاجونتی کے پاس بھیج دیا۔ اور اب ان کو تیسری کا انتخاب کرنا تھا، ذرا سی دیر بعد تیسری کو بھی قطار سے نکال لیا گیا اور پوچھا۔"تیرا نام؟"

لڑکی نے جواب دیا۔"رام کلی۔"

پروہت جی نے رام کلی کو بھی دونوں کے پاس بھیج دیا اور

چوتھی کے انتخاب میں منہمک ہو گئے۔ یہ چوتھی لڑکی تینوں سے زیادہ حسین تھی۔ پروہت جی نے اس کا نام پوچھا۔

"اور بی بی آپ کیا ہیں، یعنی آپ کا شبھ نام کیا ہے؟"

چوتھی نے جواب دیا۔ "ساوتری۔"

پروہت جی نے اس کو بھی تینوں کے پاس بھیج دیا اور پانچویں کی فکر کرنے لگے۔ اس کو بھی قطار سے نکال لیا اور پوچھا "اور تیرا نام؟"

پانچویں نے جواب دیا۔ "میں نرملا ہوں۔"

پروہت جی نے نرملا کو بھی چاروں کے پاس بھیج دیا، اور بقیہ کو رد کر دیا۔ پروہت جی نے ان پانچوں سے کہا۔ "اور دیکھو تم دو دن تک خوب اچھی طرح غور کر لو کہ تمھارا ہمارے ساتھ غزنی جانا مناسب رہے گا یا نہیں۔ جو نہ جانا... چاہے وہ منع کر دے، میں اس کی جگہ کسی اور کو لے لوں گا۔"

لیکن پانچوں لڑکیاں بہت خوش تھیں۔ پروہت جی نے ان پانچوں سے کہا۔ "اور دیکھو تم پانچوں بھی میری چیلی بن کے رہو گی۔"

سب نے ایک ساتھ جواب دیا۔ "ہمیں معلوم ہے۔"

لیکن جگ سوم کے بڑے پجاری نے اس میں رخنہ ڈال دیا۔ جب ان جوان لڑکیوں اور لڑکوں کو چُنا جا رہا تھا، مندر کے بڑے پجاری جی وہاں موجود نہیں تھے۔ جب واپس آئے تو انھیں بتایا گیا کہ پروہت جی چھ جوانوں اور پانچ دیوداسیوں کو اپنے ساتھ غزنی لیے جا رہے ہیں۔ بڑے پجاری جی کو یہ بات گراں گزری اور انھوں نے شکایتاً کہا۔ "واہ یہ کیا بات ہوئی؟ یہاں جو کچھ ہوتا ہے میری مرضی میری اجازت سے ہوتا ہے، پھر یہ پروہت جی نے کیا کر دیا۔"

پروہت جی بڑے پجاری سے اُلجھنا نہیں چاہتے تھے، معذرت کرنے لگے، بولے "میں نے یہ سب آپ کی عدم موجودگی میں کیا ضرور ہے لیکن میں انھیں آپ کی مرضی کے بغیر ہرگز نہ لے جاتا۔ اب آپ جب ان کو اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت دے دیں گے تو میں انھیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

بڑے پجاری نے جوان لڑکوں اور لڑکیوں کو اندر حُجروں میں بھیج دیا جب وہ سب چلے گئے تو بڑے پجاری نے بڑی رعونت سے پوچھا۔ "ہاں تو پروہت جی! آپ یہاں کیا لینے آئے ہیں؟"

پروہت جی کو بڑے پجاری کا یہ سوال اچھا نہیں لگا۔ بے زاری سے جواب دیا۔ "میں غزنی جا رہا ہوں پجاری جی! مجھے بدری ناتھ جی نے خواب میں خوش خبری سنائی تھی کہ میں غزنی چلا جاؤں گا۔"

بڑے پجاری نے لاتعلقی کے انداز میں جواب دیا۔ "وہ تو سب ٹھیک ہے کہ تم غزنی جا رہے ہو، خوب!! تمھارا منصوبہ تمھارا ہے، اس کا میری ذات سے کیا تعلق؟"

پروہت جی نے کھسیائے لہجے میں کہا۔ "آپ بھی درست کہہ رہے ہیں، میرے منصوبوں کا آپ کی ذات سے کیا تعلق؟"

بڑے پجاری نے انتہائی بے مروّتی سے کہہ دیا۔ "آپ غزنی جا رہے ہیں، شوق سے جائیں لیکن میرے کسی آدمی کو آپ اپنے ساتھ نہیں لے جائیں گے۔"

پروہت جی نے پوچھا۔ "وہ کیوں؟ وجہ؟"

بڑے پجاری نے جواب دیا۔ "غزنی میں مسلمان رہتے ہیں اور مسلمان ملیچھ ہوتے ہیں۔ میں تمھیں اس کی اجازت نہیں دے سکتا کہ میرے نوجوان اور دیوداسیاں مسلمانوں میں رہ بس کر ملیچھ ہو جائیں۔"

پروہت جی نے کہا۔ "دیکھیے پجاری جی! آپ اتنا ظلم نہ کریں، میں غزنی یوں ہی نہیں جا رہا۔ ایک بڑے مقصد سے جا رہا ہوں اس لیے آپ اس میں رخنہ نہ ڈالیں۔"

بڑے پجاری نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا۔ "میں نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ اور اس میں کسی قسم کا ردّ و بدل ناممکن ہے۔"

پروہت جی کو بھی غصہ آ گیا۔ پاؤں پٹک کر غصے میں بولے "لیکن میں تو ان سب کو اپنے ساتھ ضرور لے جاؤں گا۔ میں بھی جو فیصلہ کر لیتا ہوں پھر اس میں کوئی تبدیلی نہیں کرتا۔"

بڑے پجاری نے جیسے پروہت جی کی بات سنی ہی نہیں۔ چُپ چاپ وہاں سے ٹل گیا۔

پروہت جی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا، انھوں نے بہ آوازِ بلند اعلان کر دیا۔ "جن نوجوانوں اور دیوداسیوں کو میرے ساتھ غزنی جانا ہے میرے پاس آ جائیں۔ ورنہ میں کوئی اور انتظام کر لوں گا۔"

یہ آواز بڑے پجاری کے کانوں میں بھی پڑی۔ وہ مندر میں واپس گئے اور نوجوانوں اور دیوداسیوں کا راستہ روک دیا۔

پانچوں دیوداسیاں اور چھ نوجوان دور کھڑے پروہت جی کو دیکھ رہے تھے۔

پروہت جی نے بڑے پجاری سے کہا۔ "پجاری جی! آپ دیوار نہ بنیں، راستے سے ہٹ جائیں۔"

بڑے پجاری نے جواب دیا۔ "میں نے جو کہہ دیا سو کہہ دیا، آپ یہاں سے ایک فرد بھی نہیں لے جا سکتے۔"

پروہت جی نے کہا۔ "پجاری جی! میں نہیں چاہتا کہ آپ شرمندہ ہوں، بیچ سے ہٹ جائیں، جو آ رہا ہے اس کو نہ روکیں، آنے دیں۔"

پجاری نے کہا۔ "پروہت جی! آپ بھی میرے صبر و ضبط کا امتحان نہ لیں، اب آپ یہاں سے چلے جائیں۔"

پروہت جی نے جواب دیا۔ "میں یہاں جس مقصد سے آیا تھا، وہ پورا ہوا، اب میں اپنے آدمیوں کے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔"

پجاری نے کہا۔ "آپ کی مرضی لیکن یہ یاد رکھیے گا کہ آپ جو چاہتے ہیں وہ نہیں ہو گا۔"

پروہت جی سیدھے راجا تھانیسر کے پاس پہنچ گئے اور ان کو پوری صورتِ حال سمجھا دی، آخر میں کہا۔ "اب آپ بتائیں کہ ہم کیا کریں؟"

راجا نے جواب دیا۔ "آؤ میرے ساتھ چلو۔ میں دیکھتا ہوں ان کو کون روکتا ہے؟"

بڑے پجاری نے پروہت جی کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ "یہ مہاراج کو کیوں تکلیف دی؟"

راجا نے جواب دیا۔ "مجھے تکلیف کسی نے بھی نہیں دی۔ میں یہاں خود سے آیا ہوں۔"

پجاری نے عرض کیا۔ "اب جب کہ آپ آ ہی گئے ہیں تو کچھ باتیں میری بھی سُن لیں۔ غزنی ملیچھ مسلمانوں کا شہر ہے، میرے جو نوجوان اور دیوداسیاں وہاں جائیں گی ان کا دھرم بھرشٹ ہو جائے گا اس لیے میں یہ اجازت نہیں دے سکتا۔"

راجا نے کہا۔ "پجاری جی! پروہت جی کے پیشِ نظر جو مقصد ہے وہ بہت بڑا ہے، اس کے لیے چند ہندوؤں کا دھرم بھرشٹ ہو جانے دو۔"

پروہت جی نے پجاری جی سے کہا۔ "اس کو اپنی ذاتی اَنا کا مسئلہ نہ بنائیں۔ میں اس سلسلے میں آپ سے معافی مانگ سکتا ہوں۔"

پجاری اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں۔ وہ اب بھی راستہ روکے کھڑا تھا۔

راجا نے پوچھا۔ "پجاری جی! آپ راستہ چھوڑیں گے یا نہیں؟"

پجاری نے جواب دیا۔ "نہیں، میں راستہ نہیں چھوڑوں گا۔"

راجا نے دیوداسیوں اور نوجوانوں کو آواز دی۔ "وہ میرے پاس آ جائیں جن کو غزنی جانا ہے۔"

دیکھتے ہی دیکھتے پانچوں دیوداسیاں اور چھ نوجوان پجاری جی کو راستے سے ہٹا کے راجا اور پروہت جی کے پاس آ گئے۔

راجا نے پروہت جی سے کہا۔ "اب آپ ان کو لے جا سکتے ہیں۔"

پجاری نے مندر کی گھنٹیاں بجانا شروع کر دیں، وہ جگ سوم دیوتا سے فریاد کر رہا تھا۔ "اے میرے جگ سوم! آپ کا وجود اس دن سے ہے جس دن یہ دنیا بنی تھی۔ میں آپ کا مہا پجاری ہوں۔ یہاں مجھے جو اختیارات حاصل ہیں، لوگ اس میں کمی کر رہے ہیں اور دنیا کے لوبھی، دھرم پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں، تم انھیں روکو اور اپنی شکتی کا ایسا مظاہرہ کرو کہ یہ آئندہ اپنی حیثیت سے بڑھ کر کوئی کام نہ کر سکیں، پربھو! انھیں آنکھیں دو، اندر کی آنکھیں کہ میرا مقام دیکھ لیں اور اپنی حیثیت جان لیں۔"

تھانیسر کے راجا نے پروہت جی کو مشورہ دیا۔ "اب آپ جا سکتے ہیں، یہ پجاری اس مندر میں زیادہ دن نہیں رہے گا۔"

پروہت جی کو زادِ راہ کے طور پر وافر مقدار میں سونا، کپڑے، اناج اور کچھ جڑی بوٹیاں دے دی گئیں، اور بطورِ خاص ہدایت کی گئی کہ غزنی میں دوسرے امور کی انجام دہی کے ساتھ ہی سلطان کی حرکات و سکنات پر بھی گہری نظر رکھی جائے اور جیسے ہی یہ معلوم ہو کہ سلطان تھانیسر، دہلی، متھرا یا قنوج پر حملہ آور ہونے والا ہے، ہمیں اس کی اطلاع دی جائے۔"

پروہت جی نے اس کا وعدہ کر لیا۔

ان لوگوں نے سادھوؤں کا لباس پہنا، ان کا گیروا لباس دور ہی سے لوگوں کو یہ بتا رہا تھا کہ یہ تارک الدنیا لوگ گیان دھیان میں مشغول، دنیا کے کسی کام کے نہیں ہیں، عورتوں کی ساریاں بھی پیلی ہی تھیں اور ساریوں کا کپڑا موٹا تھا۔ ان لوگوں نے اپنے چہروں پر اُبٹن اتنا ملا کہ چہرے کا رنگ نکھر آیا اور ایک قسم کی معصومیت سی چہرے پر جھلکنے لگی۔

یہ لوگ پشاور کے راستے غزنی جا رہے تھے۔ راستے کی بستیوں کے مقامی لوگوں کو ان کی وضع قطع اور دنیا سے لاتعلقی اور بے نیازی بہت اچھی لگی۔ وہ ان سے طرح طرح کے سوالات کرتے اور یہ لوگ ان کے جچے تُلے اور نہایت نرم اور ملائم جوابات دے کر ان کے دلوں کو موہ لیتے۔

پشاور سے ایک منزل دور پروہت جی نے ایک

قصبے میں قیام کیا، اس قصبے میں نہایت خونخوار اور جنگ جو لوگ رہتے تھے۔ جب پروہت جی نے اس بستی میں قیام کیا تو ان لوگوں نے ان عجیب و غریب لوگوں کو دلچسپی اور حیرت کی نظروں سے دیکھا ان لوگوں نے قصبے کے لوگوں سے تعلقات بڑھانے کی کوشش کی۔ مگر اس طرح کہ وہ محسوس نہ کریں۔ قصبے کے لوگ ان کو بھجن میں مشغول دیکھتے تو ان کے آس پاس یوں کھڑے ہو جاتے گویا وہ ان سے بہت زیادہ متاثر ہیں اور ان کی ارادت مندی کی خاطر حاضر ہوئے ہیں۔

خلجیوں کا ایک سردار ان کی خدمت میں آیا اور کچھ دور کھڑا ان کی حالت پر غور کرتا رہا۔ خلجی سردار کی تلوار نیام میں پڑی ہوئی تھی۔

پروہت جی نے اس کو اچٹتی اور سرسری نظر سے دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں اور بے ترتیب جملے بولنے لگا وہ کہہ رہا تھا۔ "میرے پاس وہ لوگ نہیں آسکتے جو جسموں میں ہتھیار سجائے ہوں، میں ان کا سایہ تک اپنی ذات پر نہیں پڑنے دوں گا۔ اور وہ لوگ جو ہتھیار بند ہوں اس محفل میں نہ آئیں۔"

خلجی سردار کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو وہ پروہت جی کے پاس کھڑا ہو کے پوچھنے لگا۔ "تم مجھے اپنے پاس کیوں نہیں آنے دو گے؟"

پروہت نے جواب دیا۔ "بات دراصل یہ ہے کہ میں اپنی قوم، اپنے دھرم والوں کے لیے یہاں آیا ہوں۔ تم مسلمان ہو اس لیے تمھارا میرے پاس آنا فضول ہے۔"

خلجی سردار نے کہا۔ "لیکن تو نے یہ کہا تھا کہ ہتھیار بند لوگ تیرے پاس نہیں آسکتے۔"

پروہت جی نے لاجونتی کو آواز دی۔ "لاجونتی! اِدھر میرے پاس آ۔" اس کے بعد خلجی سردار سے کہا۔ "بابا ہم عدم تشدد کے لوگ، خون خرابے سے دور بھاگتے ہیں۔ جیون جس کو تم زندگی کہتے ہو اتنی سستی اور بے کار شے نہیں ہے کہ اسے ہتھیاروں سے برباد کر دیا جائے۔ ایک ایسا نقصان جس کی تلافی ناممکن ہو ہتھیاروں ہی سے پہنچایا جاتا ہے۔ اسی لیے ہم عدم تشدد کے لوگ نہ خود ہتھیار رکھتے ہیں اور نہ ہتھیار والوں کو اپنے پاس آنے دیتے ہیں۔"

خلجی سردار نے نازک اندام لاجونتی کی طرف دیکھا، ہلکے نیلے رنگ کی ساری میں لپٹی ہوئی لاجونتی بالکل چھوئی موئی بنی ہوئی تھی۔ اس نے شرمائی نظروں سے خلجی سردار کی طرف دیکھا۔ اور جیسے ہی دونوں کی نظریں متصادم ہوئیں لاجونتی نے گھبرا کے نظریں جھکا لیں۔

خلجی سردار نے کہا۔ "اے مرد درویش! تیری باتوں میں بڑی مٹھاس ہے۔ مجھے اجازت دے کہ تیرے پاس آتا رہوں اور تیری پُرلطف باتیں سنتا رہوں۔"

پروہت جی نے جواب دیا۔ "سردار! میں نے آپ کو وہ بات بتا تو دی جو ہم دونوں میں عدم مطابقت کا باعث ہے، میں ایک ہندو سنیاسی ہوں اور مجھے بدری ناتھ جی نے غزنی کے لیے روانہ کیا ہے۔ وہاں دس ہزار ہندو سلطان کی فوج میں ملازم ہو چکے ہیں، انھوں نے سلطان کے لیے ہتھیار سجا لیے ہیں۔ میں ان کی ہدایت کے لیے غزنی جا رہا ہوں۔"

خلجی سردار نے کہا۔ "تم جس مقصد سے وہاں جا رہے ہو سلطان اسے پسند ہی نہیں کرے گا۔"

پروہت جی نے نہایت نرمی اور عاجزی سے عرض کیا۔ "میں یہاں کسی سے جھگڑا کرنے تو آیا نہیں۔ میں جو کچھ ہندوؤں سے کہوں گا وہی سلطان سے بھی کہہ دوں گا۔ سلطان کو میری بات سننا چاہیے۔"

لاجونتی نے پروہت جی کو بتایا۔ "گروجی! آپ کے پاٹھ کا وقت آچکا ہے گیتا جی کے پاٹھ کا وقت؟"

لاجونتی نے پروہت جی کے سامنے بھگوت گیتا رکھ دی۔ خلجی سردار نے پوچھا۔ "یہ پاٹھ کتنی دیر کا ہے؟"

پروہت جی نے ناگواری سے کہا۔ "مورکھ! مجھے پریشان نہ کر۔ گیتا جی کا پاٹھ کرنے دے۔"

اب خلجی سردار کے پاس خاموشی کے سوا کوئی چارہ ہی نہ رہا تھا، وہ وہیں ایک طرف بیٹھ گیا۔

خلجی سردار نے پوچھا۔ "کیا میں گیتا سن سکتا ہوں؟"

پروہت جی نے جواب دیا۔ "مگر کیوں؟ بھگوت گیتا تمھاری سمجھ میں بالکل نہیں آئے گی۔"

خلجی سردار کو جب بھی موقع ملتا لاجونتی کی طرف دیکھ لیتا، پروہت جی بھی یہ بات محسوس کر رہے تھے، کہنے لگے۔ "میں جانتا ہوں کہ تم میری گیتا کو بالکل بھی نہیں سمجھ سکو گے لیکن تم اس کو سننا ہی چاہتے ہو تو میں منع بھی نہیں کروں گا مگر آئندہ تم یہاں ہتھیار نہیں لاؤ گے اور اگر ہتھیار لاؤ گے تو میرے پاس نہیں آؤ گے۔"

پروہت جی بھگوت گیتا پڑھنے لگے۔ لاجونتی ان کے پاس بیٹھ گئی۔

خلجی سردار کچھ دیر تو پروہت جی کی گیتا سنتا رہا مگر کچھ پلّے ہی نہ پڑا۔ وہ بہت جلد اکتا گیا، مگر لاجونتی کی کشش اس کو روکے رہی۔ وہ بار بار لاجونتی کو دیکھ لیتا تھا اور پھر اچانک اس طرح اپنی نظریں پھیر لیتا جیسے کسی شے نے اس کو کاٹ لیا ہو یا اچانک اس کی چوری پکڑ لی گئی ہو۔

کچھ دیر بعد پروہت جی نے لاجونتی سے پانی مانگا، وہ پانی لینے چلی گئی تو پروہت جی نے خلجی سردار سے پوچھا۔ "تم یہاں اپنا وقت کیوں ضائع کر رہے ہو؟"

خلجی سردار نے جواب دیا۔ "واہ یہ کس نے کہہ دیا کہ میں اپنا وقت ضائع کر رہا ہوں۔"

لاجونتی پانی لے کر آگئی۔ پروہت جی نے پانی کی لٹیا منہ سے لگالی اور غٹاغٹ پوری لٹیا چڑھا گیا۔ خالی لٹیا لاجونتی کے حوالے کر دی اور کہا۔ "لاجونتی! اب تو جا سکتی ہے جب ضرورت ہو گی دوبارہ آواز دے کر بلا لوں گا۔"

لاجونتی اُتر کے نیچے کھڑی ہو گئی۔ خلجی سردار نے نظروں ہی نظروں میں التجا کی۔ "لڑکی نہ جا یہیں رہ۔"

لیکن لاجونتی اس کی نظروں کے پیغام کو نہیں سمجھ سکی اور وہاں سے چلی گئی۔

پروہت جی گیتا پڑھنے میں مشغول رہے لیکن اتنی ذرا سی دیر میں یہاں جو کچھ بھی خاموشی سے پیش آگیا تھا، پروہت جی اس سے باخبر تھے لیکن خاموش تھے۔

پروہت جی دیر تک بھگوت گیتا کا پاٹھ کرتے رہے، خلجی سردار کو یقین تھا کہ پروہت جی کو وہاں دوبارہ کوئی نہ کوئی ضرورت پیش آئے گی اور لاجونتی کو وہاں پھر آنا پڑے گا لیکن وہ دوبارہ نہیں آئی۔

کئی گھنٹے بعد خلجی سردار نے جانے کی اجازت مانگی۔ "اچھا مرد درویش اب میں جاؤں!"

پروہت جی نے جواب میں کسی خاص جذبے کا اظہار نہیں کیا۔

خلجی سردار چلا گیا۔ پروہت جی اپنی کامیابی پر مسکرائے، انھوں نے لاجونتی کو آواز دی۔ "لاجونتی! وہ سردار چلا گیا اب آجا!"

لاجونتی آگئی، وہ بھی مسکرا رہی تھی۔

پروہت جی نے پوچھا۔ "تو نے کچھ محسوس کیا؟"

لاجونتی نے جواب دیا۔ "ہاں۔ اور اب میں یہ سوچ رہی ہوں، کیا یہ لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں؟"

پروہت جی نے مشورہ دیا۔ "اس سلسلے کو قائم رہنا چاہیے، میں نے خلجی سردار سے اس کے ہتھیار تو لے لیے، بقیہ کام تو کرے گی۔"

لاجونتی نے عرض کیا۔ "میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں گی۔"

پروہت جی نے کہا۔ "میں یہاں وہ زہر پھیلا کے واپس جاؤں گا کہ مسلمان صدیوں بعد بھی کچھ نہیں سمجھ سکیں گے، میں ان کے مزاج کو بدل کے رکھ دوں گا۔"

لاجونتی نے کہا۔ "کیا اس طرح ہم ان کے ساتھ زیادتی نہیں کریں گے؟"

پروہت جی چونک پڑے۔ "لاجونتی! یہ میں کیا سن رہا ہوں، تیرے دل کے کسی گوشے میں خلجی سردار کے لیے ہمدردی کا جذبہ کیوں پیدا ہو گیا؟ کہیں تو میری کری کرائی محنت پر پانی تو نہیں پھیر دے گی؟"

لاجونتی نے جواب دیا۔ "نہیں ایسی کوئی بات نہیں پروہت جی۔ آپ میری طرف سے مطمئن رہیں۔"

پروہت جی نے کہا۔ "ہاں کیوں کہ اس لڑائی میں جیت ہماری ہی ہونا چاہیے۔"

لاجونتی نے یقین دلایا۔ "جیت آپ ہی کی ہو گی۔"

پروہت جی نے سکھ کا سانس لیا اور اسی وقت ایک نیا فیصلہ کر دیا۔ انھوں نے میر کارواں کی طرح اعلان کر دیا۔ "سفر جاری رکھا جائے۔ ہم آگے جائیں گے۔" چنانچہ رات کے اندھیرے میں خیمے اکھاڑ لیے گئے اور یہ مختصر قافلہ یہاں سے آگے بڑھ گیا۔

★

آس پاس کی بستیوں کو اس قافلے کے بارے میں معلوم ہو چکا تھا کہ ان کے پاس دیوتاؤں کے نام کے سوا کوئی بھی قیمتی چیز نہیں۔ ان لوگوں نے نصف شب سے ذرا پہلے سفر شروع کیا تھا اور صبح تک یہ سفر جاری رہا۔ چنانچہ یہ اپنی پچھلی منزل سے خاصے دور نکل آئے۔

دوسرے دن خلجی سردار جب پڑاؤ پر پہنچا تو وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ آس پاس والوں نے بتایا کہ قافلہ رات ہی کو وہاں سے چلا گیا۔ خلجی سردار کو غصّہ تو بہت آیا کہ اپنے کوچ کا ذکر پروہت نے کل ہی کیوں نہیں کر دیا تھا۔

یہ خلجی سردار غزنوی دربار میں ملازم تھا اور یہاں اپنے گھر پر کچھ وقت گزارنے آیا تھا۔ ابھی اسے بیس دن اور اپنے کنبے میں رہنا تھا لیکن پروہت جی اور لاجونتی نے اس کے منصوبے میں تبدیلی کر دی اور خلجی سردار بیس دن پہلے ہی غزنی روانہ ہو گیا۔

شام سے پہلے ہی اس نے پروہت جی کو پکڑ لیا۔ یہاں پروہت جی ایک خشک ندی کے کنارے پر پڑاؤ ڈالے ہوئے

تھے۔ یہ خشک ندی ایک باغ کے پاس سے گزر رہی تھی۔

پروہت جی کے ایک چیلے نے خلجی سردار کی آمد سے پروہت جی کو مطلع کیا۔

خلجی سردار نے اپنے گھوڑے کو ایک درخت سے باندھ دیا اور خود پروہت جی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ سورج مغرب میں جھکا ہوا تھا۔ خلجی سردار کا سایہ پروہت جی کے قدموں میں پڑ رہا تھا۔

پروہت جی نے خلجی سردار پر سرسری نظر ڈالی اور پوچھا۔

"کہو سردار کیسے آنا ہوا؟"

خلجی سردار نے شکایت کی "اے مردِ دین دار! تو نے ہمیں یہ نہیں بتایا تھا کہ تو وہاں سے چل پڑے گا۔"

پروہت جی نے جواب دیا "میں نے یہ بھی تو نہیں کہا تھا کہ وہیں ٹھہرا رہوں گا۔"

خلجی سردار نے غم و غصے کا اظہار کیا "میں خاصا پریشان ہوا اور مجھے بھاگم بھاگ یہاں آنا پڑا۔"

پروہت جی نے بے نیازی سے پوچھا "سردار! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ بھاگم بھاگ یہاں کیوں آئے ہیں؟"

خلجی سردار کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ کن انکھیوں سے آس پاس لاجونتی کو تلاش کر رہا تھا۔

پروہت جی نے خلجی سردار کے جسم پر ہتھیار سجے دیکھے، تلوار نیام میں پہلو سے لٹکی ہوئی تھی اور کمان شانے سے پھنسی تھی، ترکش بائیں طرف پشت پر لٹکی ہوئی تھی۔ پروہت جی نے پوچھا۔

"سردار! کیا تو کسی سے جنگ کرنے نکلا ہے؟"

خلجی سردار نے جواب دیا "نہیں، میں کسی سے جنگ کرنے نہیں نکلا، دراصل میں کچھ عرصہ اپنے کنبے میں رہنا چاہتا تھا لیکن آپ کی وجہ سے میں بیس دن پہلے ہی غزنی کے لیے چل پڑا۔ میں دربارِ غزنی میں ملازم ہوں۔"

پروہت جی نے پھر وہی اعتراض کیا "کیا میں نے تجھ کو یہ نہیں بتا دیا تھا کہ ہم درویش لوگ ہتھیاروں سے نفرت کرتے ہیں اور ہمارے پاس ہتھیاروں میں آنا منع ہے۔"

خلجی سردار نے جواب دیا "لیکن میں غزنی جا رہا ہوں اور پُرخطر راستوں کو ہتھیاروں کے بغیر نہیں طے کیا جا سکتا۔ اس لیے میں ہتھیاروں کے ساتھ سفر کرنے پر مجبور ہوں۔"

پروہت جی عالمانہ انداز میں گویا ہوئے "انسان اور ہتھیار ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔ انسانوں نے جنگلوں سے دور بستیاں آباد کی ہیں اور اس کو پیدا کرنے والے نے درندوں جیسے ناخن اور دانت بھی نہیں دیے۔ پھر یہ اپنے ہی ہم جنس کا شکار کیوں کرتا ہے۔ درندے جب کسی جاندار کو مارتے ہیں تو اسے وہ خوراک کے طور پر استعمال میں لاتے ہیں لیکن انسان، جب تم کسی انسان کو مارتے ہو تو اس کو کھاتے بھی نہیں۔ پھر یہ خون خرابہ کیوں؟"

خلجی سردار لاجواب ہو گیا۔ وہ پروہت جی کی عالمانہ باتوں سے بہت متاثر ہوتا جا رہا تھا۔

پروہت جی نے نفرت آمیز لہجے میں کہا "بہرحال یہ طے ہے کہ میں اپنی سبھا میں ہتھیار والوں کو نہیں آنے دوں گا۔"

خلجی سردار نے جواب دیا "سپاہ گری میرا آبائی پیشہ ہے۔ یہی میری روزی ہے۔ میں ہتھیاروں کو کس طرح چھوڑ سکتا ہوں!"

پروہت جی نے کہا "میں یہ کب کہہ رہا ہوں کہ تو سپاہ گری چھوڑ دے اور ہتھیاروں کو کہیں پھینک دے۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ تو مجھے چھوڑ دے۔ ہم عدم تشدد کے لوگ تم تشدد والوں کے ساتھ کس طرح رہیں گے۔"

خلجی سردار نے کہا "مجھے کچھ سوچنے کا موقع دو اے دین دار بزرگ!"

پروہت جی نے اس کے لیے مرگ چھال بچھا دی۔

خلجی سردار اس پر بیٹھ گیا اور مرگ چھال کو ناخن سے کرید کرید کر دیکھنے لگا۔

پروہت جی نے پوچھا "یہ کیا کر رہا ہے تُو، اس طرح تو میری مرگ چھالا کے بال جھڑ جائیں گے، اور یہ خراب ہو جائے گی۔"

خلجی سردار نے پوچھا "یہ ہرن کی کھال آپ کو کہاں سے مل گئی ہے؟"

پروہت جی نے جواب دیا "ہمارے رحبــــ ی تھی میں نے یہ مرگ چھالا۔"

خلجی سردار نے کہا "لیکن اے مردِ دین دار! یہ تو ہرن کی کھال ہے، آپ تو درندگی سے نفرت کرتے ہیں پھر یہ جانور کی کھال کا اوڑھنا پچھانا کیوں ہے؟"

پروہت جی نے جواب دیا "مورکھ! ایک وہ انسان تھا جس نے ہرن کو ہلاک کیا ہو گا اور اس کی کھال اتار کے اس کا ماس کھا گیا ہو گا اور ایک میں ہوں کہ اس کی کھال کو سینے سے لگائے پھر رہا ہوں۔ اس پر بیٹھتا ہوں، سوتا ہوں، جاگتا ہوں، اس کو کام میں لاتا ہوں۔"

خلجی سردار ایک بار پھر لاجواب ہو گیا۔

پروہت جی نے لاجونتی کو آواز دی، جب وہ سامنے آئی تو پروہت جی نے خلجی سردار کی طرف اشارہ کیا "یہ ہمارا مہمان ہے اور یہ بھی غزنی ہی جا رہا ہے۔ اس کے لیے کوئی روکھی پھیکی چیز لاؤ۔ شاید یہ بھوکا ہو گا۔"

لاجونتی واپس گئی اور کچھ دیر بعد بھنے ہوئے چنے خلجی سردار کے سامنے رکھ دیے۔

پروہت جی نے کہا "سردار! تُو یہ چنے کھا سکتا ہے، ہم سنیاسی لوگ مزے دار کھانے نہیں کھاتے، جو خود کھاتے ہیں وہی مہمانوں کو کھلاتے ہیں۔"

خلجی سردار اس چیز کا عادی نہیں تھا لیکن یہ بھُنے ہوئے چنے لاجونتی لائی تھی۔ اس لیے کھانے لگا اور یہ چنے اس کو بہت اچھے لگے۔

پروہت جی نے کہا "انسان کو آگ نے بہت زیادہ خراب کیا ہے۔ جب تک آگ سے انسان واقف نہیں تھا، اس کی گزر بسر اناج اور پھلوں پر ہوا کرتی تھی لیکن پھر آگ کا علم حاصل ہوا تو انسان نے چیزوں کو پکا پکا کر کھانا شروع کر دیا۔ اس کا مضبوط معدہ کمزور ہوتا چلا گیا اور بیماریوں نے اس کے شریر میں اپنا گھر بنا لیا اور میں تو یہاں تک کہوں گا کہ جب تک انسان نے آگ پر پکے ہوئے کھانے نہیں کھائے تھے، اس کے حواس بھی بہت صحیح کام کیا کرتے تھے لیکن آگ نے کھانے پینے کی اشیائے کے جوہروں کے ساتھ ہی انسانوں کے حواس بھی جلا دیے اور یہ کمزور اور بیکار ہوتا چلا گیا۔"

خلجی سردار، پروہت جی کے زیرِ اثر ہوتا چلا گیا۔ یہ باتیں اس نے پہلی بار سنی تھیں اور ان باتوں میں وزن بھی بہت تھا۔ اس نے کہا "اے دین دار بزرگ! میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اتنی عاقلانہ باتیں پہلے کسی سے نہیں سنی تھیں۔ اللہ نے آپ کو بڑی عقل دے رکھی ہے۔"

لاجونتی، پروہت جی کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ خلجی سردار جب بھی موقع ملتا اس کی طرف دیکھ لیتا تھا۔

پروہت جی نے پوچھا "تو سلطان کی فوج میں کیا کرتا ہے؟"

خلجی نے جواب دیا "میں ہزار سواروں کا سردار ہوں اور اکثر و بیشتر جنگوں میں مار کاٹ کیا کرتا ہوں۔"

پروہت جی نے افسوس کرتے ہوئے کہا "تو بھی کیا کرے، تو جس ملک اور جس ماحول میں پیدا ہوا، وہاں یہی کچھ ہو رہا تھا۔ تو نے بھی وہی کیا جو تیرے باپ دادا کرتے رہے ہوں گے۔ انسان بندروں کی طرح نقال ہوتا ہے، جو کچھ دوسروں کو کرتے دیکھتا ہے وہی خود کرنے لگتا ہے لیکن ان میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اپنے ماحول اور اپنے باپ دادا کے علاوہ بھی دیکھ لیتے ہیں اور وہ نہیں کرتے جو اُن کا ماحول اور پیش رو کر چکے ہوتے ہیں بس یہی کامیاب لوگ ہوتے ہیں۔"

خلجی سردار نے ایک بار پھر لاجونتی کی طرف دیکھا۔

پروہت جی نے لاجونتی کو حکم دیا "تو یہاں کیوں بیٹھی ہے؟ یہاں سے جاتی کیوں نہیں ہے؟"

لاجونتی گھبرا کے کھڑی ہو گئی۔

خلجی سردار کے دل پر چوٹ سی لگی۔ بے اختیاری سے کہا۔ "آپ اس کو بھگا کیوں رہے ہیں۔ اس کو یہیں بیٹھا رہنے دیں۔ آپ کی مزے دار باتیں اس کو بھی اچھی لگ رہی ہوں گی۔ اس کو بھی اپنی باتیں سننے دیں۔"

لیکن پروہت جی نے لاجونتی کو سامنے سے ہٹا دیا اور خلجی سردار کو سمجھانے لگا "یہ ناری جس کو تم عورت کہتے ہو، ہم دیندار، سنیاسی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کے زیادہ گناہ اس کی وجہ سے سرزد ہوتے ہیں، انسان ناری جال میں بہت آسانی سے پھنس جاتا ہے، مکتی یعنی نجات کے لیے ضروری ہے کہ انسان ناری جال میں نہ پھنسے۔"

خلجی سردار کو پروہت جی کی یہ بات اچھی نہیں لگی۔ بولا، "لیکن اے دیندار بزرگ! عورت کے بغیر تو زندگی ادھوری رہتی ہے اور عورت انسان کا نصف ہوتی ہے، کیا اس کے بغیر یہ دنیا چل سکتی ہے۔ کیا اس کے بغیر مرد زندہ رہ سکتا ہے؟"

پروہت جی نے جواب دیا "کیوں نہیں رہ سکتا۔ عورت کے بغیر بھی مرد رہ سکتا ہے۔ دنیا کو چھوڑ دو، ناری بھی تم سے دور ہو جائے گی اور پھر دیکھنا کہ تمھیں کتنی سچی خوشی حاصل ہوتی ہے۔"

خلجی سردار نے کہا "بہرحال آپ کی یہ بات ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

پروہت جی نے جواب دیا "مت گھبرا۔ میں جلد ہی یہ بات تجھ کو سمجھا دوں گا۔"

اب خلجی سردار بھی غزنی جا رہا تھا۔ پروہت جی کو اس پر اعتراض تھا۔ وہ ایک ہتھیار بند مسلمان کو اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے تھے۔

خلجی سردار ایک جنگ جو اور نبرد آزما مزاج کا حامل تھا۔ وہ زیادہ ہیر پھیر کا قائل نہیں تھا۔ پروہت جی کی باتیں اس کے دل و دماغ پر اثر ضرور کر رہی تھیں مگر ان کا اثر دیرپا نہیں تھا۔ اگر بیچ میں لاجونتی نہ ہوتی تو خلجی سردار، پروہت جی کو اتنا منہ بھی نہ لگاتا۔

خلجی سردار نے پروہت جی کو ایک حقیقت سے روشناس کرایا "اے مردِ دین دار! یہ نہ بھولیں کہ آپ غزنی جا رہے ہیں۔ وہاں آپ اجنبی ہوں گے اور وہاں میری آپ کو ہر وقت ضرورت پیش آئے گی۔"

پروہت جی نے جواب دیا "سردار! یہ تو کیسی باتیں کر رہا ہے، ہم سنیاسی لوگوں سے۔ ہماری ضرورتیں نہ ہونے کے

ابد ہیں۔ دربار سرکار سے ہمارا واسطہ نہیں رہتا۔ پھر میں تیری ضرورت کیوں محسوس کروں گا۔"

خلجی سردار نے لاجونتی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "کیا مجھے پانی مل سکتا ہے؟"

پروہت جی نے اپنے ایک چیلے کو آواز دی "شیوچرن! ذرا اس ترک کو پانی تو پلانا۔"

خلجی سردار نے اعتراض کیا "آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ جب لاجونتی پاس ہی موجود ہے تو کسی دوسرے کو آواز کیوں دے رہے ہیں آپ؟"

پروہت جی نے بُرا سا منہ بنایا "ایک تو تُو باتیں بہت کرتا ہے۔ زیادہ باتیں نہ کیا کر۔ اس سے میرے گیان دھیان پر بُرا اثر پڑتا ہے۔"

شیوچرن لٹیا میں پانی لے آیا اور خلجی سردار سے پوچھا۔ "کوئی پیالا ہے تمھارے پاس؟"

خلجی سردار نے جواب دیا "میرے پاس کوئی پیالا نہیں۔" لٹیا کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "لاؤ اسی میں پی لوں گا۔"

شیوچرن نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا، کہنے لگا "اس طرح تو میری لٹیا ناپاک ہو جائے گی۔ ہاں اگر کوئی برتن نہیں ہے تو چُلّو سے پی لو۔"

خلجی سردار، شیوچرن کا حیرت سے منہ دیکھنے لگا اور پروہت جی سے پوچھا "بزرگوار! آپ کا یہ شاگرد کیسی باتیں کر رہا ہے؟ یہ کیا کہہ رہا ہے؟"

پروہت جی نے جواب دیا "یہ جو کچھ کہہ رہا ہے سچ کہہ رہا ہے۔ ہم لوگ کھانے پینے میں اپنے الگ برتن رکھتے ہیں۔ اگر تو پانی پینا چاہتا ہے تو چلّو سے پی سکتا ہے۔"

خلجی سردار نے اپنے سامان میں سے خود نکالا اور اس میں پانی انڈیل کر پینے لگا۔

لاجونتی، خلجی سردار کی جرأت اور بے باکی سے متاثر ہوئی۔ یہ کردار ہندوؤں میں کہیں نہیں نظر آتا تھا۔

خلجی سردار نے ان کے قریب ہی قیام کیا لیکن پروہت جی نے اس کو زیادہ قریب نہیں آنے دیا۔

لاجونتی نے دوسری لڑکیوں سے خلجی سردار کے بارے میں باتیں کیں، اس نے اپنی قوم میں ایسے جوان نہیں دیکھے تھے۔

پروہت جی ایک لائق استاد کی طرح اپنے چیلوں کو صبح شام درس دیا کرتے تھے۔ لڑکیوں کو جو درس دیا جاتا تھا، وہ اس سے مختلف ہوتا تھا۔

یہ سب ایک دن قیام کے بعد غزنی روانہ ہو گئے۔

سلطان کو ان کی آمد کی خبریں پہلے ہی پہنچ چکی تھیں۔ چنانچہ پروہت جی جیسے ہی غزنی میں داخل ہوئے، انھیں مطلع کیا گیا کہ کہیں جانے یا آباد ہونے سے پہلے ان سب کا سلطان سے ملاقات کرنا ضروری ہے۔

لیکن پروہت جی، سلطان سے نہیں ملنا چاہتے تھے۔ انھوں نے صاف صاف کہہ دیا "بابا، ہم سنیاسی لوگ سلطان کے دربار میں جا کے کیا کریں گے؟"

خلجی سردار نے پروہت جی کو سمجھایا "آپ کا سلطان کے دربار میں جانا اس لیے ضروری ہے کہ یہ پابندی سلطان کی طرف سے عائد کی گئی ہے۔"

پروہت جی کو اندیشہ تھا کہ کہیں اس کو وہاں پہچان نہ لیا جائے، کہنے لگا "اگر ہمیں مجبور کیا جائے گا تو سلطان سے بھی مل لیں گے۔"

خلجی سردار نے اس کو دلاسا دیا "بزرگوار! مت گھبرائیں، میں آپ کے ساتھ چلوں گا اور سلطان کو سمجھاؤں گا کہ یہ سنیاسی اور دیندار لوگ بالکل بے ضرر ہیں، ان کو ستایا نہ جائے۔"

چنانچہ ان سب کو شام کے بعد چراغوں کی روشنی میں سلطان کے پاس پہنچا دیا گیا، پروہت جی کے ساتھ خلجی سردار بھی تھا۔

سلطان کے دربار میں جو لوگ موجود تھے، ان میں ایک بھی ایسا نہیں تھا جس سے یہ لوگ واقف ہوتے۔

سلطان نے خلجی سردار کو ان کے ساتھ دیکھا تو پوچھا۔

"کیا بات ہے نورالدین؟ تو اور ان کے ساتھ؟ خیریت تو ہے؟"

خلجی سردار نورالدین نے جواب دیا "سلطانِ محترم! یہ درویش لوگ ہیں۔ انھوں نے یہاں آتے ہوئے میرے قصبے میں قیام کیا تھا، یہ سب بہت اچھے لوگ ہیں۔"

سلطان نے پروہت جی سے پوچھا "تیرے ساتھ کُل کتنے آدمی ہیں؟"

پروہت نے جواب دیا "صرف بارہ آدمی، میں خود، میرے چھ چیلے اور پانچ دیوداسیاں۔"

سلطان نے پروہت جی سے پوچھا "تو یہاں کیوں آیا ہے اور یہاں اِن دیوداسیوں کا کیا کام؟"

پروہت جی نے جواب دیا "سلطان کے انصاف اور نیکی کے بڑے شہرے ہیں، میری قوم کے دس ہزار سپاہی غزنی میں موجود ہیں۔ ان کو میری ضرورت پیش آئے گی بس یہی سوچ کر چلا آیا اور یہ دیوداسیاں! یہ تو ہیں ہی دیو کی داسیاں۔"

سلطان نے پروہت جی سے زیادہ سوالات نہیں کیے اور ان کو ہندوؤں کی آبادی میں رہ بس جانے کی اجازت دے دی۔

اور نورالدین خلجی سردار کو تخلیے میں تنبیہ کی "جب تو اس ہندو درویش سے اچھی طرح واقف نہیں تو تُو اس کی تعریفیں کیوں کر رہا تھا؟"

نورالدین نے جواب دیا "سلطانِ محترم! میں نے اس درویش سے اچھی اچھی باتیں سنیں۔ حرص و طمع اسے چھو کر بھی نہیں گیا۔ بس انھی خوبیوں نے مجھے اس کا مداح بنا دیا۔"

سلطان نے خلجی سردار کو نصیحت کی "کسی شخص کی اچھائی برائی کو اس کی باتوں سے نہیں جانچا جاتا۔ اس کے عمل اور کردار کو دیکھا جاتا ہے۔ اس ہندو درویش کو بھی اس کسوٹی پر کس کر دیکھا جائے گا تو اس کی اصلیت اور حقیقت کا پتا چلے گا۔"

خلجی سردار نے عرض کیا "میں اس طرح بھی اس ہندو درویش کو پرکھوں گا۔"

سلطان مسکرانے لگا "اوّل تو یہ تیرا کام ہی نہیں کہ تو لوگوں کی اچھائی بُرائی کی جستجو کرتا پھرے۔ یہ کام میرا ہے اور میرے پاس ایسے آدمی موجود ہیں جو مجھے اس ہندو درویش کے بارے میں صحیح معلومات فراہم کر دیں گے، تجھ کو اس ہندو درویش سے دور دور رہنا چاہیے کیونکہ وہ درویش اپنے ساتھ پانچ انگارے بھی رکھتا ہے اور یہ انگارے کسی بھی مرد کو جلا سکتے ہیں۔"

سلطان کو ہندوستان کے ان حکمرانوں کے دماغ درست کرنے تھے جو ماضی میں آنند پال کی مدد کرتے رہے تھے۔ ان میں تھانیسر، متھرا، دہلی اور قنوج سرِفہرست تھے۔ اس لیے وہ اپنے سرداروں کو اپنی اولاد کی طرح نظر میں رکھتا تھا۔

پروہت جی کو ہندوؤں کی بستی میں ایک مکان دے دیا گیا۔ پروہت جی اور ان کے ساتھیوں کے لیے یہ جگہ مناسب تھی۔ خلجی سردار اس بستی میں ان سے ملنے گیا۔ اس وقت بھی تلوار اس کے ساتھ تھی۔ پروہت جی نے اس تلوار پر پھر اعتراض کیا "خلجی سردار! تو کیسا سردار ہے کہ کوئی بات یاد ہی نہیں رکھتا۔"

خلجی سردار نے پوچھا "کون سی بات؟"

پروہت جی نے جواب دیا "میں ان لوگوں سے نہیں ملتا، جن کے پاس ہتھیار ہوتے ہیں۔ میں ہتھیاروں سے نفرت کرتا ہوں۔"

خلجی سردار نے کہا "بزرگ درویش! مجھ پر اس قسم کی پابندیاں نہ لگائیں۔ یہ غزنی ہے اور غزنی میں صرف مسلمان رہتے ہیں۔ ہتھیار اور مسلمان لازم و ملزوم ہیں۔ اگر آپ نے ہم پر یہ پابندی لگائی تو ایک نہ ایک دن آپ اکیلے بالکل تنہا رہ جائیں گے۔"

پروہت جی نے کہا "میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ میں تنہا رہ جاؤں۔"

خلجی سردار نے کہا "آپ تنہا رہ جائیں، آپ اکیلے رہ جائیں لیکن ذرا یہ تو بتائیں کہ کیا آپ ہی کی طرح آپ کے ساتھی بھی سوچتے ہیں؟"

پروہت جی نے جواب دیا "ہاں، وہ سب میری ہی طرح سوچتے ہیں خلجی سردار! تو میری باتیں غور سے نہیں سن رہا ہے۔ میں تجھ کو کس طرح سمجھاؤں کہ میں ہتھیاروں سے نفرت کرتا ہوں اور میں اپنی قوم کے دس ہزار جوانوں کو یہی بتلانے آیا ہوں کہ یہ جنگ و جدل کی زندگی چھوڑ دو اور امن و آشتی کی راہ اختیار کرو۔"

خلجی سردار نے پوچھا "آپ کا کیا خیال ہے، کیا آپ کی ان باتوں کا کوئی ایسا اثر ہو سکتا ہے کہ آپ کی قوم ہتھیار پھینک کر آپ کی طرح ایک گوشے میں بیٹھ جائے۔"

پروہت جی مایوس نہیں تھے کہنے لگے "میں یہاں آیا تو ہوں اپنی قوم کے جوانوں کے لیے، لیکن چونکہ میرا پیغام انسانوں کے لیے ہے اس لیے میری باتوں میں جو بھی دلچسپی لے گا، وہی میرا مخاطب ہو گا۔ میں جنگ و جدل کی دنیا میں امن و آشتی کا پیغام لے کر آیا ہوں۔"

خلجی سردار نے کہا "بہرحال میں تو ہتھیاروں کے ساتھ

ہی آؤں گا اور آپ کو یہ رعایت دینا پڑے گی مجھ کو۔"

لیکن پروہت جی نہیں پسیجے، کہنے لگے "خلجی سردار! تجھ کو بھی میری باتیں توجہ سے سننا پڑیں گی اور ان پر عمل بھی کرنا ہوگا۔"

خلجی سردار کہنے لگا "ناممکن، بہرحال آپ اپنی کوششیں کرتے رہیں اور میں اپنی روش پر چلتا رہوں۔"

پروہت جی نے اس وقت زیادہ باتیں نہیں کیں اور خلجی سردار کو حکم دیا کہ وہ چلا جائے اور آئندہ جب بھی آئے ہتھیاروں کے بغیر آئے۔

پروہت جی کی دیوداسیاں یہاں ہر طرف ہتھیاروں کی نمائش دیکھ رہی تھیں، یہ ماحول تھانیسر کے مندر کے ماحول سے یکسر مختلف اور متضاد تھا۔ یہاں انھوں نے مسلمانوں کو قطاروں میں کھڑے نمازیں پڑھتے دیکھا۔ ان کو اس سیدھی سادی عبادت میں مزہ نہیں آتا تھا۔ اور پروہت جی ہندوؤں کو اندر ہی اندر یہ باور کرا رہے تھے کہ یہاں تم کس کے لیے آئے ہو؟ کیا سلطان کے لیے جو ہندوستان کی ہندو حکومتوں کو ختم کرنے کے درپے ہے۔ مسلمانوں کی مدد کے لیے جو اژدہے کی طرح دوسرے دھرموں کو نگلتے چلا جا رہا ہے۔ تم کو یہاں نہیں آنا تھا۔

ہندوؤں نے اپنے گھروں میں مورتیاں رکھ لی تھیں اور وہیں انفرادی طور پر ان کی پرستش کیا کرتے تھے، پروہت جی ان اندرون خانہ مندروں کی طرف اشارے کرتے ہوئے کہتے "کیا اسی طرح عبادت کی جاتی ہے۔ تم سب معاشی آسودگی کے ہاتھوں مسلمانوں کے غلام ہو گئے ہو، میں تم سب سے درخواست کرتا ہوں کہ اب بھی وقت ہے، ہوش میں آ جاؤ اور آنکھیں کھول کر دیکھو کہ کون کیا ہے؟ اور کون کیا کر رہا ہے۔

سیناپتی اور تربھون نے پروہت جی کی مخالفت شروع کر دی، سیناپتی نے کہا "پروہت جی! آپ یہاں نفرتوں کے بیج نہ بوئیں تو اچھا ہے۔ اگر یہ خبریں سلطان کے کانوں تک پہنچ گئیں تو ہم سب کے لیے مشکلیں پیدا ہو جائیں گی۔"

تربھون نے کہا "ہندو مسلم اتحاد کی جو شکل غزنی میں ہے اس کو قائم اور برقرار رہنا چاہیے۔"

پروہت جی نے جواب دیا "میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ اتحاد و یگانگت کا مثالی ماحول بن جائے غزنی کا لیکن یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آتی، عجیب نفسا نفسی اور خود غرضی کا عالم ہے یہاں۔"

سیناپتی نے پروہت جی کی تردید کر دی "آپ یہ نہیں چاہتے، آپ یہاں انتشار پھیلانے آئے ہیں اور میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔"

پروہت جی کو یہاں آنے سے پہلے یہ اندازہ نہیں تھا کہ غزنی میں ہندو بھی ان کی مزاحمت کریں گے۔ وہ تو یہاں ایک جنگجو قوم کو بکری بنانے آئے تھے۔ لیکن یہاں آ کے یہ معلوم ہوا کہ یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا بظاہر نظر آ رہا تھا۔

سیناپتی نے پوچھا "پروہت جی آپ کیا سوچ رہے ہیں؟"

پروہت جی مسکرانے لگے، بولے "میں کیا سوچوں گا۔ میں تو یہاں اس لیے آیا تھا کہ اپنے ہندو بھائیوں کی خدمت کروں اور انھیں یہ یاد دلاتا رہوں کہ وہ ہندو ہیں اور ہندو ہی رہیں گے، ان کو اپنے دھرم پر قائم رہنا اور دھرم کو قائم رکھنا ہے۔ مسلمان ایک جنگجو اور چالاک قوم ہے۔ سلطان دس ہزار ہندوؤں کو ہندوستان لے جائے گا اور ہندوؤں کے مقابلے میں ہندو فوج کام میں لائے گا۔ نتیجتاً دونوں طرف ہندو ہی کام آئیں گے۔ میرے خیال میں ایسا نہیں ہونا چاہیے۔"

سیناپتی نے پروہت جی کا مذاق اڑایا "پروہت جی! یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ سلطان نے ہمیں اپنی فوج میں جگہ دی۔ اگر ہندو اتنے ہی بہادر اور جنگجو ہوتے تو سلطان کو بار بار فتح حاصل نہ ہوتی۔ سلطان نے ہندوؤں کو بار بار شکست دی ہے، ہمیں تو سلطان نے اپنی فوج میں شامل کر کے آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ ہم لوگ تربیت کے عبوری دور سے گزر رہے ہیں۔ ہمیں سلطان اور مسلمانوں سے بہت کچھ حاصل کرنا ہے ابھی۔"

پروہت جی کے دل و دماغ پر مایوسیاں یورش کرنے لگیں "سیناپتی جی! اگر تم سلطان اور مسلمانوں سے اتنے متاثر اور مرعوب ہو چکے ہو تو میری بھی ایک بات مان لو۔"

سیناپتی نے پوچھا "یعنی! میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟"

پروہت جی نے جواب دیا "میں تیرے معاملات میں کوئی دخل نہ دوں گا تو بھی وعدہ کر کہ میرے معاملات میں کوئی دخل نہ دے گا۔"

سیناپتی نے کہا "میں آپ کے معاملات میں کیوں دخل دوں گا۔ لیکن یہ یاد رہے کہ یہاں آپ جو کچھ بھی کریں، اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہ ہو۔"

پروہت جی نے نہایت آسانی سے وعدہ کر لیا۔ "میں تو تجھ سے یہ بھی نہ پوچھوں گا کبھی کہ تو کر کیا رہا ہے۔"

سیناپتی نے کچھ اور رعایت دی "میری طرف سے آپ کو یہ بھی اجازت ہے کہ آپ ہندوؤں میں دھرم کو زندہ رکھنے کی کوششیں کرتے رہیں، ہم ہندو ہیں اور یہی ہماری شناخت اور ہماری پہچان ہے۔"

پروہت جی کو سیناپتی کی اس سوچ سے بڑی خوشی ہوئی۔ "وہی تو میں سوچ رہا تھا کہ آخر تو کیسا ہندو ہے کہ تجھ کو اپنے دھرم کا کوئی خیال کوئی احساس تک نہیں۔"

سیناپتی نے کہا "میں ہندو دھرم سے نہیں وہاں کے راجاؤں سے متنفر ہوں۔ اگر مجھے سلطان نے ان کے مقابلے پر لے جا کر کھڑا کر دیا تو میں ان سے جنگ ضرور کروں گا۔ میں ان کو معاف نہیں کروں گا، ہمیں اپنا وقار عزیز ہے۔"

پروہت جی نے سیناپتی کو سمجھانا چاہا "دیکھ میری باتیں دھیان سے سن، یہ مسلمان ہندو دھرم کے لیے مستقل خطرہ ہیں، ہندو قوم سبزیاں کھاتی ہے اور مسلمان گوشت خور ہیں، ان کو غصہ بھی بہت آتا ہے اور ہندو ٹھنڈے دل و دماغ کا ہوتا ہے۔ پتا نہیں تجھ میں اپنے دھرم کے لیے غیرت ہے یا نہیں، بہرحال مجھ میں تو ہے اور میں اپنے دھرم کے لیے کوئی ایسا کام کر جانا چاہتا ہوں کہ اس کا فائدہ میری نسلیں اٹھائیں۔"

سیناپتی نے جواب دیا "لیکن ہم لوگ ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ ہم نے سلطان کا نمک کھایا ہے اور نمک حرامی نہیں کر سکتے۔"

پروہت جی نے درخواست کی "سلطان پتا نہیں کب ہندوستان پر حملہ آور ہو جائے۔ تجھ کو اس کی پہلے سے خبر ہو جائے گی، میری تجھ سے یہ درخواست ہے کہ سلطان جب بھی کوئی ایسا منصوبہ بنائے تو اس کی اطلاع مجھے ضرور دے دے۔"

سیناپتی نے وعدہ کر لیا۔ پروہت جی رام جاپ میں کچھ اس طرح مشغول ہوئے کہ کہیں اور کا خیال ہی دل سے نکال دیا۔

جس مکان میں پروہت جی ٹھہرے ہوئے تھے اس کے ایک دیوان نما کمرے میں پروہت جی اپنے ارادت مندوں کو جمع کر کے اپنے دھرم کی یا پھر اہنسا پرمو دھرما، پر تقریر کرتے رہتے تھے۔ لوگ ان تقریروں میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ جب پروہت جی دھرم پر تقریر کر رہے ہوتے تو پانچوں دیوداسیاں سامعین کی خدمت کے لیے مستعد اور چوکس کھڑی رہتیں۔

★

سلطان ایک سال غزنی میں رہا اور ہندوستان کے ان شہروں کے بارے میں معلومات اکٹھی کرتا رہا جو ہمیشہ آنند پال کو پشاور پر حملے کی ترغیب دیا کرتے تھے۔ ان میں تھانیسر کا نام سرفہرست تھا۔ ہندوستان میں اس کے جاسوس اور مخبر، سلطان کے لیے کارآمد خبریں جمع کر کے غزنی بھیج رہے تھے انھی خبروں میں یہ خبر بھی تھی کہ تھانیسر کا راجا آنند پال سے مایوس ہو کر کسی دوسرے راجا کو حملے پر اکسا رہا ہے اور جس دن بھی تھانیسر کوئی عظیم الشان لشکر تیار کرنے میں کامیاب ہو گیا، پشاور یا غزنی پر حملہ آور ہو جائے گا۔

سلطان نے اپنے مشیروں کی خفیہ مجلس میں یہ خبریں ان کے سامنے رکھ دیں اور پوچھا "بتائیں کہ اب ہم کیا کریں؟"

ان مشیروں میں تربھون اور سیناپتی بھی شامل تھے، سلطان کا وزیر خواجہ احمد بن حسن میمندی یہ حق رکھتا تھا کہ سب سے پہلے اپنی رائے دے لیکن ہر کوئی یہ جانتا تھا کہ سلطان ہر کام دوسروں سے مشورہ لینے کے باوجود اپنی مرضی سے کرتا ہے۔ خواجہ میمندی خوب جانتا تھا کہ پشاور اور ویہند کی جنگوں کے مقابلے میں تھانیسر کی جنگ اپنے مضمرات میں کچھ اور ہی حیثیت رکھتی ہے۔ پشاور اور ویہند سرحدی مقام تھے اور تھانیسر دہلی سے ستر میل دور ہندوستان کے اندر واقع ہے اور اگر سلطان تھانیسر پر حملہ آور ہوا اور ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے تو وہاں سے واپسی کس طرح ہو گی، خواجہ میمندی کوئی رائے دینے میں جھجک رہا تھا۔ اس نے نہایت عقل مندی سے کہا "سلطان کو یہ مشورہ ان لوگوں سے لینا چاہیے جو جنگوں کا وسیع تجربہ رکھتے ہوں اور ہندوستان کی طبعی اور انتظامی معلومات سے بہرہ ور ہوں، ابو علی کرمانی، ارسلان جاذب، عبداللہ طائی اور ان جیسے کئی اور ہیں جو مجھ سے بہتر مشورے دے سکتے ہیں۔"

لیکن یہ فوجی ماہر بھی کوئی مشورہ دیتے ہوئے گھبرا رہے تھے تھانیسر تک جانا اور کامیاب اور کامران واپس آنا ایک خطرناک مہم جوئی تھی، ارسلان جاذب نے کہا "جب تک ہمیں یہ معلوم ہو کہ تھانیسر کی اپنی فوج کتنی ہے اور اس کی مدد کے لیے کون کون کتنی کتنی فوج لے کر آئے گا اور یہ کہ اس مہم میں آنند پال کی کیا حیثیت ہو گی۔ کوئی مشورہ کس طرح دیا جا سکتا ہے۔"

سلطان نے عبداللہ طائی کی طرف دیکھا "یہ حملہ کب

ہوگا اور حملہ آوری کے دنوں میں وہاں کا موسم کیسا ہوگا؟"

لیکن ابوعلی کرمانی نے مشورہ دیا" سلطان کو چاہیے کہ وہ آنند پال کو اس حملے کے بارے میں مطلع کر دیں اور اس کو حکم دیں کہ وہ ہمیں غلہ اور ضرورت زندگی کی دوسری چیزیں فراہم کرے۔ اس کے علاوہ ہمیں رہنما بھی درکار ہوں گے اور یہ ساری ذمے داریاں آنند پال کے سر ڈال دی جائیں۔ یہیں سے آنند پال کی نیت اور اس کے ارادوں کا علم بھی ہمیں حاصل ہو جائے گا۔"

سلطان، ابوعلی کرمانی کے علاوہ کسی سے بھی خوش نہ ہوا اس نے ابوعلی کرمانی کی بڑی تعریفیں کیں اور کہا" ہر کوئی مشورہ دیتے ہوئے گھبراتا ہے معلوم نہیں کیوں؟ ابوعلی کرمانی کا مشورہ صائب ہے۔ میں اس کے کچھ حصوں پر عمل کر سکتا ہوں۔"

سلطان نے محسوس کیا کہ تربھون اور سیناپتی بھی کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ اس نے پہلے تربھون سے پوچھا" ہاں تو کیا کہنا چاہتا ہے؟"

تربھون نے جواب دیا" سلطان کو اپنے ساتھ مبلغوں کی ایک جماعت رکھنی چاہیے، اور ان کا کام ہو اچھوتوں اور ویشوں میں اسلام کی تبلیغ کرنا۔ اس طرح ہم اپنے لیے وہاں سے بھی فوجی جمع کر سکیں گے۔"

سلطان کو یہ رائے بہت پسند آئی اب اس نے سیناپتی کی طرف دیکھا" میں سلطان کے لیے اس حملے کو نہایت اہم اور ضروری سمجھتا ہوں۔ تھانیسر پر حملہ ضرور کیا جائے کیونکہ یہی وہ راجا ہے جو سلطان کو بار بار جنگ پر مجبور کر دیتا ہے۔"

سلطان نے پوچھا" کیا تیری فوج اس جنگ میں ہمارا ساتھ دے گی؟"

سیناپتی نے جواب دیا" کیوں نہیں دے گی۔ ہمارے دس ہزار جوانوں کو اس پر فخر ہے کہ سلطان کی فوج سے ان کا بھی تعلق ہے۔"

سلطان نے کہا" نگر کوٹ کے مندر سے ہمیں ایک بہت بڑا خزانہ میسر آگیا تھا۔ تھانیسر سے ہمیں کیا ملے گا؟"

سیناپتی نے جواب دیا" نگر کوٹ سے بڑا خزانہ تھانیسر کے مندر میں جتنا مال موجود ہے اتنا کہیں اور سے نہیں مل سکتا۔"

سلطان نے پھر وضاحت چاہی" اس مندر سے خزانہ کون برآمد کرے گا؟ مسلمان فوجی یا ہندو فوجی؟"

سیناپتی نے جواب دیا" یوں تو یہ کام دونوں ہی انجام دے سکتے ہیں مگر میرے خیال میں یہ کام ہندو فوج کو انجام دینا چاہیے، کیوں کہ مندروں کا جتنا علم ہندو فوج کو حاصل ہے مسلمان فوج کو نہیں۔ ہم سے ان کی کوئی جگہ بھی چھپی ہوئی نہیں۔"

سلطان اب بھی مطمئن نہیں تھا، کہا" سیناپتی جی! میرے ہر سوال کا جواب تو خود دے دیتا ہے حالاں کہ تجھ کو یہی سوال اپنی فوج سے کرنا چاہیے اور پھر ہمیں بتا کر اس نے کیا مشورہ دیا۔"

سیناپتی نے جواب دیا" میں اپنی فوج کے ایک ایک ہندو سے خوب اچھی طرح واقف ہوں۔ ہماری فوج کا ہر ہندو یہی کہے گا کہ تھانیسر کو ہرگز نہ معاف کیا جائے۔"

سلطان نے کہا" اگر یہ بات ہے سیناپتی جی! تو آج ہی سے اپنی فوج کو تیار کرنا شروع کر دے۔ میں تھانیسر کا مزاج درست کرنا چاہتا ہوں۔"

اس سلسلے میں خواجہ میمندی، ارسلان جاذب اور عبداللہ طائی نے جو مشورے دیے تھے سلطان ان سے خوش نہیں تھا۔ اس نے ان سب کو خوب اچھی طرح ڈانٹ دیا" جب میں تم سے مشورہ لیتا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہر حال میں مجھے مشورہ دیا جائے۔ لیکن تم لوگ چالاکی سے میرے سوالات کے جواب گول کر جاتے ہو، تم کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔"

خواجہ حسن میمندی نے کہا" جس امر کے بارے میں کسی کی معلومات معمولی اور سطحی ہوں ان پر مشورہ بھی کیا دیا جا سکتا ہے۔"

سیناپتی نے درمیان میں کہا" لیکن مشورہ ضرور دینا چاہیے، اگر مشورہ نہ دے تو یہی کہہ دے کہ اس سوال کے بارے میں فلاں فلاں امور وضاحت طلب ہیں یعنی پہلے ان کے بارے میں معلومات فراہم کی جائیں اس کے بعد مشورہ لیا جائے۔"

اس مجلس مشاورت کے بعد سلطان نے اپنے فوجی سرداروں اور ماہروں سے مشورے کیے اور ان کو بتایا گیا کہ عنقریب ہم ہندوستان روانہ ہو جائیں گے۔ اس لیے یہاں غزنی میں جو ضروری امور ہوں انھیں نمٹا دیا جائے۔

اور ساتھ ہی سلطان نے آنند پال کو ایک خط لکھ دیا" میں عنقریب تھانیسر کو سبق سکھلانے آؤں گا۔ اس لیے تیرا یہ فرض ہے کہ میری فوج اور مویشیوں کے لیے غذا فراہم کرے۔ دوسرے یہ کہ ہمیں تھانیسر تک کے لیے رہنما بھی درکار ہیں۔ یہ کام بھی تو ہی انجام دے گا یعنی رہنماؤں کی حصولیابی تیرے ذمے۔"

یہ خط فوراً روانہ کر دیا گیا۔ پروہت جی کو یہ خبر جیسے ہی ملی وہ پریشان ہو گئے اور اپنی محفلوں میں خاص قسم کی باتیں کرنے لگے۔

خلجی سردار نورالدین کو بھی سلطان کے ساتھ تھانیسر چلا جانا تھا۔ اس نے اپنے ایک دوست کو ساتھ لیا اور پروہت جی کی طرف روانہ ہو گیا۔

راستے میں ایک جگہ، جہاں تنہا ایک امرود کا درخت لگا ہوا تھا، خلجی سردار یہاں تک تو گھوڑے پر سوار رہا اس کے بعد نیچے اترا اور اپنے ساتھی کو اپنی تلوار دے دی اور کہا" جب تک میں واپس نہ آجاؤں، تو یہیں میرا انتظار کرے گا۔"

ساتھی بھی اپنے گھوڑے سے نیچے اترا اور دونوں گھوڑوں کو امرود کے درخت سے باندھ دیا۔ اور خلجی سردار سے کہا" واپسی جلدی ہونا چاہیے ورنہ میں اکیلا ہی واپس چلا جاؤں گا۔"

خلجی سردار نے کہا" وہ دیندار بزرگ اپنی محفل میں ہتھیاروں سمیت نہیں آنے دیتا ورنہ میں تجھ کو اپنے ساتھ لے جاتا۔"

خلجی سردار اپنے ساتھی کو چھوڑ کے پروہت جی کے پاس چلا گیا۔ اس وقت پروہت جی دنیا کی بے ثباتی پر تقریر کر رہے تھے اور پچاس پچپن مسلمان اپنے سر دھن رہے تھے۔ پروہت جی نے خلجی سردار کو اپنی محفل میں داخل ہوتے دیکھا اور نظرانداز کر گیا۔ وہ کہہ رہا تھا" یہ دنیا کیا ہے فضول اور بے کار جگہ۔ اس دنیا کے علاوہ بھی ایک دنیا ہے، عقبیٰ کی دنیا، وہ دنیا جہاں موت کے بعد ہی آدمی جاتا ہے۔ اس دنیا میں ہم چند سالوں کے لیے آتے ہیں اور دوسری دنیا میں ہمیشہ کے لیے چلے جاتے ہیں۔"

اب خلجی سردار نے ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ لاجونتی کو تلاش کر رہا تھا۔

پروہت جی کہہ رہے تھے" ہمیں جب یہ معلوم ہو گیا کہ یہ دنیا چند روزہ ہے اور ہمیں یہاں ہمیشہ نہیں رہنا ہے تو ہم اتنی لالچ کیوں کرتے ہیں، ہمیشہ دنیا سے اتنا دل نہیں لگانا چاہیے کہ جاتے وقت پریشانی کا سامنا کرنا پڑے، ہم زندگی بھر مایا کے پیچھے بھاگتے ہیں، شہر، ملک اور قلعے فتح کرتے ہیں، انسانوں کو ہتھیاروں سے ہلاک کر دیتے ہیں، لیکن جب ہمارا آخری وقت آتا ہے تو ہم اپنی زندگی بھر کی کمائی پر شرمندہ ہو جاتے ہیں، سارا دھن، ساری دولت، شہر ملک اور قلعے سب یہیں اس دنیا میں رہ جاتے ہیں اور ہم خالی ہاتھ گناہوں کا بوجھ کاندھوں پر لادے ہوئے تنہا چلے جاتے ہیں۔ تو دوستو! یہ ہے ہماری آپ کی زندگی اور یہ تھا ہماری پوری زندگی کا ماحصل اور یہ تھا ہمارا انجام۔ میں حیران ہوں کہ انسان اتنا بے وقوف کیوں ہے! دولت خرچ کر دو، ہتھیار ضائع کر دو، مال و زر سے نجات حاصل کر لو، جب یہ سارے کام کر چکو تو ہم سے ضرور ملنا تاکہ میں صحیح سمت میں تمھاری رہنمائی کر سکوں۔"

خلجی سردار نے سوچا کہ پروہت جی تو وعظ و تلقین میں مشغول ہیں کیوں نہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کے لاجونتی سے بات کر لی جائے۔ اس نے نظروں کو گھما پھرا کے لاجونتی کو تلاش کیا۔ اس وقت وہ دور برآمدے کی دہلیز پر بیٹھی پروہت جی کی تقریر سن رہی تھی۔ خلجی سردار کہیں رکے بغیر لاجونتی کے پاس چلا گیا۔

پروہت جی، خلجی سردار کو لاجونتی کے پاس جاتے دیکھ رہے تھے۔ اس سے ان کے وعظ و تلقین پر اثر پڑا۔

لاجونتی، خلجی سردار کو اپنے سامنے دیکھ کر گھبرا گئی، کھڑے ہوتے ہوئے پریشان لہجے میں پوچھا" مجھ سے کوئی کام؟ یہاں کیا لینے آئے ہو تم؟"

خلجی سردار نے جواب دیا" لاجونتی! میں تیرے وطن جا رہا ہوں۔"

لاجونتی نے پوچھا" کب؟"

خلجی سردار نے جواب دیا" میں دن تو نہیں بتا سکتا لیکن جس دن بھی سلطان نے حکم دیا ہم سب روانہ ہو جائیں گے۔"

لاجونتی پریشان ہو رہی تھی اس نے دور ہی سے پروہت جی کی پریشانی محسوس کر لی تھی۔ کہنے لگی" سردار! تم یہاں میرے پاس کیوں آئے ہو، جاؤ پروہت جی کی باتیں سنو جا کر۔"

خلجی سردار نے جواب دیا" لڑکی! ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ میں اس محفل میں صرف تیری وجہ سے آتا رہا ہوں اور آج بھی تیری وجہ سے آیا ہوں میں پروہت جی کی کیا بات سنوں۔"

لاجونتی نے خوفزدہ لہجے میں کہا" پھر بھی تم کو یہاں میرے پاس نہیں آنا چاہیے تھا۔"

خلجی سردار نے کہا" میں جو بات تجھ سے کرنا چاہتا ہوں وہ پروہت جی کی موجودگی میں اور ان کے سامنے نہیں کر سکتا۔"

لاجونتی نے کہا" ادھر دیکھو پروہت جی کی طرف۔

ان کی نظریں ہم پر ہی ٹکی ہوئی ہیں"۔
خلجی سردار نے جواب دیا "میں ان باتوں سے نہیں ڈرتا، پروہت جی باتیں اچھی کر لیتے ہیں"۔

لاجونتی وہاں سے اٹھ کر جانے لگی، بولی "تم مجھے پریشان نہ کرو"۔

خلجی سردار اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا "میں تجھ کو یوں نہیں جانے دوں گا، میں تھانیسر جا رہا ہوں سلطان کے ساتھ، اس وقت میں یہ کہنے آیا ہوں کہ میں نے تجھ کو پسند کر لیا ہے میری عدم موجودگی میں تو میری یہ باتیں ہر وقت یاد رکھے گی"۔

لاجونتی نے جواب دیا "میں ہندو ہوں اور جگ سوم کی ادنیٰ داسی۔ میں شادی نہیں کر سکتی اور کسی مسلمان سے تو اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا"۔

خلجی سردار نے کہا "یہ ساری بعد کی باتیں ہیں۔ مجھے جو کہنا تھا کہہ دیا، اب جو کچھ کرنا ہو گا واپسی میں کر گزروں گا۔"

پروہت جی کا وعظ ادھورا رہ گیا، وہ اپنے سامعین سے معذرت کر کے اٹھ آئے اور خلجی سردار کو پیچھے سے پکڑ لیا "یہ یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

خلجی سردار نے پروہت جی کو حیرت سے دیکھا "آپ یہاں بھی۔ آپ اپنے کام سے کام رکھیں اور مجھے میرا کام کرنے دیں"۔

پروہت جی نے تیوریاں چڑھائیں "یہاں آ کے میں نے یہ محسوس کیا کہ ہتھیار بند انسانوں کو انسان بنانا کتنا مشکل کام ہے"۔

خلجی سردار نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "یہ بات بہت دنوں بعد سمجھ میں آئی آپ کی"۔

پروہت جی نے لاجونتی کا ہاتھ پکڑ کے اندر لے جانا چاہا، لیکن خلجی سردار نے پروہت جی کی کلائی پکڑ لی اور ترش لہجے میں کہا "آپ لاجونتی کا ہاتھ چھوڑ دیں"۔

پروہت جی نے خلجی سردار کی آنکھوں میں وحشت اور بربریت سی محسوس کی "میں کہتا ہوں لاجونتی کا پیچھا آپ چھوڑ دیں، میں اس سے شادی کر لوں گا"۔

پروہت جی نے کہا "لیکن ایسا ہو نہیں سکتا۔ لاجونتی دیوداسی ہے اور ہندو بھی، تو مسلمان ہے پھر تم دونوں کی شادی کیونکر ہو گی"۔

خلجی سردار نے اٹل لہجے میں کہا "شادی تو ہم دونوں کی ہو کر رہے گی۔ میں نے جو کہہ دیا سو کہہ دیا"۔

پروہت جی روہانسا ہو گیا "یہ تو بڑی زیادتی ہے تیری۔ مجھے مجبوراً سلطان کے پاس جانا پڑے گا۔"

خلجی سردار ڈر گیا "مجھے اتنی جلدی بھی نہیں۔ ابھی تو ہم سب تھانیسر جا رہے ہیں، وہاں سے واپسی پر میں لاجونتی کے سلسلے میں بات کروں گا۔"

پروہت جی نے لاجونتی سے کہا "اب تو اندر جا۔ جب میں بلواؤں تب اندر سے باہر آنا۔ ویسے باہر آنے جانے کی کوئی ضرورت نہیں"۔

خلجی سردار نے لاجونتی سے کہا "دیکھ میں تیرے سلسلے میں سلطان سے بات کروں گا اور اللہ نے چاہا تو اجازت بھی حاصل کر لوں گا"۔

پروہت جی نے جھنجلائے لہجے میں کہا "یہ عجیب زبردستی ہے۔ لاجونتی ہندو اور دیوداسی۔ اس کا سلطان سے کیا تعلق"۔

خلجی سردار نے لاجونتی سے کہا "بس تیری مرضی ضروری ہے۔ بقیہ کام میرا ہے"۔

لاجونتی نے مسکراتے ہوئے خلجی سردار کی طرف دیکھا اور اندر چلی گئی۔

پروہت جی کو سب کچھ معلوم ہو گیا کہ لاجونتی کیا چاہتی ہے اور خلجی سردار کی کیا مرضی ہے، لاجونتی کی مسکراہٹ کا کیا مطلب ہے؟ ساری باتیں معلوم ہو چکی تھیں۔

خلجی سردار وہاں سے واپس آیا اور امرود کے سائے تلے اس نے اپنے ساتھی کو انتظار کرتے دیکھا۔ ساتھی نے دیکھتے ہی کہا "اتنی دیر کہاں لگا دی خلجی سردار"۔

خلجی سردار نے اپنے گھوڑے کی راس درخت کے تنے سے کھولی اور اپنے ہتھیار اپنے ساتھی سے لے لیے اور جواب دیا "میں نے جلدی آنے کی کوشش تو کی تھی مگر تم جانو، جہاں بیچ میں عشق ہو وہاں وقت کے گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا، میں تو یہاں جلدی آ گیا ہوں"۔

خلجی سردار نے جو کچھ کہا، اس کے ساتھی کو اس پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

دوسری طرف پروہت جی کو اب اپنی بے بسی کا احساس ہوا تھا لیکن وہ ہمت نہیں ہارے تھے اور انھوں نے خلجی سردار سے نمٹنے کا پکا ارادہ کر لیا تھا۔

سلطان اپنی فوج کے ساتھ ہندوستان روانہ ہو گیا۔ ارسلان جاذب، عبداللہ طائی، ابوعلی کرمانی، سیناپتی اور تربھون اس مہم میں سلطان کے ہم رکاب تھے۔ دس ہزار ہندو فوجی بھی سلطان کے ساتھ تھے اور انھوں نے غزنی چھوڑنے سے پہلے سلطان سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ اس ہندوستانی مہم میں دوسروں سے زیادہ خدمت انجام دیں گے۔

ویہند سے آگے راجا آنند پال کا بھائی دو ہزار سواروں کے ساتھ سلطان کے استقبال کے لیے موجود تھا۔ اس نے آگے بڑھ کے نیازمندانہ عرض کیا "سلطانِ محترم! مجھ کو میرے بھائی راجا آنند پال نے حکم دیا ہے کہ میں اپنے دو ہزار سواروں کے ساتھ آپ کا استقبال کروں اور تھانیسر تک آپ کی فوج اور مویشیوں کے لیے غذا کا انتظام کرتا رہوں"۔

سلطان نے آنند پال کا شکریہ ادا کیا، کہا "تجربات اور زمانے .... نے آنند پال کو خاصا سمجھدار کر دیا ہے"۔

آنند پال کا بھائی سلطان کے روبرو فدویانہ انداز میں کھڑا رہا۔ سلطان نے محسوس کیا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ پوچھا۔ "کوئی خاص بات؟ مجھ سے کچھ کہنا ہے؟"

اس نے عرض کیا "بھائی آنند پال نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر سلطان کو ناگوار نہ گزرے تو ایک خط آپ کی خدمت میں پیش کر دیا جائے"۔

سلطان نے پوچھا "کہاں ہے وہ خط؟"

اس نے ایک خط سلطان کے حوالے کر دیا۔ سلطان نے خط وصول کرتے ہوئے پوچھا "اس میں کیا لکھا ہے؟"

آنند پال کے بھائی نے جواب دیا "آپ خود ملاحظہ فرمالیں"۔

سلطان نے اس خط کو پڑھا، یہ راجا تھانیسر کے حق میں ایک سفارش تھی لیکن نام راجا تھانیسر کا نہیں لیا گیا تھا۔

"میں آپ کے احکام کی تعمیل کے لیے ہر طرح سے حاضر ہوں اور آپ کا سچا فرماں بردار ہوں لیکن اس محبت اور نیازمندی کی بنا پر جو آپ کی ذات بابرکات سے مجھے میسر ہے، اس قدر عرض کرنے کی جرأت کر رہا ہوں کہ تھانیسر کا مندر اس ملک کی ایک بہت بڑی عبادت گاہ ہے، آپ اسے برباد نہ کریں اور اس کے عوض میں جتنا مال آپ مناسب سمجھیں بتا دیں۔ آپ کو فراہم کر دیا جائے گا۔ یہاں کی رعایا کو اپنی باج گزار بنا کر غزنی واپس چلے جائیں۔ اگر آپ نے میری درخواست قبول کر لی تو آپ کا میں شکر گزار رہوں گا اور شکرانے کے طور پر ہر سال پچاس ہاتھی اور ساتھ میں دوسری بیش قیمت اشیا ارسال کرتا رہوں گا"۔

سلطان نے کسی تذبذب اور وسوسے کے بغیر راجا آنند پال کو جواب لکھ دیا۔

"افسوس کہ میں تیری یہ درخواست رد کر رہا ہوں۔ میں تھانیسر کے راجا کو سزا دینے نکلا ہوں اس نے ماضی میں ہمیں بار بار ستایا اور تنگ کیا ہے۔ پھر میں اس کو کس طرح معاف کر سکتا ہوں"۔

اس جواب نے آنند پال کو مایوس کر دیا اور اس نے تھانیسر کے راجا کو مطلع کر دیا کہ تیری درخواست رد کر دی گئی۔

تھانیسر کے راجا نے دہلی اور متھرا کے راجگان کو مطلع کیا اور ان سے مدد چاہی لیکن سلطان نے اس کا موقع ہی نہ دیا اور اچانک تھانیسر کے سامنے توقع سے پہلے ہی پہنچ گیا۔

تھانیسر کا راجا اور اس کی فوج تھانیسر کو اس کے شہریوں کے حوالے کر کے فرار ہو گئی اور سلطان اپنی فوج کے ساتھ کسی رکاوٹ کے بغیر تھانیسر میں داخل ہو گیا۔

آنند پال کا بھائی دو ہزار سپاہیوں کے ساتھ اس وقت بھی سلطان کے ساتھ تھا اور وہ دس ہزار ہندو فوج بھی جو سیناپتی کی سپہ سالاری میں یہاں تک آئی تھی۔

تھانیسر کی حفاظت کرنے والے فرار ہو چکے تھے اور وہاں کا شیو مندر بے یار و مددگار اپنے پرستاروں کی بے وفائی اور کج ادائی پر نوحہ کناں تھا۔

سلطان تھانیسر میں اس تالاب کے کنارے فروکش ہو گیا جو مندر کے پاس بلکہ اس سے متصل تھا اور جس کے تقدس میں یہ بیان کیا جاتا تھا کہ جو اس میں اشنان کر لے وہ پوتر ہو جاتا ہے۔

سلطان کی ہندو فوج نے مندر کو اپنے حصار میں لے لیا اور سلطان کو یاد کرایا کہ مندر سے خزانے اور نذرانوں کی بازیافت کی خدمات وہ انجام دیں گے۔ مندر میں چند پجاریوں کے سوا کوئی بھی نہ تھا۔ ان کو سلطان کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔

سلطان نے ان پجاریوں سے پوچھا "یہ تم لوگ اس مندر میں جس بت کی پرستش کرتے ہو، اس کا کیا نام ہے؟"

ایک پجاری جو دوسروں سے زیادہ پڑھا لکھا معلوم ہوتا تھا، کہنے لگا "مہان یدھ کاری۔ اس بت کو مسلمان جگ سوم کہتے ہیں جبکہ اس کا واقعی نام چکر سوامی ہے اور اس کی بابت ہمیں ہمیشہ یہ بتایا گیا کہ جب تک اس مندر میں یہ بت یعنی چکر سوامی موجود ہے اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا اور نہ ہی اس کو فتح کیا جا سکتا ہے"۔

محمود نے جواب دیا "لیکن آج اس بت کی موجودگی میں تھانیسر کو فتح کر لیا گیا اور تمھارے چکر سوامی دم بخود یوں براجمان ہیں

گویا یہ جو کچھ ہوا اس سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔“

تھانیسر میں مسلمان سپاہیوں کو مندر میں جلانے اور اس کی لوٹ مار سے منع کر دیا گیا۔ یہ کام ہندو سپاہ انجام رہی تھی۔ بارہ ہزار ہندو سپاہی اس کام کی انجام دہی کے لیے کافی تھے۔

سلطان نے چکر سوامی کو مندر سے نکلوا کے اپنے قبضے میں لے لیا اور تھانیسر کے شہریوں کو بات چیت کے لیے مندر کے سامنے جمع کیا۔ وہ شہر کے معزز لوگوں کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ اس کے حملوں کا پس منظر کیا ہے۔ اس نے کہا ”میں ہندوستان کے کسی بھی شہر پر حملہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ غزنی اور تھانیسر میں بڑی دوریاں ہیں لیکن مجھے بار بار چھیڑا گیا۔ مجھ پر بار بار حملے ہوئے اور میں نے ان حملوں کا یہ جواب دیا کہ جب بھی جنگ جیت لی تو حملہ آوروں کو معاف کر دیا، انھیں ان کے شہر اور ان کی حکومتیں واپس کر دیں اور سابقہ حکمرانوں کو ان کی جگہ برقرار اور قائم رکھا۔ کیا تاریخ میں اس عفو اور درگزری کی کوئی دوسری مثال ہے؟ اگر ہے تو اسے میرے سامنے لایا جائے لیکن میں جانتا ہوں کہ ایسی کوئی مثال نہیں۔ تمھارے راجا نے ہمیشہ میرے خلاف فوجیں تیار کیں اور ان کو ویہند اور پشاور تک لے گیا۔ میں نے انھیں شکست دی اور ان حملہ آوروں کو کوئی خاطر خواہ سزا دیے بغیر غزنی واپس چلا گیا۔

میں نے ہندوؤں کو اپنی فوج میں ملازم رکھ لیا اور اس طرح ایک بار پھر یہ کوشش کی کہ ہم دونوں آپس میں دوست بن کر رہیں لیکن ہندوستانی راجے مہاراجے سکون سے نہیں رہ سکتے۔ یہ لڑائی جھگڑے کے عادی ہیں لیکن بڑی جنگوں کا انھیں کوئی تجربہ نہیں۔ ان کی اخلاقی حالت بھی اچھی نہیں۔ پھر وہ جنگ کس طرح جیتیں گے۔ ذرا سوچو تو میں غزنی سے چل کے یہاں تک آیا ہوں۔ تھانیسر کے راجا سروج پال کو میرا مقابلہ کرنا چاہیے تھا۔ راجا اپنی رعایا کا باپ ہوتا ہے لیکن یہ کیسا باپ ہے جو اپنی اولاد کو دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر چلا گیا۔ تمھارے راجا سے بھی گیا گزرا تمھارا چکر سوامی نکلا۔ تم اس کو اپنا نجات دہندہ سمجھتے رہے اور اس کے وجود کو اتنا قدیم سمجھتے رہے جتنی قدیم یہ دنیا ہے لیکن جب میں اس شہر میں داخل ہوا تو یہاں مجھے روکنے کے لیے نہ تو سروج پال تھا، نہ اس کی فوج تھی اور نہ تمھارا دیوتا چکر سوامی۔ میری ہندو سپاہ مندر میں داخل ہو گئی اور وہاں کے خزانے اور نذرانے باہر نکال لائی، چکر سوامی کو میری گود میں ڈال دیا گیا لیکن یہاں کچھ بھی نہ ہوا۔ میرا ایک بال بھی میرے جسم سے جُدا نہ ہوا۔ میرا ایک سپاہی بھی ہلاک نہ ہوا۔ آخر کیوں؟ صرف اس لیے کہ تم لوگ جس خام خیالی میں مبتلا تھے، اللہ نے اس کو روزِ روشن کی طرح تم پر عیاں کر دیا۔ ذرا سوچو تو میں غزنی سے تھانیسر تک کسی خطرے کی پروا کیے بغیر آ گیا۔ راستے میں کوئی مسلمان ریاست بھی نہیں۔ پھر وہ کون سی طاقت تھی جو مجھے یہاں تک لے آئی؟ وہ میرا خدا، میرا اللہ ہے۔ تم سب اور پوری دنیا اگر اتفاق کرے اور یہ چاہے کہ میرے اللہ کو کوئی نقصان پہنچائے تو بھی تم سب ناکام رہو گے۔ وہ جسد نہیں رکھتا، اس کا کوئی جسم نہیں، اس کو خیالوں میں بھی قید نہیں کیا جا سکتا۔ وہ قیاس اور گمان سے بھی بڑا ہے پھر تم اس کی عبادت کیوں نہیں کرتے جو سب سے بڑا اور مہربان ہے۔ تم اس کی حکم عدولی کرتے ہو اور وہ تمھیں رزق دیتا ہے، تم اس کے شریک تیار کر لیتے ہو اور وہ تم کو پھر بھی نظر انداز نہیں کرتا اور عیش و عشرت اور دولت و حکومت سے نواز دیتا ہے، اپنے گورکھ دھندوں سے باہر آؤ اور اپنی عقل و تمیز سے اس کے شایانِ شان کام لو۔“

تھانیسر کے شہری رونے لگے۔ سلطان کی تقریر نے ان کے پیمانۂ صبر کو چھلکا دیا۔ ان کے چند نمائندوں نے سلطان کو بتایا کہ ”وہ سلطان کے زیرِ سایہ رہنا چاہتے ہیں اور وہ سلطان کے ساتھ غزنی چلنے کو تیار ہیں۔“

سلطان نے کہا ”غزنی یہاں سے بہت دور ہے اور وہاں کا موسم بھی تمھارے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ تم یہیں اپنے ملک میں رہو اور اپنے طرزِ بود و باش میں انقلابی تبدیلیاں لاؤ۔“

ایک شہری نے کہا ”آپ کے واپس جاتے ہی راجا سروج پال واپس آ جائے گا اور ہمیں اپنے پرانے رسم و رواج پر قائم رہنے پر مجبور کر دے گا۔ ہم وہاں کے مخالف موسموں کا مقابلہ کر لیں گے۔ ہمیں آپ اپنے ساتھ لے چلیں۔“

سلطان نے ان کی بات مان لی۔ یہ معاشرے کے پسماندہ لوگ تھے۔ اچھوت، ولیش اور ہنر مند لوگ، پورا معاشرہ انھی کے کاندھوں پر ٹھہرا ہوا تھا لیکن ان کو خود معاشرے میں کوئی بلند مقام حاصل نہیں تھا۔ سلطان نے انھیں تسلیاں دیں اور یقین دلایا کہ اگر وہ غزنی چلنا چاہتے ہیں تو انھیں بھی دس ہزار ہندو سپاہ کی طرح قبول کر لیا جائے گا۔

کہانی کے تاریخی پس منظر کے مآخذ

طبقاتِ ناصری	آئینہ حقیقت نما	تاریخِ اسلام	خلاصۃ التواریخ	تاریخِ فرشتہ	منتخب التواریخ
منہاج سراج	مولانا اکبر شاہ خان	مولانا اکبر شاہ خان	سبحان رائے پوری	محمد قاسم فرشتہ	عبدالقادر بدایونی

قارئین

مقید کر دیا سانپوں کو یہ کہہ کر سپیروں نے
یہ انسانوں کو انسانوں سے ڈسوانے کا موسم ہے
محمد عامر، کھیوڑہ

چھوڑ کے جانے والے تجھ کو اتنا بھی احساس نہیں
اس کے دل پہ کیا گزرے گی جس کو غم بھی راس نہیں
سید امین الحق شوانی۔ الطائف

زمانہ ہو گیا تجھ سے جُدا ہوئے لیکن
چتا سی اب بھی سُلگتی ہے میرے سینے میں
شاہین نثار۔ لاہور

کچھ تُو ہی مرے کرب کا مفہوم سمجھ لے
ہنستا ہوا چہرہ تو زمانے کے لیے ہے
منظور قادر پروانہ تاندلیانوالہ

مَیں نے ہر جشنِ طرب ہنس کر منایا ہوتا
کاش تو آج مجھے یاد نہ آیا ہوتا
ایس مختیار اکبر خان۔ بھکر

اے دوست تیری یاد بھی کتنی عجیب ہے
جب آ گئی تو گویا زمانے ٹھہر گئے
فرحت ایم یوسف خاں، ٹنڈو جام

چاروں طرف فضا میں اُداسی بکھر گئی
تم کیا گئے کہ رونقِ شام و سحر گئی
طارق جاوید جیدی۔ سیر محل

سکوتِ شام میں جب کائنات ڈھلتی ہے
کسی کی یاد خیالوں کے رُخ بدلتی ہے
خالد احسان ہاشمی، ٹھٹھہ

تیرے فراق کے لمحوں میں دل نے سوچا ہے
تیرے وصال کے دن کتنے مختصر ٹھہرے
تجمل۔ پنڈ دادن خان

جلائے بیٹھے ہیں ہم اس جگہ لہو کے دیے
جہاں سحر بھی ترستی ہے روشنی کے لیے
نصر اللہ جگرئی۔ کروڑ لعل عیسن

اُٹھا کر آنکھ تو تم دیکھ لو یاں کون دیکھے ہے
ذرا قربان ہونے دو ہمیں، صدقے تمھارے ہم
ناہید شاہین۔ پاک پتن شریف

خفا نہیں ہے مگر اس ادا کو کیا کہیے
پکارتا ہوں تو وہ مُڑ کے دیکھتا بھی نہیں
محمد نعیم زاہد، مرتضیٰ زاہد، مظفر گڑھ

یہ وہم ہے میرا کہ یقین سوچ رہا ہوں
کیوں تیرا تصور بھی عبادت سی لگے ہے
عتیق الرحمان کھوکھر، ٹوبہ ٹیک سنگھ

پلکوں سے گر نہ جائیں یہ موتی سنبھال لو
دنیا کے پاس دیکھنے والی نظر نہیں
ماسٹر محمد عمر نغاری۔ مکہ المکرمہ

یا تیرا تذکرہ کرے ہر شخص
یا کوئی ہم سے گفتگو نہ کرے
علی عابد بخاری۔ بھکر

وہ ایک برف سی لڑکی جو مجھ میں رہتی ہے
اس ایک برف سی لڑکی سے ہی گلے تھے بہت
امجد فیروز، امیت امجد، گوجرانوالہ

میری آنکھوں سے جھلکتا ہے میری رُوح کا درد
میرے چہرے پر میرے گھر کی سی ویرانی ہے
طارق بشیر مغل، کھیوڑہ

اُس ایک خواب کی حسرت میں جل بجھیں آنکھیں
وہ ایک خواب کہ اب تک نظر نہیں آیا
نبیلہ گوگی آرائیں، ڈگری

مجھ کو تو ہوش نہیں، تم کو خبر ہو شاید
لوگ کہتے ہیں کہ تم نے مجھے برباد کیا
مرزا طارق۔ کھیوڑہ

صحرا کی سمت جاتے ہو کیوں شہر چھوڑ کر
ویرانیوں کی دل کے نگر میں کمی نہیں
ممتاز خاں کھوکھر، کھیوڑہ

عشق تو ہو ہی چکا تھا غرقِ طوفانِ حیات
حُسن بھی موجِ غمِ ہستی میں ڈوبا جائے ہے
شفقت اعوان۔ دندی گھیب

خواب بکھرے تو ہم نے یہ جانا
لوگ روتے ہیں کس لیے اتنا
سیّد واجد علی کاظمی، پاڑی شاہ

اِس بیاباں میں ہے سایہ بھی گریزاں مجھ سے
کون دیکھے گا تماشا میری رسوائی کا
رانا تسنیم یعقوب جاوید۔ دہاڑی

تمھاری بزم میں دھندلی سی روشنی کیوں ہے
دلوں کے داغ چراغوں کے رُوبرُو تو نہیں
سعید انجم، کراچی

ہم ایسے بدنصیب کے اب تک مر نہ گئے
آنکھوں کے آگے آگ لگی آشیانے میں
محمد عارف انجم، ریڑھ مانسہرہ

مدت سے کوئی شخص رلانے نہیں آیا
جلتی ہوئی آنکھوں کو بُجھانے نہیں آیا
یقین الدین شیخ، مظفر گڑھ

اُمید کا سایہ ہے نہ راستہ نہ منزل
ہم کتنے اکیلے ہیں محبت کے سفر میں
منیر اختر۔ راولپنڈی

دوُر افق پر پھیل گئی ہے کاجل کاجل تاریکی
پاگل پاگل تنہائی میں کس کی یاد کا دیپ جلے
ایس اکبر خان۔ بھکر

وہم تھا قافلۂ ہم سفراں
مُڑ کے دیکھا تو کوئی ساتھ نہ تھا
ممتاز عالم قریشی، دریا خان

رسمِ اُلفت ہی اجازت نہیں دیتی ورنہ
ہم بھی ایسا تمھیں بھولیں کہ سدا یاد کرو
قمر رضا انجم تجمل، دودیال تلہ گنگ

رفتہ رفتہ وہ بھی خاکستر نہ ہو جائے کہیں
ایک چنگاری جو سینے میں ہے اب تک دل کے پاس
لبنیٰ رانا۔ کراچی

یہ تو سچ ہے کہ وہ اسی راہ سے گزریں گے مگر
کوئی دیکھے نہ انھیں، حکم ہوا ہے اب کے
محمد اشرف شاد سواتی۔ ریڑھ مانسہرہ

جُھکی جُھکی سی نظر بے قرار ہے کہ نہیں
دبا دبا سا سہی دل میں پیار ہے کہ نہیں
مائیکل جوزف گل۔ سیالکوٹ

گرا دے خود کو دہکتے ہوئے الاؤ میں
کہ وقت خون کا دریا دکھائی دیتا ہے
ظفر صادق۔ بھمبر آزاد کشمیر

دل کے ویرانے میں آہٹ ہے کوئی اب نہ صدا
یاد بھی ان کی دبے پاؤں گزر جاتی ہے
عتیق الرحمٰن۔ کراچی

یہ دوریاں، یہ بندشیں یہ فاصلے تمام
پھر بھی تو مل ہی لیتے ہیں تم سے خیال میں
صاحبزادہ عرفان اللہ جاوید۔ سرائے نورنگ

کیا ہوا مجھ میں اگر جرأتِ اظہار نہیں
آپ نظروں کی زباں بھی تو سمجھتے ہوں گے
عبدالزمان شوانی۔ گدوالیاں

نہ آرزوؤں کا چاند چمکا، نہ قربتوں کے گلاب مہکے
نہ ہجرتوں کا عذاب سہتے ہوئے مسافر گھروں کو لوٹے
مس ثروت عالم۔ راولپنڈی

تجھ سے وابستہ وہ اک عہد و پیمانِ وفا
رات کے آخری آنسو کی طرح ڈوب گیا
کاشف شہزاد۔ پیر محل

کئی رُتیں یونہی یادوں میں جل کے گزری ہیں
نہ یاد اب اگر آئے تو کیا کیا جائے
صفی اللہ خان سیفی۔ مظفر گڑھ

اے دوست مجھ سے کوششِ پیہم کے باوجود
دل سے تیرا خیال بھلایا نہ جا سکا
شکیلہ ہاشم۔ چنیوٹ

سزا کے طور پہ ہم کو قفس ملا جا لب
بہت ہی شوق تھا اک آشیاں بنانے کا
ایم جاوید اقبال نازش، اوکاڑہ

انجان نگاہوں کی یہ مانوس سی خوشبو
کچھ یاد سا پڑتا ہے کہ پہلے بھی ملے ہیں
محمد سلیم طالب، لاہور

کیا خبر تھی کہ خزاں ہوگی مقدر اپنا
ہم نے ماحول سجایا تھا بہاروں کے لیے
محمد ہاشم راجپوت، شاہ پور چاکر

چمن والو! خدا حافظ قفس کو لے چلی گردش
چمن میں گر اندھیرا ہو تو گھر میرا جلا لینا
کوثر رفیق، سیالکوٹ

اُٹھا کبھی دھواں نہ کبھی روشنی ہوئی
جلتی رہی حیات بڑی خامشی کے ساتھ
ایم طارق انجم شیخ۔ میاں چنوں

ہجر کی رات کاٹنے والے
کیا کرے گا اگر بسر نہ ہوئی
خواجہ ضمیر الحسن زاہد سیالکوٹ

ٹھیس بن جاتی ہے گزرے ہوئے لمحوں کی یاد
رُوٹھ جانے کے لیے کیوں مہرباں ہوتے ہیں لوگ
امجد مسعود، ہری پور

روئیں نہ ابھی اہلِ نظر حال پہ میرے
ہونا ہے ابھی مجھ کو خراب اور زیادہ
خالد محمود کاشف، بہاولپور

ہر مصیبت کا دیا ایک تبسم سے جواب
اس طرح گردشِ دوراں کو رُلایا میں نے
ظہور احمد شاہین، کوٹ غلام محمد

اِسی خیال سے آنکھیں تمام رات جلیں
میں جاگتا ہوں اُسے نیند آ گئی ہو گی!
شگفتہ سحر، گوجرہ

مدت ہوئی کہ چشمِ تحیر کو ہے سکوت
اب جنبشِ نظر میں کوئی داستاں نہیں
بابر علی خان۔ چکی

اک ہم سفر کو کھو کے یہ حالت ہوئی عدمؔ
جنگل میں جس طرح کوئی بے آس رہ گیا
منظور حسین منظوری، سیالکوٹ

تلخیاں دے کر ہمیں وہ خود بھی تنہا رہ گیا
ہم اگر اُجڑے تو اُس کے پاس بھی کیا رہ گیا
ملک اسلام۔ بوریوالہ

کوئی تو بات ہوگی جو کرنے پڑے ہمیں
اپنے ہی خواب اپنے ہی قدموں سے پائمال
پرنس کاشف قریشی، مظفر گڑھ

کس نے دیکھے ہیں تیری روح کے رِستے ہوئے زخم
کون اُترا ہے ترے حسن کی گہرائی میں
سیّد اسلم توقیر شاہ ہاشمی، جہلم

بھول جانے کا تجھے کیسے تصوّر کر لوں
میری ہر سانس سے وابستہ ہیں یادیں تیری
عمران انجم کیانی۔ گوجر خان

اِک نظر مڑ کے دیکھنے والے
کیا یہ خیرات پھر نہیں ہو گی
شبیّر احمد ضیاء، اسلام آباد

زندگی تجھ سے ہمیں کوئی تمنا کب ہے
اب تو اِس آس پہ جیتے ہیں کہ مرنا کب ہے
سیّد قمر شبیّر، لاہور

ایک چہرے ہی سے فرصت نہ ملی نظروں کو
ہم کسی اور طرف آنکھ اُٹھاتے کیسے
سیّد گلزار حسین شاہ زیدی۔ رودھڑی

سُنتے ہیں کہ چُپ چُپ سے رہتے ہیں وہ اکثر
زلفیں بھی سُنا ہے کہ سنوارا نہیں کرتے
مرزا توقیر حسین جعفری، کھیوڑہ

روشن نہیں ہے اس میں کسی یاد کا چراغ
دل کا دیار گورِ غریباں سے کم نہیں
مظہر خان شاہد، جہلم

لوحِ جبیں پہ ثبت ہے رودادِ زندگی
ہر چند بے زباں ہوں مگر بے زباں نہیں
مسرت حکیم، بازغہ حکیم، مقام نہ معلوم

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے
صیاد کی نگاہ سوئے آسمان نہیں
ایم یونس رضا۔ پنڈ دادن خان

شام بھی ہو گئی، دھندلا گئیں آنکھیں میری
بھولنے والے میں کب تک تیرا رستہ دیکھوں
ظہیر احمد۔ کمالیہ

یاد آتا ہے روز و شب کوئی
ہم سے روٹھا ہے بے سبب کوئی
راحیلہ انور۔ گجرات

یوں بھی رسوا تھی بہت خلوتِ دل کی خواہش
تیری چاہت نے کیا اور نمایاں مجھ کو
مس فاطمہ شیریں گیلانی۔ جھنگ

کبھی تو دیکھے گا مڑ کر، پکارتے جاؤ
کبھی تو جیت ہی جاؤ گے ہارتے جاؤ
اعجاز انور، ایبٹ آباد

میرا سکون یہی ہے کہ میں بے سکون رہوں
میرے لیے نہ پریشان ہوا کرے کوئی
عبدالواحد اعوان۔ سیالکوٹ

بیٹھ کر تنہائیوں کی گود میں
تیری قربت کا خیال آیا بہت
بیسلا۔ راجن پور

وہ تو آئے بھی اور چلے بھی گئے
اب ہمیں خود ہے انتظار اپنا
ارشد حسین ارشد، لیاقت آباد

در و دیوار پہ حسرت سی برستی ہے قتیلؔ
جانے کس دیس گئے پیار نبھانے والے
نبیل ساجد۔ سرگودھا

چاک داماں بھی ہوں، مفلس بھی ہوں، غم دیدہ بھی
میری تصویر نہ البم میں سجائی جائے
شاہ عالم زمرّد۔ راولپنڈی

آنکھیں کھلیں تو جاگ اٹھیں حسرتیں تمام
اس کو بھی کھو دیا جسے پایا تھا خواب میں
ایم یونس رضا۔ پنڈ دادن خان

تجھ سے بچھڑ کے مجھ کو یہ احساس تو ہوا
تنہائیوں میں کوئی میرے پاس تو ہوا
جمشید علی خان قائم خانی، کوٹ غلام محمد

ترسا تھا جس وجود کی قربت کو عمر بھر
وہ مل گیا تو اور بھی تنہائی بڑھ گئی
شمع۔ فیصل آباد

کبھی نہ ختم کیا میں نے روشنی کا سفر
اگر چراغ بجھا، دل جلا لیا میں نے
اعظم ناصر، غازی اختر قائم خانی، ٹنڈو الہ یار

میں وہ نہیں ہوں جس سے کہ روشن جہان ہو
مٹی کا ایک دیا ہوں مجھے بھول جائیے
اختر علی زخمی۔ دوڑ

آگ ہے اور سُلگ رہی ہے حیات
راکھ ہوں اور بکھر رہا ہوں میں
روبینہ ناز، نواب شاہ

جل رہے ہیں نہ بجھ رہے ہیں دوست!
کس کے سینے کا داغ ہیں ہم لوگ!
صباحت گل، سکھر

ہائے مجبوریٔ آدابِ محبت اے دوست
پاس آ بھی نہ سکوں تجھ کو بلا بھی نہ سکوں
محمد اسلم رانا۔ میانوالی

کس طرح عمر کٹے گی جو یہی حال رہا
ہم سے روٹھا ہے وہی جس کے لیے جیتے ہیں
نصر اللہ ناصر گوپانگ کوٹلہ شیر محمد

یادیں بھی ہیں، امید بھی ہے بے بسی بھی ہے
اے دوست کیا نہیں ہے ہماری نگاہ میں
ماہتاب راؤ جہانیاں منڈی

ہم بھی جلے تھے رات کسی آنچ کی طرح
کچھ آشنا سے ہو گئے پھر زندگی سے ہم
شفیق اظہر۔ ٹنڈو جام

بچھڑنے والا بھلا کیسے جی رہا ہو گا
یہی تو سوچ کے دل کو جلا رہا ہے کوئی
یونس عدیم ملتان

چراغ بجھ بھی چکے ہیں مگر پسِ چلمن
یہ آنکھ اب بھی تیرا انتظار کرتی ہے
امتیاز احمد۔ مریدوالہ

اب بھی اوجھل ہے نگاہوں سے نشانِ منزل
زندگی تو ہی بتا کتنا سفر باقی ہے؟
اعجاز احمد معروفی للہ ٹاؤن

نظر جس کی طرف کر کے نگاہیں پھیر لیتے ہیں
قیامت تک پھر اُس دِل کی پریشانی نہیں ہوتی
محمد اشرف قریشی۔ حافظ آباد

چپ چاپ اپنی آگ میں جلتے رہو سرفراز
دنیا تو عرضِ حال سے بے آبرو کرے
شوکت چوہدری بھمبر آزاد کشمیر

دل تیری یاد میں پھر آج پریشاں کیوں ہے
میری صورت میں تیرا عکس نمایاں کیوں ہے
جاوید علی خان، کراچی

میری بے لوث وفائیں تجھے یاد آئیں گی
جب تیری ذات کے صحرا سے نکل جاؤں گا
شاہد خان، چیچہ وطنی

محبتوں میں دلوں کو عجب ہے دھڑکا سا
سجانے کون کہاں راستہ بدل جائے
راؤ ساجد علی قیصر، راجن پور

فقط نگاہ سے ہوتا ہے فیصلہ دل کا
نہ ہو نگاہ میں شوخی۔ تو دلبری کیا ہے؟
منظر یعقوب۔ کراچی

ہم اُن کے دیکھنے کو سمجھتے ہیں زندگی
اُن کا یہ حال ہے کہ اِدھر دیکھتے نہیں
عبدالعزیز منگریو، جیکب آباد

اب آئے ہو تو یہاں کیا ہے دیکھنے کے لیے
یہ شہر کب سے ہے ویراں وہ لوگ کب کے گئے
نثار احمد ندیم جہانیاں منڈی

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اِک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی
سیّد زین العابدین بخاری۔ بدین

اتنی ہے صرف میری محبت کی داستان
اِک شخص تھا جو زخمِ شناسائی دے گیا
جیہ ضمیر خان۔ ساہیوال

گزر چلی تھی دبے پاؤں شام تنہائی
تیرا خیال جو آیا تو آنکھ بھر آ گئی
فیصل سہراب، ساہیوال

جب سفر سے لوٹ کے آئے تو کتنا دکھ ہوا
اُس پرانے بام پر وہ صورتِ زیبا نہ تھی
اشرف علی دلبر، پیر محل

میرے احساس کو ڈستے رہے بیتے لمحات
میری رگ رگ میں سُلگتی رہیں یادیں تیری
حمیرا شاہین، مظفر گڑھ

سُلگ رہے ہیں الاؤ سے میرے اندر بھی
بجھی نہ پیاس مری، بارشوں میں رہ کر بھی
عزیز الاسلام کاکاخیل ہنگو

خشک آنکھیں، دل شکستہ، روح تنہا، لب خموش
بستیوں میں دیکھتے ہیں صورتِ ویرانہ ہم
سید آفتاب حیدر نقوی، ٹیکسلا

اب تو اشکوں کے ستارے بھی نہیں پلکوں پر
کن چراغوں کو جلائیں گے سحر ہونے تک
شعیب، امین آباد

حادثے کیا کیا تمہاری بے رُخی سے ہو گئے
ساری دنیا کے لیے ہم اجنبی سے ہو گئے
محمد آصف شریف گجر۔ لانڈھی

لُٹا ہے کارواں جب آ چکی ہے سامنے منزل
کہاں ٹوٹی ہیں اُمیدیں، کہاں تقدیر بگڑی ہے
محمد سہیل احمد جنجوعہ، کھیوڑہ

اُن کے آگے جو جھکی رہتی ہیں نظریں اپنی
اس لیے ہم ہی خطاوار نظر آتے ہیں
محمد خالد۔ کٹھیالہ شیخاں

کھلی ہیں کھڑکیاں ہر گھر کی لیکن
گلی میں جھانکتا کوئی نہیں ہے
رب نواز خان۔ کراچی

بھول کر بھی کبھی پلکیں نہ جھپکنے پائیں
اس قدر نیند کو آنکھوں سے نچوڑا ہم نے
ڈاکٹر فرزانہ بخاری۔ بدین

بات نکلے گی تو پھر دور تلک جائے گی
لوگ بے وجہ اُداسی کا سبب پوچھیں گے
کیور ثورین۔ سری کوٹ

یہ میری شامِ غم یہ سسکیاں لیتے ہوئے تارے
چلے آؤ کہ شامِ زندگی کم ہوتی جاتی ہے
عنبر، عنبرین، امین آباد

کس توقع پہ کریں تیری تمنا ہم لوگ
ڈھونڈنے پر بھی ملا جب کوئی خود سا نہ ہمیں
ککو، ٹیٹو۔ ایمن آباد

مہر و وفا، خلوص و محبت کے باوجود
کیوں جل گئی زمینِ وفا سوچتا ہوں میں
شاہدہ رحمٰن۔ کراچی

جس کے چہرے پر رقم ہو بے لبسی کی داستان
کیا کرے گا تذکرہ وہ گردشِ ایّام کا
اسد ملہار خان تونگی، کورنگی کراچی

کیا حادثہ ہوا ہے جہاں میں کہ آج پھر
چہرہ ہر ایک شخص کا اُترا ہوا سا ہے
فتح محمد فانی۔ کرگ الالی

زہے وہ دل جو تمنائے تازہ تر میں رہے
خوشا وہ عمر جو خوابوں میں ہی بہل جائے
تجمل حسین حیدری۔ کھیوڑہ

پلکوں پہ سجائے ہوئے اشکوں کے نگینے
اِک روز تیرے شہر میں آجائیں گے ہم بھی
رئیس عالم، حیدر آباد

نہ جانے کون سا آنسو کسی سے کیا کہہ دے
ہم اِس خیال سے نظریں جھکائے بیٹھے ہیں
محمد فاروق فرخ ٹنڈو محمد خان۔ عبدالخالق ملک۔ ڈھوک ڈب (پنڈی گھیپ)

کون سیاہی گھول رہا ہے وقت کے بہتے دریا میں
میں نے آنکھ جھکی دیکھی ہے آج کسی ہرجائی کی
تنویر اکرم پومی۔ گجرات۔ صباحت گُل۔ بھکر

دل تو اپنا اداس ہے ناصر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے
تنویر احمد خان، ساہیوال

تُو نے کیا توڑا گلستان سے وفا کا ایک پھول
ہر کلی ہے غیر محرم، ہر شگوفہ اجنبی
نادر مبارک خان زادہ ٹنڈو الہ یار

کسی بے وفا کی خاطر یہ جنوں فراز کیسا
جو تمھیں بھلا چکا ہے اُسے تم بھی بھول جاؤ
محمد مظہر عظیم اعوان، نور پور سیٹھی

نہ اعتبارِ محبت نہ اختیارِ وفا
جنوں کی تیز روی کہہ رہی ہے سب اچھا
وہ آشنائے حقیقت نہیں تو کیا غم ہے
حدیثِ نامہ بری کہہ رہی ہے سب اچھا
الیس خان۔ ٹنڈو الہ یار

تم سے جدا ہوئے تو کسی کو خبر نہ تھی
مُڑ مُڑ کے دیکھنا مجھے بدنام کر گیا
راشد علی قریشی۔ مظفر گڑھ

بلال نازکی، مٹھن کوٹ

موم کی سیڑھی پہ چڑھ کر چھو رہے تھے آفتاب
پھول سے چہروں کو یہ کوشش بہت مہنگی پڑی
محمد اسد اللہ بھٹی۔ لاہور

اٹھا کبھی دھواں تو کبھی روشنی ہوئی
جلتی رہی حیات بڑی خامشی کے ساتھ
لبنیٰ سکندر، سانگھڑ

آشیاں پھول کی ٹہنی پہ بنانے والے
گل کہ شعلے بھی کبھی آگ لگا دیتے ہیں
شیخ عبدالحمید مجاہد، شیخ محمد شفیق ضیا۔ سکھیکی منڈی

اب نہ اُس کی یاد ہے محسن نہ لمحوں کا فریب
زیست کی اس کشمکش کو کون سا عالم کہیں
علی اصغر۔ فورٹ عباس

بھلا دو رنج کی باتوں میں کیا ہے
اِدھر دیکھو میری آنکھوں میں کیا ہے
نور محمد۔ بنّوں

اِک طرزِ تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک
اِک عرضِ تمنّا ہے وہ ہم کرتے رہیں گے
خان محمد، فیصل آباد

ڈرا رہے ہیں مجھے میرے گھر کے سناٹے
ترس گئی میری تنہائی ہم سفر کے لیے
محمد حسن رضا مظفر۔ منڈی بہاؤ الدین۔ مرزا شبیر جبّی کنول۔ میر پور آزاد کشمیر۔

کریں تو کس سے کریں نارسائیوں کا گلہ
سفر تمام ہوا ہم سفر نہیں آیا
جہاں سرفراز، ملتان

کوئی خواہش نہیں تجھ سے میری اے عمرِ رواں
میرا بچپن، میرے جگنو، میری گڑیا لا دے
محمد عمران شاہین۔ مظفر گڑھ

سوزِ دل بے آنسوؤں کے اک قیامت ہے قمر
اُس سے پوچھو، جس کا گھر جلتا ہو اور پانی نہ ہو
رخسانہ شبنم۔ تلہ گنگ

تیری مخمور نگاہوں کے تصوّر میں کبھی
سو بھی جائیں تو ترے خواب جگا دیتے ہیں
رخسانہ یاسمین۔ کھوڑ کمپنی

بہت دنوں سے نہیں اپنے درمیاں وہ شخص
اُداس کر کے ہمیں چل دیا کہاں وہ شخص
عابد رفیق۔ منڈی ڈھاباں سنگھ

بھڑک رہی ہے سرِ شام سے یہ چنگاری
جلا کے راکھ نہ کر دے یہ انتظار کی آگ
محمد اعظم خان قائم خانی۔ ٹنڈو الہ یار

پھیر لیتے ہیں نظر دل سے بھلا دیتے ہیں
کیا یونہی لوگ وفاؤں کا صلہ دیتے ہیں
ناز کاجل۔ کراچی

مانا کہ غم کے بعد مسرت ضرور ہے۔
لیکن جئے گا کون تری بے رخی کے بعد
عمر فاروق۔ صوابی۔ عطا محمد خان مخدوم رشید

کسے خبر کہ مری روح کے دریچوں میں
غمِ حیات کے کتنے چراغ جلتے ہیں
طاہر صدف۔ تریل

اِک خواب ہو گئی ہے وہ رہ و رسمِ دوستی
اِک وہم سا ہے اب کہ میرے ساتھ تم بھی تھے
یاسمین اکوڑہ خٹک۔ نوشہرہ

رستوں پہ نہ بیٹھو کہ ہوا تنگ کرے گی
بچھڑے ہوئے لوگوں کی صدا تنگ کرے گی
مت ٹوٹ کے چاہو اُسے آغازِ سفر میں
بچھڑے گا تو اِک اِک ادا تنگ کرے گی
عطاء الرحمان ارشد۔ لیہ

زندگی بھر کی مسافت کاٹ کر بھی کیا ملا
اجنبی دیوار و در، سنسان گھر، تنہائیاں
خالدہ شفقت بے بی، حاصل پور۔ نغمہ ابتسام مظفر گڑھ۔

بہت اُداس ہے اک شخص تیرے جانے سے
جو ہو سکے تو چلا آ اسی کی خاطر تو
اے صمد سوختہ، لطیف آباد۔ گلنار تبسم شمشاد تبسم، عابد ندیم۔ کوہاٹ

آج وہ آخری تصویر جلا دی ہم نے
جس سے اُس شہر کے پھولوں کی مہک آتی تھی
شازیہ صدیقی، نیو کراچی۔ امیر دائلہ ٹیپو، گجرات

گیلی لکڑی کی طرح جلنے کی عادت دے گیا
جانے والا جاتے جاتے کیا امانت دے گیا
فرخ ندیم ٹیپو۔ کھیوڑہ۔ شوکت جاوید اختر۔ روپ وال۔ ماسٹر ایم عاشق عاصی۔ کہروڑ پکا

میں نے فانی ڈوبتی دیکھی ہے نبضِ کائنات
جب مزاجِ دوست کچھ برہم نظر آیا مجھے
محمد اکرم وڑائچ عرف کامی۔ پپنا کھہ

خود پیاس کا صحرا ہوں مگر دل کی یہ ضد ہے
ہر دشت پہ ساون کی طرح ٹوٹ کے برسوں
صابر حسین شاہین، اظہر سلیم انجم۔ کھیوڑہ

اے دیکھنے والو! مجھے مڑ مڑ کے نہ دیکھو
تم کو بھی محبت کہیں مجھ سا نہ بنا دے
حق نواز پروانہ این۔ راولپنڈی

شاد بن عبدالعزیز

مثل مشہور ہے کہ اُمید کے سہارے دُنیا قائم ہے تو یہ بات کچھ ایسی غلط بھی نہیں معلوم ہوتی۔ اِس دنیا میں نہ جانے کتنے ایسے انسان ہیں جو کسی نہ کسی اُمید کو سینے سے لگائے جی رہے ہیں۔

ایک بوڑھے کا قصہ جسے اُمید تھی کہ اس کی جوانی کا خواب ضرور پورا ہوگا

"اور میرا خیال ہے کہ تم آج بھی سارا وقت اس کھٹارا پک اپ پر ضائع کرو گے۔ واشنگ مشین کی باری نہیں آئے گی۔ ہے نا؟"

"آں ہاں، میرا بھی یہی خیال ہے۔"

"اور کل جب تمھیں چرچ جانے کے لیے صاف کپڑے نہیں ملیں گے تو تم حسبِ عادت شور مچاؤ گے؟"

"کل دیکھا جائے گا۔"

"اور مجھے یقین ہے کہ کل تمھیں باغیچے میں سبزیاں کاشت کرنے کا وقت بھی نہیں ملے گا۔"

"اوہ ممی! آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ جب تک پاپا اپنی پک اپ ٹھیک نہیں کر لیتے، وہ دُوسرے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ ان سے پوچھنا ہی حماقت ہے۔"

"ڈینی! اپنی ماں کے بارے میں گستاخی کا کلمہ منہ سے مت نکالو۔ اس کی باتوں کو حماقت کہتے ہو، اگر وہ مجھ سے سوال کرنا چاہتی ہے تو یہ اس کا حق ہے۔ تمھارا اس بات سے کوئی واسطہ نہیں، میرا واسطہ ہے۔ بیٹسی! احمقانہ سوالات بند کرو اور میرا ناشتا لگا دو۔ محنت کرنے والے آدمی کو فضول سوالات کے بغیر وقت پر کھانا ملنا چاہیے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے، اگر آج تم اس بدبُودار تہ خانے کو صاف کر دو تو شاید مجھے تمھاری واشنگ مشین دیکھنے کا وقت مل جائے گا۔ اب یہ تم پر منحصر ہے، سمجھیں؟"

"میرے خیال میں انڈے، توس اور شہد کا ناشتا تمھارے لیے ٹھیک رہے گا۔ کیا خیال ہے؟"

"بشرطیکہ کچھ جلا ہوا نہ ہو۔ اُف.... میری قسمت میں کوئی ایسی صبح نہیں ہے جب ناشتے میں کوئی جلی ہوئی چیز نہ ہو۔ تم تیس سال سے میرا باورچی خانہ سنبھالے بیٹھی ہو لیکن آج تک تمھیں کھانا پکانا نہیں آیا۔ ڈینی! تم یہ غلطی نہ کرنا۔ اپنے لیے کوئی ایسی بیوی منتخب کرنا جو کھانا پکانا جانتی ہو۔ عورت خواہ سونے کی بنی ہوئی ہو لیکن اگر وہ کھانا پکانا نہ جانتی ہو تو وہ مٹی سے بھی بدتر ہے۔"

"ڈیوڈ! ذرا دیکھنا تو، میں نے یہ انڈا بہت احتیاط سے بنایا ہے اور یہ توس دیکھو، کتنے اچھے بنائے ہیں۔ ٹھیک ہیں نا؟"

"ہونہہ.... انڈا جلایا نہیں، لیکن اتفاق سے کچّا چھوڑ دیا ہے۔ اور توس۔ واہ واہ.... کیا خوب ناشتا بنایا ہے۔ ڈینی! مجھے ایک مٹر کے دانوں کا ڈبّا کھول دو۔ میں اُدھر پک اپ کے پاس جا کر کھا لوں گا۔ تو یہ ہے.... اس باورچی خانے میں کوئی نہیں بیٹھ سکتا۔ کتنی بساند پھیلی ہوئی ہے یہاں جلے ہوئے کھانے کی۔"

"سوری ڈیوڈ! یہ توس ذرا زیادہ سُرخ ہو گئے ہیں۔ لاؤ میں مٹر کے دانوں کا ڈبّا کھول کے گھی میں سُرخ کر دیتی ہوں تم یہیں بیٹھ کر کھا لو۔ میں کھڑکی کھول دیتی ہوں۔"

"تم مہربانی کرو، ایسا نہ ہو کہ ڈبّا کھولتے ہوئے تمھارا ہاتھ کٹ جائے۔ ڈینی! تم ہی کھول دو ڈبّا۔ تمھاری ماں اس باورچی خانے میں کوئی کام ٹھیک سے نہیں کر سکتی۔"

"ویسے انڈے تو اتنے بُرے نہیں ہیں، میں انھیں دوبارہ...."

"ہونہہ.... دوبارہ۔ اگر تم نے انھیں دوبارہ گرم کیا تو یہ پتھر کی طرح سخت ہو جائیں گے۔ اُف یہ بساند...."

"اگر تم کہو تو میں کھڑکی کھول دوں؟"

"تمھیں پتا ہے، باہر کتنی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ اگر تم نے کھڑکی کھول دی تو ہر شے جم جائے گی، اور تم دن بھر کمر کے درد کی شکایت کرتی پھرو گی۔ بیٹسی! میں جانتا ہوں کہ تمھاری نیّت خراب نہیں ہے، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ تم سے کوئی کام ٹھیک نہیں ہوتا۔ کھانا تو تم بالکل نہیں پکا سکتیں۔"

"یہ لو پاپ! تمھارے دانوں کا ڈبّا کھُل گیا۔"

"احمق! ڈبل روٹی اور مکھن بھی لے کر آؤ۔ صرف مٹر کے دانوں سے کیا بنتا ہے۔ کیا اس گھر میں کوئی شخص، میرے سوا، صحیح کام نہیں کر سکتا؟ ہر شخص کے لیے سوچنا بھی ایک مصیبت ہے۔"

"سوری پاپ....!"

"سوری سے میرا پیٹ نہیں بھر سکتا ڈینی۔"

"ڈینی صرف تمھارے حکم کی تعمیل کرنے کی کوشش...."

"کوشش کرنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اب یہ بچّہ نہیں ہے۔ اس کی عمر تیس سال ہو چکی ہے۔ اب اسے از خود دُوسروں کی ضروریات کو سمجھنا چاہیے اور ٹھیک کام کرنے کا طریقہ سیکھنا چاہیے۔"

"تمھاری ڈبل روٹی پاپ.... میں نے اُس پر کافی مکھن لگا دیا ہے۔"

"اگر تم ذرا عقل سے کام لیتے تو تھوڑا سا جام بھی نکال کر پلیٹ میں رکھ دیتے، لیکن تم اپنی ماں کے نقشِ قدم پر چل رہے ہو۔ تم بھی کوئی کام ٹھیک سے نہیں کر سکتے۔"

"ڈیوڈ! وہ...."

"بیٹسی! مجھ پر غصہ اتارنے کی کوشش مت کرو۔ میرے پاس اِن باتوں کا وقت نہیں ہے۔ مجھے ڈینی سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔ یہ اس کی پیدائشی خامیاں ہیں۔ یا تم نے اس کی تربیت ہی ایسی کی ہے، اور سچ پوچھو تو مجھے تم سے بھی کوئی شکوہ نہیں ہے۔ حماقت تمھاری مجبوری ہے اور میں اس کا عادی بن چکا ہوں۔"

"پاپ! کیا تمھیں آج بھی پک اپ کی مرمّت کے سلسلے میں میری ضرورت ہو گی؟"

"تم کیا مدد کر سکتے ہو؟ لیکن.... بہر حال آ جاؤ۔ کوئی نہ کوئی کام ایسا نکل ہی آئے گا جو عقل استعمال کیے بغیر کیا جا سکتا ہو۔ خدا جانتا ہے کہ میں اکیلا سارے کام نہیں کر سکتا۔ کاش تم بھی کسی کام کے نکلتے، اگر مجھے صحیح مددگار مل جائے تو میں اس پک اپ کو چند منٹوں میں ٹھیک کر دوں لیکن وائے تمنّائے خام۔ مجھے خود ہی سب کچھ کرنا پڑے گا۔ میں ہمیشہ خود ہی سب کچھ کرتا ہوں۔"

بوڑھا ڈیوڈ اپنی شکستہ کرسی سے اٹھا، ٹپ ٹپ بہنے والی ٹونٹی سے پانی کا گلاس بھر کر پیا اور ٹوٹے ہوئے جالی دار دروازے سے نکل کر عقبی صحن کی طرف چل دیا۔

"اور ڈینی! کتوں کو کھانا دینا مت بھولنا۔ یہ ہماری نئی ذمے داری ہے۔ پالتو جانور کو نظر انداز کرنا بہت بُری بات ہے۔ جس جانور کو انسان اپنے پاس رکھے اس کی ضروریات بھی پُوری کرے۔"

بوڑھے نے ٹوٹے ہوئے دروازے کو دیکھ کر بیزاری سے سر جھٹکا۔ مکھیوں کا موسم شروع ہونے سے قبل دروازے کی مرمّت بہت ضروری ہے، لیکن وہ پک اپ اُس کی جان کو آ گئی تھی۔ وہ اکیلا کون کون سا کام کرے۔ فارم کی دیکھ بھال کرے، مشینری مرمّت کرے اور گھر کی ٹوٹ پھوٹ پر بھی نظر رکھے۔ بیوی ملی تو انتہائی پھوہڑ۔ وہ ایک کام کرنے کی کوشش کرتی تو دو خراب کر دیتی۔ بوڑھے نے اسے سمجھانا بھی ترک کر دیا تھا، کیونکہ وہ جتنا وقت اسے سمجھانے میں صرف کرتا تھا اُس سے آدھے وقت میں وہ خود کام کر سکتا تھا۔ جہاں تک بیٹے کا تعلق تھا، وہ ہُو بہو اپنی ماں پر گیا تھا۔

بوڑھے کو اپنی بیٹی رُوتھ بہت یاد آتی تھی۔ وہ نہایت سمجھ دار اور ذہین تھی۔ ہر کام میں اس کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ لیکن اس نے ایک سیلز مین سے شادی کر لی تھی اور مشی گن چلی گئی تھی۔ اُسے مشینری کی مرمّت کی سُوجھ بُوجھ بھی تھی۔ ایسی سُگھڑ عورت کی ہر شخص کو عزّت کرنا چاہیے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ بوڑھا اپنی بیوی بیٹسی کی عزّت نہیں کرتا۔ بوڑھا جب اُن کی باتیں سُنتا تو سر جھٹک کر رہ جاتا اور اپنے دل میں کہتا۔ اگر ان لوگوں کو بیٹسی کے ہاتھ کے پکے ہوئے بدمزہ اور جلے ہوئے کھانے کھانا پڑیں تو ایک ہفتے کے اندر ساری عزّت دھری رہ جائے۔ اس کے علاوہ بیٹسی دن میں کوئی پچاس مرتبہ جوڑوں کے درد اور کمر درد کی شکایت کرتی رہتی تھی۔

بوڑھا اِس بات پر خوش تھا کہ روتھ کی تربیت اس نے خود کی تھی۔ اُس نے اس پر ماں کا سایہ نہیں پڑنے دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی ماں کی خامیوں سے محفوظ رہی تھی۔

اوائلِ موسمِ بہار کا وہ دن گرم اور خوش گوار نظر آتا تھا۔ باہر چمکیلی دھوپ نکلی ہوئی تھی اور گھاس پر اوس کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ بوڑھا ڈیوڈ اپنے خیالوں میں گم گیراج کے سامنے پہنچا اور اس کا سال خوردہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا جہاں اڑتالیس ماڈل کی فورڈ پک اپ کھڑی تھی۔ اُس نے پک اپ کے زنگ آلود فینڈر پر ہاتھ پھیرا اور سوچنے لگا کہ ایک دفعہ پک اپ ٹھیک ہو جائے، اس کے بعد وہ سارے کام ٹھیک کر لے گا۔ پک اپ نے اُسے بُری طرح جکڑ رکھا تھا اور سب سے بڑی مُصیبت یہ تھی کہ اس کام میں کوئی اس کی مدد کرنے والا نہیں تھا۔

اس نے انجن کا ہُڈ اٹھایا اور صُورتِ حال کا جائزہ لینے لگا۔ بیٹری پر کائی جمی ہُوئی تھی، ڈسٹری بیوٹر کیپ ٹوٹی ہوئی تھی اور الیکٹریکل وائرنگ آپس میں اُلجھی ہُوئی تھی۔ انجن کی مرمّت کے لیے محنت کے علاوہ کثیر تعداد میں نئے پُرزوں کی ضرورت بھی تھی۔ بوڑھے نے سوچا کہ انجن کی مرمّت کے بعد وہ باڈی پر پینٹ کر لے گا اور پک اپ نئی نویلی دُلھن کی مانند ہو جائے گی۔

بوڑھے نے جیب سے ایک سگریٹ نکال کر سُلگایا اور دُھوئیں کو گھورتے ہوئے اس دن کے بارے میں سوچنے لگا جب اُس نے پہلی بار اس پک اپ کو دیکھا تھا۔ اس شام قصبے کے لوگ ایک تقریب کے سلسلے میں ہل فارم میں جمع ہُوئے تھے۔ اسی شام ڈیوڈ نے مس جانسن کو بھی دیکھا تھا۔ وہ شہر میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد چند روز پہلے ہی قصبے میں وارد ہوئی تھی۔ وہ بلا کی حسین اور شوخ لڑکی تھی۔ پتلی سی کمر، متناسب جسم، گہری سیاہ آنکھیں اور کندھوں تک لمبے بھُورے بال۔ حقیقت میں وہ اُس محفل کی حسین ترین لڑکی تھی۔ ڈیوڈ نے سوچا کہ اُس کا سَر اس کے کندھوں تک پہنچے گا بشرطیکہ وہ اس کے قریب جانے کی جراُت کر سکے۔

اور وہ باوجود کوشش کے، اُس کے قریب نہیں جا سکا کیونکہ وہ قصبے کے خُوبرو لڑکوں میں گھری ہوئی تھی۔ وہ سب آسودہ حال گھرانوں کے آزاد خیال لڑکے تھے اور حسین لڑکیوں کے قریب جاتے ہوئے بالکل نہیں گھبراتے تھے۔ اُن کے والدین نے انھیں ڈیوڈ کی طرح پانچ سال کی عمر میں کام پر نہیں لگا دیا تھا۔ یہ وہ لڑکے تھے جو کاروں میں گھُومتے تھے اور جنھیں لڑکیوں کے ساتھ باتیں کرنے کا خُوب تجربہ تھا۔ ڈیوڈ کی عمر اُس وقت تیس سال کے لگ بھگ تھی، لیکن سارا وقت کام میں لگے رہنے کی وجہ سے اُسے کبھی کسی لڑکی سے بات کرنے کی فرصت نہیں ملی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ تیس سال کی عمر میں بھی بہت کم گو اور شرمیلا تھا۔

مِس جانسن نے جس لڑکے کے ساتھ سب سے زیادہ ڈانس کیا تھا، وہ بائیس سالہ بل ہیلڈن تھا اور اڑتالیس ماڈل کی نئی پک اپ میں وہاں آیا تھا۔ تقریب کے اختتام پر بھی وہی اُسے گھر چھوڑنے گیا تھا۔ مِس جانسن کا باپ ایک وکیل تھا اور اس کی اپنی بیوی سے علیٰحدگی ہو چکی تھی۔

اس روز ڈیوڈ بہت اُداس گھر پہنچا تھا۔ اس کے تصوّر میں دو چیزیں گھوم رہی تھیں۔ سُرخ رنگ کی نئی پک اپ اور سُرخ و سپید رنگت والی مِس جانسن۔ اگر اس کے پاس بھی نئی پک اپ ہوتی تو اسے بھی مس جانسن کا قرب حاصل ہو سکتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ پیسے جمع کر کے ایک پک اپ ضرور خریدے گا۔ خواہ اُسے کتنی ہی تکلیف کیوں نہ اٹھانا پڑے۔ اس رات کے بعد اُس نے کئی مرتبہ بل ہیلڈن کی سُرخ پک اپ وکیل جانسن کے گھر کے سامنے کھڑی دیکھی تھی۔ اِس بات سے اس کے ارادے کو مزید تقویت ملی۔

اور آج پورے سینتیس سال گزرنے کے بعد بل ہیلڈن کی سُرخ

پک اَپ اب اُس کے گیراج میں کھڑی تھی۔ گو وہ نئی اور چمک دار نہیں تھی، تاہم تھی وہی پک اَپ...!

بد قسمتی سے ایک روز یہ پک اَپ گڑھے میں جا گری تھی۔ سُنا یہ گیا کہ مِس جانسن نے بل کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا اور بل کے لیے یہ انتہائی صَدمے کی بات تھی۔ اس نے خوب شراب پی اور پھر پک اَپ میں بیٹھ کر طوفانی رفتار سے روانہ ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دس مِنٹ بعد وہ پک اپ سمیت ایک گڑھے میں پڑا تھا۔ لوگ اُس کی لاش نِکال کر لے گئے مگر پک اَپ وہیں پڑی رہی۔

اور ڈیوڈ کبھی اتنے پیسے جمع نہ کر سکا کہ نئی پک اَپ خرید سکتا۔ لہٰذا اس نے پورے پینتیس سال بعد گڑھے میں سے زنگ کھاتی ہوئی پک اَپ کو نکالا اور اسے اپنے فارم ہاؤس میں لے آیا۔ اسے امید تھی کہ ایک نہ ایک دن وہ اس پک اَپ کو سڑک پر چلنے کے قابل بنا ہی لے گا۔ جب انسان کے پاس ایسی گاڑی ہو تو وہ قصبے کی حسین ترین لڑکی کو شہر کی سیر کرانے لے جا سکتا ہے۔

"ہیلو پاپ! میں یہ پوچھنے آیا تھا کہ میرے لیے کوئی کام تو نہیں ہے؟"

"اوہ... تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ اس طرح چوروں کی طرح آتے ہو تم۔ ابھی میرا دل بند ہونے لگا تھا۔ تم بالکل اپنی ماں کی طرح چلتے ہو۔"

"سوری پاپ! مجھے پتا نہیں تھا کہ آپ کا دھیان کسی اور طرف ہے۔ میں سامنے کی طرف سے آیا ہوں۔ کیا آپ گاڑی کا انجن ڈاؤن کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں؟"

"ابھی میں اس وائرنگ کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ بہت الجھی ہوئی وائرنگ ہے۔"

"پاپ! یہ وائرنگ تو ختم ہو چکی ہے۔ آپ اسے نکال باہر پھینکیں۔ میں نئی وائرنگ کر دوں گا۔"

"ہونہہ... تم نئی وائرنگ کرو گے؟ بیڑا غرق کر دو گے۔ جو کام انسان کو آتا نہ ہو، اس میں ہاتھ نہیں ڈالنا چاہیے۔"

"تو پھر پاپ! تمھارے خیال میں مجھے کون سا کام آتا ہے؟"

"تمھیں کچھ بھی نہیں آتا ڈینی۔"

"پاپ! آپ کو یاد ہو گا کہ میں آٹو مکینک کا کورس کر چکا ہوں۔ میں گاڑیوں کے الیکٹریکل اور مکینکل سسٹم کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں۔"

"تم صرف باتیں کرنا جانتے ہو۔ اگر تمھیں کچھ آتا تو مجھے جھک مارنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"پھر بھی پاپ! میں آپ کی مدد کرنے کے لیے تیار ہوں۔ آپ جو کام کہیں گے، وہ میں کر دوں گا۔"

"یہ کتنے شرم کی بات ہے کہ مجھے اس عمر میں گھر کے سارے کام کرنا پڑتے ہیں۔ حالانکہ میں ایک جوان بیٹے کا باپ ہوں۔ پھر بھی سب کچھ مجھے ہی کرنا پڑتا ہے۔ دیکھ لینا ایک دِن یہ پک اَپ بھی ٹھیک ہو ہی جائے گی۔"

"پاپ! یہ پُرانی اور زنگ آلود گاڑی تمھارے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ مرحوم بل ہیلڈن کی گاڑی پینتیس سال سے زنگ کھا رہی ہے۔ اگر تم نے اس کا انجن ٹھیک کر بھی لیا تو باڈی کبھی ٹھیک نہیں ہو گی۔"

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں زنگ کو ریگ مال اور ریتی سے مانجھ ڈالوں گا۔ اس کے بعد اس پر سُرخ پینٹ کروں گا اور یہ ایک بار پھر چمک جائے گی۔"

"پاپ! زنگ کو صاف کرنے کا مطلب پوری باڈی کو صاف کرنا ہے، کیونکہ یہ باڈی اوّل تا آخر زنگ ہی زنگ ہے۔ لوہا ختم ہو چکا ہے۔ اس پر وقت اور پیسہ برباد کرنا محض حماقت ہے۔ تم نے وہ مقولہ ضرور سُنا ہو گا کہ بوڑھی عورت کو جوان نہیں کیا جا سکتا اور پُرانی گاڑی کو نیا نہیں کیا جا سکتا۔"

"دیکھو برخوردار! یہ گاڑی میرا برسوں پُرانا خواب ہے۔ میں اسے نیا بنا کر رہوں گا۔ پھر تمھارے منہ سے ایک نیا ساز برآمد ہو گا۔ ڈیوڈ وِلسن بوڑھا ضرور ہے، لیکن جواں ہمّت ہے، اب وہ کسی نوجوان سے محض اِس لیے شکست نہیں کھا سکتا کہ اُس کے پاس نئی گاڑی ہے۔"

"پاپ! میرے پاس نہ تو کوئی نئی گاڑی ہے اور نہ ہی پرانی۔ تمھیں مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"تم یہاں سے چلے جاؤ... فوراً چلے جاؤ۔ تم مجھے اُلجھن میں ڈال رہے ہو۔"

"میں تو تمھاری مَدد کرنے آیا تھا۔"

"نہیں... تم میری مدد نہیں کر سکتے، اِس لیے بہتر یہی ہے کہ یہاں سے نکل جاؤ۔ میں خود ہی سارا کام کر لوں گا۔"

"پاپ! تم یہ بات اس دن سے کہہ رہے ہو جس دن یہ گاڑی یہاں آئی تھی، لیکن کچھ کرنا تو کجا، ابھی تک تم نے کام کی ابتدا بھی نہیں کی۔ بس بیٹھے گاڑی کو گھورتے رہتے ہو۔"

"اوہ... کہیں تم نے اپنی ماں کو یہ بات تو نہیں بتا دی؟"

"نہیں، میں نے ممّی کو کچھ نہیں بتایا۔ وہ یہی سمجھ رہی ہے کہ تم نے کافی کام نمٹا لیا ہے۔ وہ اس سلسلے میں خاصی پُرامید لگتی ہے، میں اس کے خلاف بات بتا کر اس کے جذبات مجروح نہیں کرنا چاہتا۔"

"ٹھیک ہے، بتانا بھی نہیں۔ دراصل سر دست میں یہ جائزہ لے رہا ہوں کہ گاڑی میں کیا کیا چیز خراب ہے اور کتنا کام کرنا پڑے گا۔ جائزہ مکمل ہونے کے بعد میں کام شروع کر دوں گا۔"

"اِس کا مطلب یہ ہے کہ تم فی الحال واشنگ مشین چیک نہیں کر سکو گے، حالانکہ ممّی نے تمھارے کہنے پر تہ خانے کی صفائی شروع کر دی ہے اور مجھے امید ہے کہ تھوڑی دیر میں کام مکمل ہو جائے گا۔"

"تم نے ٹھیک اندازہ لگایا ہے۔ جب تک یہ پک اَپ تیار نہیں ہو جاتی، میں واشنگ مشین کی مرمت نہیں کر سکتا۔"

"لیکن پاپ! تم نے وعدہ کیا تھا۔"

"وعدہ نہیں کیا تھا، صرف خیال ظاہر کیا تھا۔ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ خیال اور وعدے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ تم اسے یہ بات بے شک بتا دینا، اور یہ بھی کہہ دینا کہ کھانا احتیاط سے پکائے۔ کھانا اسے کہتے ہیں جسے کھایا جا سکے۔"

"پاپ! آپ کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ ممّی کو کھانا پکانا نہیں آتا۔ وہ بہترین کھانا پکاتی ہیں۔ کئی تقریبات میں بہترین کھانوں کے اِنعامات لے چکی ہیں۔"

"ہونہہ... کسی احمق نے انعام دے دیا ہو گا۔ میں جانسن فیملی کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ انھیں نہ اچھے کھانے کی تمیز ہے اور نہ اچھے آدمی کی۔ اب تم جاؤ اور مجھے سوچنے دو۔"

ڈینی رخصت ہو گیا اور ڈیوڈ دوبارہ اپنے خیالات میں کھو گیا۔ شاید اس کا اندازہ غلط تھا، یا بیٹسی جانسن ہی احمق تھی۔ کیا یہ احمقانہ بات نہیں تھی کہ سینتیس سال قبل وہ بل ہیلڈن کے ساتھ اس گاڑی میں بیٹھ کر اپنے گھر گئی تھی، اور کیا یہ بھی احمقانہ بات نہیں تھی کہ اس نے بل ہیلڈن اور اس کی نئی پک اَپ کے ساتھ منگنی کر لی تھی۔

یہ بھی حماقت تھی کہ اس نے بل جیسے شرابی پر بھروسا کیا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ وہ شرابی حادثے کا شِکار ہو گیا ورنہ ڈیوڈ کبھی اس کی سُرخ پک اَپ اور اس کی خوب صُورت منگیتر کا مالک نہ بن سکتا۔

ڈیوڈ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ اُسے وہ شام اچھی طرح یاد تھی جب اس نے اس پک اپ کی بریکیں ڈھیلی کی تھیں اور وہ ٹھِٹھری ہوئی صبح بھی یاد تھی جب اُس نے پولیس کی چیکنگ سے قبل گڑھے میں پڑی ہوئی اس گاڑی کی بریکیں دوبارہ ٹھیک کر دی تھیں۔ احمق پولیس نے حادثے کو کثرتِ شراب نوشی اور منگیتر سے جھگڑے کا نتیجہ قرار دیا تھا۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

ڈیوڈ کو وہ شام بھی اچھی طرح یاد تھی جب اس نے ایک شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ بیٹسی کو اپنی طرف متوجّہ کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن جواب میں اسے سرد اور ٹھہری ہوئی نظروں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ پھر بیٹسی، بل ہیلڈن کی سُرخ پک اَپ میں بیٹھ کر وہاں سے رخصت ہو گئی تھی۔ اُس منظر کا تصوّر آج بھی ڈیوڈ کے دل و دماغ میں تلخی گھول دیتا تھا۔

آج وہ اُن دونوں چیزوں کا مالک تھا، سُرخ پک اَپ اور سُرخ و سپید بیٹسی، لیکن نجانے کیوں وہ دونوں چیزیں اُس کے لیے وبالِ جان بنی ہوئی تھیں۔

پک اپ کو زنگ کھا گیا تھا اور بیٹسی کو کسی کی یاد کھا گئی تھی۔

ڈیوڈ آج بھی ان دونوں چیزوں سے اتنا ہی دُور تھا جتنا سینتیس سال قبل۔ لیکن وہ اس موہوم امید پہ زندہ تھا کہ ایک نہ ایک دن سُرخ پک اپ اس کی محنت سے نئی ہو جائے گی اور بیٹسی کا رنگ و رُوپ لَوٹ آئے گا، پھر جب وہ شاندار ڈریس پہنے لش لش کرتی نئی پک اپ کی اگلی سیٹ پر اس کے ساتھ بیٹھے گی تو اس کی ساری مایوسیاں خوشیوں میں تبدیل ہو جائیں گی۔

اور بوڑھا اسی امید پہ زندہ تھا۔

THE OLD TRUCK
Nora Lyon.

فرہاد علی تیمور

ایک درازدست شخص کی سرگزشت۔ ایک فسوں کار کا قصہ، جس کا جادو سر چڑھ کر بولتا تھا۔ اُس شورہ پُشت، شوریدہ سر کا احوال ایک عالم جس کے جنون کا پیاسا تھا۔

سسپنس کا مقبول ترین سلسلہ جو ایک سو تیس ماہ سے جاری ہے

میں نے چونک کر اپنی ساتھی کو دیکھا۔ خیال خوانی کے بعد کوئی چونکا دے تو یوں لگتا ہے جیسے ابھی آنکھ کھلی ہو۔ کچھ سوچنے سمجھنے اور سنبھلنے کے لیے ذرا مہلت درکار ہوتی ہے۔ ویسے سنبھلنے میں دیر نہیں لگی۔ پلک جھپکنے سے پہلے میں شیبا اور آمنہ کے پاس تھا۔ آمنہ کو کمانڈو ایکس سے دو دو ہاتھ کرتے دیکھ رہا تھا اور پلک جھپکنے کے بعد دماغی طور پر حاضر ہو گیا تھا۔ میری ساتھی نے پھر اشاروں کی زبان سے کہا۔

"ماسٹر کی آرہا ہے۔"

میں نے بھی سرگوشی میں کہا۔ "لیٹ جاؤ۔ ورنہ وہ ہمیں دیکھ سکتے ہیں۔"

اس نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ ہم دونوں ہی اس چٹان پر لیٹ گئے۔ وہ چٹان ایسی تھی جیسے کسی عمارت کی ٹیرس کا کچھ حصہ باہر کی طرف نکلا ہوا ہو۔ ہم اس غار کے اندر تھے اور وہ قدرتی ٹیرس ہمارے بڑے کام آرہی تھی۔ ہم اوندھے لیٹ کر آہستہ آہستہ
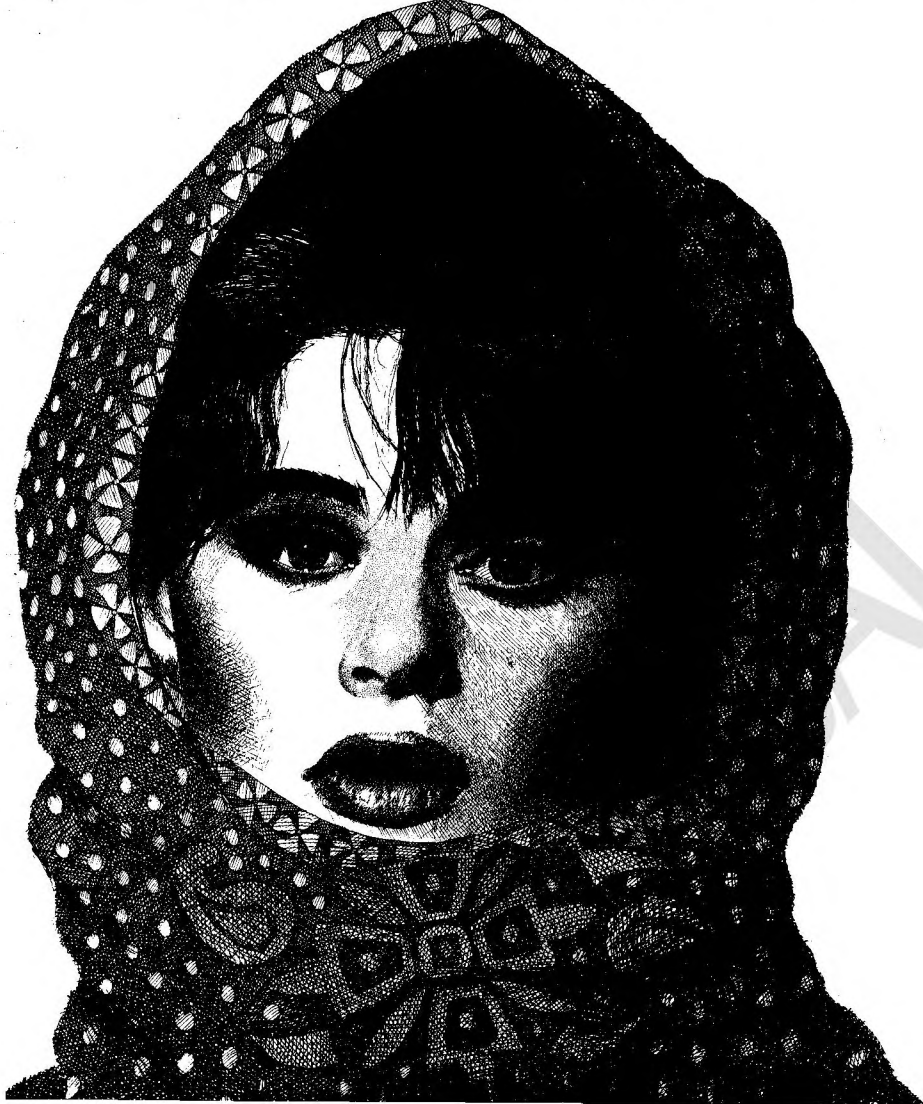
رینگتے ہوئے اس کے آخری سرے پر پہنچ گئے۔ نیچے غار میں کوئی نظر نہیں آرہا تھا لیکن قدموں کی دبی دبی آواز سنائی دے رہی تھی۔

سونیا کی اطلاع غلط نہیں ہوسکتی تھی۔ یقیناً ماسٹر کی آرہا ہوگا۔ اس کے چیلنج کے مطابق ہماری ٹیلی پیتھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ اس نے دعویٰ کیا تھا، میرے ہاتھ پاؤں توڑ کر مجھے معذور بنا کر دنیا والوں کے سامنے میرا عبرت ناک انجام پیش کرے گا۔ ایسے دعوے کرنے والا یقیناً ہاتھ پاؤں کا مضبوط ہوگا۔ یوں بھی یوگا میں مہارت حاصل کرنے والے جسمانی اور دماغی طور پر صحت مند اور طاقت ور ہوتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ وہ کس طرح ہمارے قابو میں آسکتا ہے۔ اس سلسلے میں یقیناً سونیا نے بھی کچھ سوچ رکھا ہوگا۔

میں نے لیٹے ہی لیٹے سر آگے بڑھا کر دیکھا نیچے غار کے ہال نما حصے میں دو مسلح عورتیں نظر آئیں۔ لیڈی روزینہ کے فارم کی عورتیں فوجی طرز کا مخصوص لباس پہنتی تھیں۔ اس وقت بھی وہ مخصوص وردی میں تھیں ان کے شانوں پر اسٹین گنیں لٹک رہی تھیں۔ ان کے بعد اور مسلح عورتیں آنے لگیں۔ ان میں سے ایک پارٹی لیڈر تھی۔ وہ آنے والی مسلح عورتوں کو ان کی ڈیوٹی کی جگہ بتاتی جارہی تھی۔ کچھ عورتیں اس کی ہدایت کے مطابق مختلف چٹانوں پر جاکر کھڑی ہوگئی تھیں۔ کچھ بڑے بڑے پتھروں کے پیچھے جاکر چھپ گئی تھیں۔ اس غار میں تاریکی تھی۔ مسلح عورتیں ہماری طرح اینٹی ڈارک گاگلز پہنے ہوئے تھیں۔

وہ جو میرے ساتھ چٹان پر اُلٹی لیٹی ہوئی تھی، تھکے ہوئے انداز میں کروٹ لے کر چاروں شانے چت ہوگئی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ انگلیوں کے اشارے سے کہہ رہی تھی "ابھی دیر ہے۔ یہ تمام مسلح عورتیں لیڈی روزینہ کے لیے احتیاطی تدابیر کر رہی ہیں۔"

وہ درست کہہ رہی تھی۔ روزینہ ان کی باس تھی۔ ماسٹر کی سے اگرچہ دوستانہ تھا۔ تاہم حفاظتی تدابیر لازمی تھیں۔ ان کے آنے تک میری سوچ کی لہروں نے پرواز کی، میں پھر شیبا اور آمنہ کے پاس پہنچ گیا۔

آمنہ کون ہے؟ میری داستان پڑھنے والے یہ اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس کے باوجود جب پرانے کردار سامنے آتے ہیں، میں ان کا تعارف بار بار کراتا ہوں کیونکہ اس داستان کو پڑھنے والوں میں ہر ماہ نئے قارئین کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ وہ نئے قارئین چاہتے ہیں کہ پڑھتے وقت ہر کردار کو اس کے واقعاتی تسلسل کے ساتھ سمجھتے جائیں۔

آمنہ کی زندگی بھی عجیب تھی۔ وہ ایک بے حد حسین دوشیزہ تھی لیکن خود کو بابر جلال کی بیوہ سمجھتی تھی۔ اس نے بابر کو ٹوٹ کر چاہا تھا۔ اس کی خاطر وہ نگر نگر گھومتی رہی تھی۔ آگ اور خون کے دریاؤں سے گزرتی رہی تھی۔ اس کی خاطر اس نے دہشت گردوں کی دنیا میں قدم رکھا تھا۔ وہاں رہ کر وہ آگ سے شعلہ بن گئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کوئی سا ہتھیار ہو، وہ سچا نشانہ لگاتی تھی۔ ہتھیار نہ ہو تب بھی مقابل آنے والوں کے چھکے چھڑا دیتی تھی۔ دشمنوں کی سرحدوں میں گھس کر بڑی بڑی تنظیموں اور سرکاری اداروں کے راز چرا لانا اس کے لیے بڑی بات نہیں تھی۔ وہ خطرات سے جان بوجھ کر کھیلتی تھی، اسے اپنی زندگی بوجھ لگتی تھی۔ اس کا محبوب بابر جلال اس دنیا میں نہیں رہا تھا اس لیے وہ بھی نہیں رہنا چاہتی تھی.... لیکن کوئی کارنامہ کرتے ہوئے جان دینا چاہتی تھی۔ شاید اسی لیے بڑی بے باکی اور بے خوفی سے خطرناک مہم سر کرلیتی تھی۔

وہ بابر جلال سے آخری بار اپنی شادی کے دن ملی تھی۔ وہ ایک دن کی دلہن تھی۔ ایک رات کی نہیں تھی کیونکہ اسے سہاگ رات گزارنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس سے پہلے ہی دشمنوں نے بابر کو اغوا کرلیا تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے اسے اغوا کیا جاتا تو دشمن ہرگز کامیاب نہ ہوتے۔ وہ موت بن کر ان پر جھپٹ پڑتی۔ اس نے اپنے گمشدہ شوہر کو تلاش کرنا شروع کیا۔ بعد میں پتا چلا، ماسٹر کی کے آدمیوں نے ایسا کیا ہے۔ پھر تو وہ ماسٹر کی کے لیے دردِ سر بن گئی تھی۔

وہ وقتاً فوقتاً ماسٹر کی کے سنڈیکیٹ سے تعلق رکھنے والے افراد کا سامنا کرتی تھی۔ پھر انھیں بڑی اذیتیں دے کر مار ڈالتی تھی — پہلے تو اُن سے بابر کا پتا دریافت کرتی تھی — پتا نہ ملنے پر ان کی لاش کے ساتھ ایک پرچی لکھ کر لگا دیتی تھی۔ وہ پرچی ماسٹر کی کے لیے چیلنج ہوتی تھی۔ اس پر لکھا ہوتا تھا "بابر کو واپس کرو۔ ورنہ تمھاری سنڈیکیٹ کا ایک آدمی بھی زندہ نہیں رہے گا۔"

اس نے اپنے محبوب کو حاصل کرنے کے لیے انتہائی کوششیں کیں۔ وہ بے چاری نہیں جانتی تھی کہ اس کا محبوب اور ایک دن کا شوہر انتہائی اذیتیں برداشت کرنے کے بعد مرچکا ہے۔ پھر میں بابر جلال کے روپ میں اس کے سامنے آیا۔ ڈاکٹر شیفرڈ نے پلاسٹک سرجری کے ذریعے مجھے سر سے پاؤں تک مکمل بابر جلال بنا دیا تھا۔ صرف آواز مختلف تھی جس کی وجہ سے وہ الجھتی رہتی تھی۔ میں نے بھی اسے یہ تاثر نہیں دیا کہ وہ مجھے بابر ہی سمجھے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ جو اپنے محبوب کو اتنی دیوانگی سے چاہتی ہے، میں اسے دھوکا دوں، اس کے محبوب کا روپ

اختیار کرکے اس کی محبت سے کھیلوں اور اس کی سچی محبت پر ایک بدنما داغ بن جاؤں۔

ویسے وہ خود پر ظلم کر رہی تھی۔ اتنی حسین تھی کہ کوئی بھی اُسے ہمیشہ کے لیے اپنا سکتا تھا۔ وہ آگ اور بارود سے کھیلنے والی عورت تھی مگر اُسے چاہنے والا تمام عمر اس پر شاعری کرسکتا تھا۔ کوئی اسے اپنانے والا میوہ کھانے کا عادی ہو تو اس کی آنکھوں کو بادامی کہتا۔ شراب پینے والا ہو تو اسے میخانہ کہتا۔ دودھ پینے والے بڑی بڑی کٹورا سی آنکھیں سمجھتے۔ شکار کرنے والے خوبصورت ہرنی کی آنکھوں سے تشبیہ دیتے۔ وہ آنکھیں غضب ناک بھی تھیں اور حیا پرور بھی۔ میں کئی بار ان آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بھٹکتے بھٹکتے رہ گیا۔ آخری بار اس سے ایک اسپتال میں ملاقات ہوئی تھی۔ میں زخموں سے چُور تھا اور اسے معلوم ہوچکا تھا کہ میں فرہاد علی تیمور ہوں۔ حقیقت معلوم ہونے پر اسے بڑا دکھ ہوا تھا۔ وہ مجھے بابر کی جگہ نہیں دیتی تھی لیکن بابر کی تصویر سمجھ کر میری قدر کرتی تھی۔ مجھے ہمیشہ اپنی آنکھوں کے سامنے رکھنا چاہتی تھی۔ جب وہ آخری بار میرے پاس آئی تو میں نے محبت اور ہمدردی سے کہا "آمنہ! میرے پاس آؤ، اتنی اداس کیوں ہو؟"

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میرے بستر کے پاس آئی تھی۔ مجھے ایسی نظروں سے دیکھا تھا جیسے اپنے بابر کو ڈھونڈ رہی ہو۔ میں نے اسے سمجھا دیا "میں تمھیں ساری حقیقت بتا چکا ہوں۔ تم نے کہا تھا، میں بابر نہ سہی اس کی زندہ تصویر ہوں۔ جب اپنے اس دنیا سے اُٹھ جاتے ہیں تو تسلی کے لیے ان کی تصویروں کو دیوار پر آویزاں کیا جاتا ہے۔ ان کی یاد تازہ ہوتی رہتی ہے — میں بھی آج ایک تصویر کی طرح تمھارے سامنے ہوں۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر کہہ رہی تھی "اگر تم کوئی اور ہوتے۔ فرہاد علی تیمور نہ ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا۔"

میں نے پوچھا تھا "میرے فرہاد ہونے پر تمھیں کیا اعتراض ہے؟"

اس نے سرد آہ بھر کر کہا تھا "تم بہت مہنگے ہو۔ بہت ریزرو رہتے ہو۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں، کوئی تم سے ملنا چاہے تو اسے دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑنا پڑتا ہے۔ تم کوئی اور ہوتے تو میں ہر قیمت پر تمھیں حاصل کرلیتی اور اپنے ساتھ رکھتی۔ خدا گواہ ہے کہ ساتھ ضرور رکھتی مگر تمھیں بابر کا مقام کبھی نہ دیتی۔"

ایسا کہتے وقت وہ میرے چہرے پر جھک گئی تھی۔ مجھے خوب غور سے دیکھ رہی تھی۔ میرے چہرے کا ایک ایک نقش بابر کے نقوش کا پرتو تھا۔ میں نے کہا "میں تمھاری صلاحیتوں کو ضائع نہیں ہونے دوں گا۔ تم کہیں بھٹکنے کے لیے نہیں جاؤ گی۔ ہمارے ساتھ رہو گی۔ اعلیٰ بی بی تمھیں بابا فرید واسطی صاحب کے ادارے میں پہنچائے گی۔ وہاں کے امتحانات پاس کرنے کے بعد تم ہماری ٹیم میں شامل ہوجاؤ گی۔ بولو، ہمارے ساتھ رہنا پسند کرو گی؟"

اس نے پھر ایک گہری سانس لے کر کہا تھا ؎

"اے شمع تیری عمر طبعی ہے ایک رات
ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

اور میں رونا نہیں جانتی۔ ہنستے ہنستے پہاڑ جیسی زندگی گزار دوں گی۔ اس سے زیادہ مناسب اور کیا ہوسکتا ہے کہ مجھے بابا فرید واسطی صاحب کے ادارے میں جگہ مل جائے اور میں تم لوگوں میں شامل ہوجاؤں۔"

وہ دن ہے اور آج کا دن، آمنہ ہمارے ساتھ رہی تھی۔ وہ تین ماہ تک ادارے میں رہ کر انسانی نفسیات کی اسٹڈی کرتی رہی۔ شیخ الفارس نے اسے بتایا کہ دشمن کے نفسیاتی عمل اور ردِعمل کو، اس کے جذبات اور اس کے احساسات کو کس طرح سمجھنا چاہیے اور کس طرح اپنی مرضی کے مطابق اسے عمل اور ردِعمل پر مجبور کرنا چاہیے۔

اسے نشانہ بازی کی مشق کرانے اور خالی ہاتھ مقابلہ کرنے کے طور طریقے سکھانے کی قطعی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو دہشت گردوں میں رہ کر بندوق سے نکلی ہوئی اندھی گولی بن گئی تھی۔ تین ماہ کے بعد اسے بہت ہی خفیہ طریقے سے اسرائیل پہنچا دیا گیا۔ جناب شیخ الفارس نے پہلے ہی آنے والے وقت کو بھانپ لیا تھا۔ شیبا جس دن ہمارے ادارے میں پہنچی، اسی دن سے انھوں نے سوچنا شروع کیا کہ حکومتِ اسرائیل کی طرف سے بڑا سخت ردِعمل ہوگا اور بڑی سازشیں ہوں گی۔ بابا صاحب کے ادارے سے کامیاب ہونے والے دنیا کے ہر ملک، ہر شہر میں پہنچتے تھے اور نمایاں مقام حاصل کرنے کی کوششیں کرتے رہتے تھے۔ ان میں سے کچھ افراد ایسے تھے جو تل ابیب میں پہلے سے موجود تھے۔ وہاں کی ایک سیکورٹی فورس عورتوں کے لیے مخصوص تھی۔ اس فوج میں ایسی عورتوں کو بھرتی کیا جاتا تھا جو لاوارث ہوتی تھیں یا اس بات کی قسم کھاتی تھیں کہ سیکورٹی فورس میں داخل ہونے کے بعد وہ اپنے عزیزوں، رشتے داروں سے، دوست احباب سے کبھی کوئی تعلق نہیں رکھیں گی۔ نہ ہی کسی قسم کا رابطہ ان سے قائم ہوگا اور نہ وہ زندگی کے کسی حصے میں ان سے ملنے کی خواہش کریں گی۔

ایسی لڑکیوں کو ٹریننگ کے دوران ایک بہت بڑے قلعہ نما ہاسٹل میں رکھا جاتا تھا جہاں صرف فوج کے چند اعلیٰ افسران ہی جاسکتے تھے۔ ان احتیاطی تدابیر کا مقصد یہ تھا کہ یہ لڑکیاں نہ تو کسی سے تعلق رکھیں گی۔ نہ کسی سے جذباتی رشتہ ہوگا

میں تہ خانے کے فرش پر پہنچ گیا۔ وہاں مجھے ایک بڑا سا کمرہ دکھائی دیا۔ کمرے کے وسط میں ایک پلنگ بچھا ہوا تھا۔ بستر پر لیڈی روزینہ برائے نام لباس میں تھی۔ اس کے جسم سے کتنے ہی سانپ لپٹے ہوئے تھے۔ وہ دہشت زدہ نہیں تھی، نہ ہی کسی تکلیف میں مبتلا تھی۔ وہ تو لطف حاصل کر رہی تھی اور ان سانپوں کے جسم پر رینگنے سے خوشی محسوس کرتے ہوئے کراہنے کے انداز میں منہ سے آوازیں نکال رہی تھی۔

اس نے مجھے مخاطب کیا۔ ”فرہاد!“

میں نے چونک کر دیکھا۔ پلنگ کے قریب رکھے ہوئے کیسٹ ریکارڈر سے آواز آ رہی تھی۔ ”یہ ہمارے سہاگ کا کمرہ ہے اور آج ہماری سہاگ رات ہے۔ ان دیواروں سے لگے ہوئے لوگوں کو دیکھو۔ یہ زندہ نظر آئیں گے لیکن مردہ ہیں۔“

میں زینے کے نچلے حصے میں کھڑا ہوا وہیں سے نظریں دوڑا رہا تھا۔ وہاں مجھے دس افراد نظر آئے۔ وہ سب ایک دوسرے سے دور دیواروں سے لگے کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھ سامنے بندھے ہوئے تھے جیسے وہ لیڈی روزینہ کے سامنے ہاتھ باندھے سر جھکائے کھڑے ہوں۔ کیسٹ ریکارڈر سے جو نسوانی آواز سنائی دے رہی تھی، میں نے اس کے لب و لہجے کو گرفت میں لے کر خیال خوانی کی مگر اس کے دماغ میں نہیں پہنچ سکا۔ وہ بولنے والی اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی تھی۔

کیسٹ ریکارڈر سے اس کی آواز سنائی دے رہی تھی جیسے خود لیڈی روزینہ بول رہی ہو۔ ”دیکھو ان لوگوں کو دیکھو۔ یہ میرے سابقہ شوہر ہیں جو مجھے پسند آجاتے ہیں انہیں یہاں لے آتی ہوں مگر مجھے مَردوں سے نہیں، سانپوں سے محبت ہے۔ میں ان سے کہتی رہی اگر مجھ سے محبت ہے، مجھے حاصل کرنا چاہتے ہو تو میرے جسم سے تمام سانپ نوچ کر کچل دو۔ اپنی مردانگی کا ثبوت دو پھر مجھے حاصل کر لو۔ انہوں نے ایسا ہی کیا مگر مردانگی کا ثبوت دیتے دیتے اس حال کو پہنچ گئے۔ میں نے ان کی لاشوں کو مختلف ادویات کے مرکبات سے محفوظ کر لیا۔ ان میں تمہارا بھی اضافہ ہو جائے گا۔“

وہ بڑے اعتماد سے کہہ رہی تھی کیونکہ میری واپسی کا راستہ بند ہو چکا تھا۔ میں اگر باتھ روم کا دروازہ توڑ کر جانا چاہتا تو خوابگاہ کے دروازے پر بجلی کی رَو دوڑ رہی تھی، وہاں میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

”فرہاد علی تیمور! اچھی طرح سوچ لو۔ تمہاری واپسی ممکن نہیں ہے۔ زندہ رہنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ ان سانپوں کو میرے جسم سے الگ کر دو، انہیں کچل ڈالو، پھر میں ہمیشہ کے لیے تمہاری ہو جاؤں گی، تمہارے لیے زندگی کا راستہ بھی کھل جائے گا اور یہ دنیا پہلے کی طرح ایک سرے سے دوسرے سرے تک تمہاری ہو گی۔“

میں نے اس کے خوبصورت جسم سے لپٹے ہوئے سانپوں کو دیکھا پھر ایک قدم آگے بڑھ کر رک گیا۔ چاروں طرف نظریں دوڑانے لگا۔ کسی ایسی چیز کی تلاش تھی جس کے ذریعے دور ہی دور رہ کر سانپوں کو اس سے الگ کر سکوں۔ اچانک میرے حلق سے ہیں چیخ نکل گئی۔ یوں لگا جیسے جسم میں انگارے بھر گئے ہوں۔ میں نے ایک دم سے پیچھے ہٹ کر دیکھا۔ جانے کہاں سے ایک سانپ میرے قدموں کے پاس چلا آیا تھا اور اس نے مجھے ڈس لیا تھا۔ میں ایک دم سے چکرا گیا، لڑکھڑا کر گرتے گرتے ایک دیوار کا سہارا لے کر سنبھل گیا۔ میں گرنا نہیں چاہتا تھا، میں مرنا نہیں چاہتا تھا مگر انگارے جسم میں لہو کی طرح دوڑ رہے تھے۔ زہر تیزی سے پھیل رہا تھا۔ میں اپنے پیروں پر کھڑا نہ رہ سکا۔ آہستہ آہستہ دیوار کے سہارے کو چھوڑ کر فرش پر گر پڑا۔

میں گرنا نہیں چاہتا تھا مگر گر چکا تھا۔ اب مرنا نہیں چاہتا تھا مگر سانپ کے زہر سے کوئی بچا نہیں سکتا تھا۔ میرا سر چکرا رہا تھا۔ در و دیوار گھوم رہے تھے آنکھوں کے سامنے روشنی بجھ رہی تھی اندھیرا چھا رہا تھا۔ زندگی پر آہستہ آہستہ موت کی تاریکی غالب آ رہی تھی۔ ایسے ہی وقت مَیں نے اس ڈوبتی ہوئی روشنی میں منجالی کو دیکھا۔

منجالی! میری محبوبہ تم اس دنیا میں نہیں رہیں۔ پھر کہاں سے چلی آئی ہو؟

کیا تم سونیا ہو؟

نہیں، وہ سونیا نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ وہ میرے قدموں میں جھک گئی تھی۔ جہاں سانپ نے ڈس لیا تھا وہاں اپنے ہونٹ رکھ دیے تھے اور زہر چوس رہی تھی۔ یہ ہُنر سونیا کو نہیں آتا۔ صرف منجالی کو آتا تھا۔

لیکن پھر بھی وہ منجالی نہیں تھی۔ اگرچہ میرا ذہن ڈوب رہا تھا پھر بھی اس حد تک سوچنے کے قابل تھا کہ مَیں تصوّر میں منجالی کو دیکھ رہا ہوں اور تصور ہی میں وہ میرے جسم سے زہر کو چوس رہی ہے۔

یا خدا! یہ کیا ماجرا ہے؟

نجمہ مودی

مغرب میں شادی اور طلاق کوئی اہم مسئلہ نہیں رہا۔ اسی لیے اکثر لوگ بے سوچے سمجھے شادی کر لیتے ہیں کیونکہ غلطی کا احساس ہونے کے بعد طلاق لینے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی لیکن یہ آسانی کبھی کبھی عذابِ جاں بن جاتی ہے۔

ایک لڑکی کا ماجرا جس نے شادی کے چھ دن بعد طلاق لے لی تھی

وہ بار اس علاقے میں نیا ہی کھلا تھا اور چند دن سے سراغرساں جارج ہیڈگ کا معمول بن گیا تھا کہ ڈیوٹی سے واپسی پر ایک گلاس بیئر پینے کے لیے وہاں رک جاتا تھا۔ اس جگہ سے اس کا گھر بھی صرف تین بلاک کے فاصلے پر تھا۔

اس روز بھی وہ بار میں داخل ہوا تو بارٹینڈر ہیرالڈ نے اسے خوش آمدید کہا۔ ایک طرف سنہرے بالوں اور چوڑے شانوں والی وہی دلکش لڑکی بیٹھی پیانو پر ایک مقبولِ عام نغمے کی دُھن

بجارہی تھی جس کا نام جارج کی معلومات کے مطابق میڈلین تھا۔ جارج کو آج تک اس سے ہمکلام ہونے کا اتفاق نہیں ہوا تھا لیکن بار میں آتے ہوئے اسے اتنے دن تو ہو ہی چکے تھے کہ اب وہ اچھی طرح ایک دوسرے کے صورت آشنا ہو چکے تھے۔

آج میڈلین کچھ افسردہ لگ رہی تھی۔ وہ پیانو ٹھیک بجا رہی تھی لیکن آج شاید نغمے کے زیر و بم میں اس کی اپنی دھڑکنیں اور لگن شامل نہیں تھی۔ وہ بے دلی سے پیانو بجا رہی تھی۔

جارج نے گلاس خالی کر کے کاؤنٹر پر رکھا تو ہیرالڈ نے اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔ "دوبارہ بھروں؟"

"نہیں ــــ اب تو مجھے صرف سگریٹ کی ضرورت ہے اور وہ میرے پاس ہے نہیں۔" جارج نے جیبوں پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"لاؤنج میں مشین رکھی ہے ـــ جا کر اس میں ریزگاری ڈالو اور اپنے برانڈ کا پیکٹ نکال لو۔" ہیرالڈ نے اسے سیدھا سادا طریقہ یاد دلایا۔

جارج اٹھ کر لاؤنج میں آ گیا۔ مشین سے پیکٹ نکالنے اور سگریٹ سلگانے میں ۔۔۔۔۔ اسے چند سیکنڈ لگ گئے۔ وہیں کھڑے کھڑے اس نے پہلا کش لیا۔ دفعتاً سسکی کی آواز سن کر وہ پلٹا۔

میڈلین اس کے عقب میں کھڑی تھی۔ اس کی خوب صورت آنکھیں متورم تھیں۔ شاید کچھ دیر پہلے وہ روتی رہی تھی۔ اس وقت بھی وہ آنکھیں چھلکنے کو بے تاب تھیں اور شاید بڑی مشکل سے وہ آنسوؤں کے سیلاب پر پلکوں کا بند باندھے کھڑی تھی۔

"کیا بات ہے ۔۔۔۔ کیا تمھیں کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہے؟" جارج نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔ لیکن لڑکی گویا اس کی موجودگی سے بے خبر کھوئی کھوئی نظروں سے اس کے عقب میں دیکھ رہی تھی۔ جارج نے مڑ کر دیکھا تاکہ جان سکے آخر لڑکی کی نظریں اس طرح کس پر مرکوز ہیں۔ لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔

"تم نے میری آواز سنی؟" جارج نے ملائمت سے کہا۔

"ہاں ـــ سن لی۔" وہ سرگوشی کے سے انداز میں بولی ـــ "لیکن تم میری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔" پھر وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اس کے قریب سے گزرتی چلی گئی۔

"بہتر یہی ہے کہ میں بھی اپنے گھر جاؤں۔" جارج نے کندھے اُچکاتے ہوئے سوچا۔

وہ گھر پہنچا تو اس کی بیوی شیلا اپنی پڑوسن اتھل سے مستعار لیا ہوا مرتبان نما ہیئر ڈرائر اپنے سر پر فٹ کیے بیٹھی تھی۔

"سائنسی ایجادات نے سب سے زیادہ فائدہ عورتوں کو پہنچایا ہے۔" جارج ٹھنڈی سانس لے کر جوتے اتارتے ہوئے بولا۔

"مردوں کو بھی پہنچایا ہے مگر وہ شکر گزار نہیں ہوتے۔" شیلا مسکراتے ہوئے بولی پھر اسے گویا ایک خاتونِ خانہ کی حیثیت سے اپنے فرائض یاد آ گئے۔

"آج میں نے تمھارے لیے کلیجی کی بوٹیاں روسٹ کی ہیں۔ کھانے سے پہلے بیئر کا ایک گلاس پینا پسند کرو گے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں ـــ آفس سے اٹھتے وقت مورس کے ساتھ آفس میں ہی ایک گلاس پی لیا تھا اور وہاں سے سیدھا گھر آ رہا ہوں۔ اب دل نہیں چاہ رہا۔" جارج نے اپنی بیوی کو یہ بتانا بہتر نہیں سمجھا تھا کہ چند دن سے وہ راستے میں ایک بار میں رکنے لگا ہے۔ بس یہ ایک یونہی سا، بے ضرر سا، غیر اہم سا جھوٹ تھا جو خواہ مخواہ زندگی میں در آتا ہے ـــ شاید وہ لاشعوری طور پر خوفزدہ تھا کہ اس کی بیوی نتیجے یہ تاثر نہ لیں کہ باہر وہ نہ جانے کیا کیا عیاشی کرتا پھر رہا ہے۔

"کیا واقعی تم بیئر نہیں لو گے؟" اس کی بیوی نے گویا تصدیق چاہی۔

"زندگی میں کچھ چیزیں بیئر سے زیادہ اہم ہوتی ہیں۔۔۔" اس نے فلسفیانہ لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے ـــ اگر تمھارا تقریر کرنے کا موڈ ہے تو تم تقریر جاری رکھو۔ میں اس دوران سینڈوچ تیار کرتی ہوں۔" شیلا کچن کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

وہ اس وقت کچن میں کھانا ہی تیار کر رہی تھی جب کال بیل بج اٹھی۔ جارج نے غیر ارادی طور پر دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھا۔ پونے بارہ بج چکے تھے۔ اس وقت تو کسی ضرورت کے تحت ہی کوئی آ سکتا تھا۔

"جارج! ذرا تم ہی باہر جا کر دیکھو کون ہے۔" شیلا بولی۔ "میرے بال تو اس وقت جس حالت میں ہیں ان کے ساتھ میں کارٹون ہی لگوں گی۔ میرا خیال ہے میں ان پر کوئی تولیہ لپیٹ لوں۔"

جارج نے سست قدموں سے جا کر دروازہ کھولا اور ایک لمحے کے لیے دم بخود سا رہ گیا۔ اس کے سامنے میڈلین کھڑی تھی۔ اسی طرح افسردہ و مغموم جس طرح جارج نے اسے بار میں دیکھا تھا۔

"آپ کا نام جارج ہیڈلگ ہے نا؟" اس کی آواز دھیمی اور گویا آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی لیکن پھر بھی رات کے سناٹے اور سکوت میں خاصی بلند محسوس ہوئی۔

"کون آیا ہے جارج؟" اندر سے شیلا نے پکارا اور پھر وہ جواب کا انتظار کیے بغیر بالوں پر تولیہ لپیٹتی ہوئی خود ہی دروازے پر آ گئی۔ جارج تب بھی کچھ نہ بول سکا۔ اس کی زبان گویا تالو سے چپک کر رہ گئی تھی۔

"کون ہے یہ؟" شیلا نے میڈلین کو گھورتے ہوئے پوچھا۔ "تم اسے جانتے ہو؟"

"کسی حد تک۔۔۔" اس نے احمقانہ انداز میں کہا۔ "وہ دراصل ۔۔۔۔ چند دن سے میں سگریٹ وغیرہ خریدنے کے لیے ایک بار میں رُکتا ہوں تو وہاں ۔۔۔"

وہ جملہ مکمل نہ کر سکا۔ شیلا خاموشی سے ایک ٹک اسے گھور رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں مجروح اعتبار کی پرچھائیاں تھیں اور جارج کو پہلی بار تجربہ ہوا تھا کہ سچ اگر غیر ضروری تاخیر کے ساتھ بولا جائے تو وہ الجھا ہوا جھوٹ معلوم ہونے لگتا ہے۔

میڈلین ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔ "مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ پولیس سراغرساں ہیں۔ آج رات جب آپ نے مجھ سے بات کی مجھے اس وقت بھی معلوم نہیں تھا۔۔۔"

جارج کا چہرہ تاثرات سے عاری تھا۔ میڈلین نے مضطربانہ سے انداز میں اس کے چہرے سے نظر ہٹا کر شیلا کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ناپسندیدگی، تناؤ اور وہ سبھی کچھ تھا جو کسی کو اپنی بات مکمل کرنے سے باز رکھ سکتا ہے۔ تاہم وہ نروس سے انداز میں بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "جب کوئی انسان کسی کو روزانہ باقاعدگی سے ایک جگہ آتے دیکھتا ہے تو لاشعوری طور پر اس سے کچھ شناسائی سی محسوس ہونے لگتی ہے۔۔۔ مبہم سا اعتماد ہو جاتا ہے اس پر۔۔۔۔ مجھے بارٹینڈر ہیرالڈ نے آپ کا ایڈریس بتایا۔۔۔ لیکن میرا خیال ہے میں نے یہاں آ کر اچھا نہیں کیا۔۔۔"

"بارٹینڈر نے آپ کو غالباً یہ نہیں بتایا کہ یہ پولیس آفیسر بے چارہ شادی شدہ ہے۔" شیلا نے لقمہ دیا ـــ لہجہ ویسا ہی کٹیلا تھا جیسا غلط فہمی کے عالم میں کسی بیوی کا ہو سکتا ہے۔

"دیکھو۔۔۔۔ یہ سب ٹھیک نہیں ہے۔۔۔" جارج کو بات صاف کرنے کے لیے مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے اور وہ محسوس کر رہا تھا کہ غلط فہمی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی ہے اور پھر جلد بازی میں اپنی پوزیشن صاف کرنے کے لیے اسے فرار اور رُکھائی کا راستہ ہی مناسب دکھائی دیا۔

"دیکھیے مس۔۔۔۔!" اس نے اپنی تمام تر دلی ہمدردی کے باوجود اپنے لہجے میں لاتعلقی سموتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ کو واقعی پولیس کی مدد کی ضرورت ہے تو آپ اس نمبر پر فون کریں۔۔۔!" اس نے فون نمبر بتایا۔ "اس نمبر پر پولیس والے ہر وقت ڈیوٹی پر موجود ہوتے ہیں۔"

لڑکی کے ہونٹ یک بارگی کپکپائے اور وہ مایوس و مجروح لہجے میں بولی۔ "نہیں۔۔۔ بات کچھ اتنی زیادہ اہم نہیں ہے۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔ دراصل میں سمجھتی تھی کہ آپ ہیرالڈ کے اچھے دوست ہیں۔"

وہ تیزی سے مڑی اور واپس لفٹ کی طرف چل دی۔ جارج آواز دے کر اسے روکنا چاہتا تھا مگر اس کے بجائے اس نے دروازہ بند کر لیا۔ وہ اپنے آپ کو کسی وضاحت کے قابل نہیں پا رہا تھا تاہم اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بولا۔ "شاید تم سمجھ رہی ہو کہ میں نے جان بوجھ کر اس بات کا ذکر نہیں کیا تھا کہ میں راستے میں ایک بار میں رکتا ہوں؟"

شیلا نے جواب دینے کی بھی زحمت نہیں کی اور واپسی کے لیے مڑ گئی۔ چند لمحے بعد جارج نے بیڈ روم کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنی ـــ وہ تھکے تھکے انداز میں کچن میں آ گیا اور میز پر بیٹھ کر بے دلی سے کھانا حلق سے اتارنے لگا۔

❚❚❚

دوسری شام وہ دفتر سے سیدھا گھر پہنچا اور یہ دیکھ کر اسے خوشگوار سی حیرت ہوئی کہ شیلا کا موڈ بالکل ٹھیک تھا۔ وہ بچوں کو نہلا کر باتھ روم سے باہر لا رہی تھی۔ اس نے حسبِ معمول گرمجوشی اور محبت سے جارج کا استقبال کیا۔

"اب تم خفا تو نہیں ہو؟" جارج پوچھے بغیر نہیں رہ سکا۔

"حقائق معلوم ہو جائیں تو پھر ناراضگی کا جواز باقی نہیں رہتا۔" وہ مسکرائی۔ "وہ لڑکی تقریباً ایک گھنٹا پہلے یہاں آئی تھی۔۔۔۔ کام پر جا رہی تھی اُس وقت ـــ وہ یقیناً ایک اچھی لڑکی ہے تبھی اس نے آنے کی زحمت کی ـــ اسے احساس ہو گیا تھا کہ اس کی آمد کی وجہ سے ہمارے درمیان غلط فہمی پیدا ہو چکی ہے اور وہ غلط فہمی دور کرنے آئی تھی۔ اس نے ساری بات مجھے بتائی کہ وہ درحقیقت تم سے صرف صورت کی حد تک شناسا تھی۔۔۔۔ اور یہ کہ تم صرف ایک گلاس بیئر کے لیے کچھ دیر بار میں رکتے تھے۔"

"شکر ہے تمھاری غلط فہمی دور ہوئی۔" جارج نے سکون کی سانس لی۔ "سچی بات یہ ہے کہ آج میں سارا دن اسی کے بارے میں سوچتا رہا ـــ اس کا مسئلہ کیا تھا؟ اس نے اس سلسلے میں کچھ بتایا؟"

"اس کا مسئلہ اس کا سابق شوہر ہے۔" شیلا بولی۔ "گزشتہ رات اس نے بیرونِ شہر سے تین مرتبہ اسے فون کیا تھا کہ وہ نیویارک کی طرف روانہ ہو چکا ہے اور یہاں آ کر وہ اس سے نمٹے گا۔"

"غالباً کوئی بدفطرت آدمی ہے یہ سابق شوہر ـــ اسی لیے وہ

اتنی پریشان ہے۔"

"معلوم تو یہی ہوتا ہے لیکن اس نے کچھ بتایا نہیں۔" شیلا بولی۔ "وہ کہہ رہی تھی کہ کچھ وجوہات کی بنا پر وہ پولیس کے پاس جانا نہیں چاہتی لیکن اسے بہر حال مدد اور مشورے کی ضرورت تھی۔"

"اور میں نے خوب اس کی مدد کی۔" جارج طویل سانس لے کر بولا۔

"اگر تم نے بچّوں کی طرح ایک بے ضرر سی حقیقت کو نہ چھپایا ہوتا تو اتنی غلط فہمی پیدا نہ ہوتی۔" شیلا بولی۔ "بہر حال آج وہ لڑکی کل کی نسبت کچھ پُرسکون تھی لیکن اب بھی وہ بے حد خوف زدہ معلوم ہوتی ہے۔"

"اپنے موجودہ شوہر کا کوئی ذکر کیا اس نے؟"

"ہاں ... اور اس کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے موجودہ شوہر سے اسے بے حد محبّت ہے اور درحقیقت اسے یہی احساس سب سے زیادہ پریشان کر رہا ہے کہ اس کا سابق شوہر یہاں آکر جو کچھ بھی کرے گا اس کے بعد اس کے موجودہ شوہر کے کیا احساسات ہوں گے اور وہ کیا سوچے گا۔ اوپر سے وہ بے چاری آج کل امید سے بھی ہے۔"

پھر ایک لمحے کے توقف سے شیلا بولی۔ "میرا خیال ہے تھوڑا بہت کھانا کھا کر تم اس بار کا ایک چکّر لگا ہی لو۔ وہ اچھی لڑکی ہے۔ مجھے اس سے ہمدردی ہو گئی ہے۔"

جارج بار میں پہنچا تو میڈلین وہاں نہیں تھی۔ پیانو بند پڑا تھا البتہ جیوک بکس کے ذریعے موسیقی کی کمی پوری کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

"کیا پیو گے سارجنٹ؟" ہیرالڈ نے پوچھا۔

"حقیقت میں تو میں میڈلین کو دیکھنے آیا تھا۔" جارج نے حقیقت بیانی سے کام لیا۔

"وہ تو آج آئی ہی نہیں اور نہ ہی اس نے فون کیا۔ اسے یہاں کام کرتے ہوئے دو مہینے ہوئے ہیں اور اس دوران یہ پہلا اتفاق ہے کہ وہ بغیر اطلاع کے غیر حاضر ہے۔"

"اور اگر میں تمھیں یہ بتاؤں کہ ڈیوٹی کا وقت شروع ہونے سے پانچ منٹ پہلے وہ اسی علاقے میں آس پاس ہی کہیں موجود تھی اور اس کا اپنے کام پر آنے کا ارادہ بھی تھا، تو تم کیا کہو گے؟" جارج بولا۔

"میں صرف حیرت کا اظہار ہی کر سکوں گا۔" ہیرالڈ بولا پھر جیسے اُسے کچھ یاد آیا۔ "ویسے اس کے ڈیوٹی ٹائم سے ذرا ہی پہلے یہاں ایک شخص اس کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔"

"کون تھا وہ؟ اپنے بارے میں کچھ بتایا اس نے؟" جارج نے دلچسپی سے پوچھا۔

"کوئی خاص نہیں بتایا... بس کہہ رہا تھا کہ وہ بھی ایک موسیقار ہے اور میڈلین کا پرانا دوست ہے۔ بقول اس کے وہ پیانو کے کسی پروگرام کے سلسلے میں میڈلین سے بات کرنا چاہتا تھا۔ وہ میری ہی طرح مختصر قد کاٹھ کا آدمی تھا لیکن مجھ سے کہیں کم عمر تھا۔" ہیرالڈ نے بتایا۔

"تمھارے خیال میں کیا وہ میڈلین کا سابق شوہر ہو سکتا تھا؟" جارج نے پوچھا۔

"میں میڈلین کی شخصیت یا اس کے ماضی کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتا۔" ہیرالڈ بولا۔ "اگر تم بہتر طور پر معلومات حاصل کرنا چاہتے ہو تو اوبرین سے بات کر لو۔"

اوبرین اس بار کے مالک کا نام تھا اور وہ اس وقت کاؤنٹر کے دوسرے سرے پر بیٹھا نقدی کی مشین پر حساب کتاب کر رہا تھا۔ وہ بھی جارج کو اچھی طرح جانتا تھا۔

جارج اس کے قریب پہنچ کر بلا تمہید بولا۔ "تم تو میڈلین سے اچھی طرح واقف ہو۔ اس کا سابق شوہر کون تھا؟"

"میڈلین سے میری واقفیت شکاگو میں ہوئی تھی۔" اوبرین کام روکتے ہوئے بولا۔ "اور جس شخص کی تم بات کر رہے ہو اسے صحیح طور پر میڈلین کا سابق شوہر بھی نہیں کہا جا سکتا۔ صرف چھ دن ان کی شادی برقرار رہی تھی پھر جیریج نے میڈلین کی درخواست پر وہ شادی منسوخ کر دی تھی۔ میڈلین ناسمجھی اور نادانی میں اس سے شادی کر بیٹھی تھی۔ وہ بدمعاش اور آوارہ تھا۔"

"نام کیا تھا اس کا؟"

"فرینکی کوبن۔ وہ بھی پیانو نواز ہے اور بہت اچھا موسیقار ہے لیکن انہی لوگوں میں سے ہے جن کی تمام تر صلاحیتیں برائیوں میں صرف ہوتی ہیں۔ شادی کے فوراً بعد میڈلین پر اس کا اصل روپ آشکار ہوا۔ چھ دن بعد وہ شادی ختم ہو گئی اور مزید چھ دن بعد فرینکی جیل چلا گیا۔" اوبرین نے بتایا۔

"کس سلسلے میں؟" جارج نے پوچھا۔

"قتل اور منشیات کے چکّر میں۔" اوبرین نے جواب دیا۔ "یہ تقریباً چھ سال پہلے کی بات ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ ابھی تک جیل میں ہی ہو گا۔"

"ظاہری طور پر کس قسم کا آدمی ہے وہ؟"

"مختصر الوجود ہے۔ بال گھونگھریالے اور نقوش بے حد تیکھے ہیں۔ اس کی شکل میں اداکار ٹونی پاور کی خاصی شباہت جھلکتی ہے۔" اوبرین نے بتایا۔

جارج نے اس کا شکریہ ادا کیا اور بارٹینڈر ہیرالڈ کے پاس واپس آگیا۔

"وہ شخص جو میڈلین کے بارے میں پوچھ رہا تھا اس نے تم سے میڈلین کا ایڈریس تو معلوم نہیں کیا تھا؟" اس نے ہیرالڈ سے پوچھا۔ ہیرالڈ نے نفی میں سر ہلایا۔

"اس سے ہمیں یہ مطلب اخذ کرنا چاہیے کہ ایڈریس اسے پہلے ہی معلوم ہوگا۔" جارج نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔ ہیرالڈ سے مزید کچھ معلومات حاصل کرنے کے بعد وہ میڈلین کے اپارٹمنٹ کی طرف روانہ ہوگیا۔

زیرِ زمین ٹرین کے ذریعے سفر کرتے وقت وہ ساری باتیں اپنے ذہن میں دہرا رہا تھا۔ میڈلین نے تقریباً ایک سال قبل ایک آئرش نوجوان اسٹیو سے شادی کرلی تھی جو چند پارٹنرز کے ساتھ مل کر ہائی وے پر ایک گیس اسٹیشن تعمیر کرنے کے لیے دن رات محنت کر رہا تھا۔ وہ راتوں کو دیر تک کام کرتا تھا اسی لیے میڈلین نے بھی بار میں پیانو بجانے کا کام شروع کر دیا تھا۔ اس طرح اسے رات کو دیر تک اپارٹمنٹ میں تنہا رہنے سے بھی نجات مل گئی تھی اور مالی فائدہ بھی اپنی جگہ تھا۔

باضابطہ طور پر وہ اسی لیے پولیس کے پاس جانے سے خوف زدہ تھی کہ کہیں ہنگامہ بڑھ نہ جائے، کسی قسم کی رسوائی نہ ہو جو اس کے شوہر کے کاروبار کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہو۔ ویسے بھی اسٹیو ایک باڈی بلڈر ٹائپ نوجوان تھا۔ میڈلین کو اندیشہ تھا کہ وہ فرینکی سے تصادم کی نوبت آنے پر ویسے ہی کہیں طیش میں اس کی گردن نہ مروڑ دے اور یوں ان کا مستقبل تاریک ہو جائے جس کے لیے وہ دونوں میاں بیوی اتنی جدّوجہد کر رہے تھے۔

منزل پر پہنچ کر جارج اس عمارت میں داخل ہوا۔ لابی میں کھڑا ہو کر وہ ابھی مطلوبہ فلیٹ کی کال بیل کا بٹن دبانے کا ارادہ کر رہا تھا تاکہ لفٹ کا دروازہ اس کے لیے کھل جائے، کہ عقب میں میڈلین کی آواز سن کر وہ چونک کر مڑا۔

"میں نے تمھیں سڑک کے دوسری طرف سے دیکھ لیا تھا۔" وہ قدرے طمانیت بھرے لہجے میں بولی "میں اس وقت ایک کام سے سڑک پار گئی ہوئی تھی۔" اس کے لہجے میں طمانیت شاید جارج کو دیکھ کر آئی تھی۔ جارج نے اپنے ضمیر پر سے بوجھ کم ہوتا محسوس کیا۔

"شاید تم سوچ رہے ہو کہ میں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی گھبراہٹ کا مظاہرہ کرتی پھر رہی ہوں۔" وہ معذرت خواہانہ لہجے میں بولی۔

"میں اپنی بیوی کی طرح جلد نتائج اخذ کرنے کا عادی نہیں ہوں۔" وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا "آج تم جب میرے گھر سے رخصت ہو کر بار میں جانے کے ارادے سے روانہ ہوئیں تو وہاں پہنچیں کیوں نہیں؟"

"آج خدا مجھ پر مہربان تھا۔" وہ دھیمی آواز میں بولی "میں ابھی بار سے باہر ہی تھی کہ میں نے کسی کو اندر جاتے دیکھ لیا۔۔۔ جس طرح اس وقت میں نے دور سے تمھیں آتے دیکھ لیا۔"

"وہ غالباً فرینکی کوہن تھا؟" جارج نے تصدیق چاہی۔

"اوہ.... تو تم غالباً تمام معلومات حاصل کر کے آئے ہو۔" میڈلین نے گہری سانس لی۔

"فرینکی کو بار میں داخل ہوتے دیکھنے کے بعد تم کہاں گئی تھیں؟" جارج نے پوچھا۔

"پہلے تو میں وہیں جامد و ساکت کھڑی رہ گئی تھی۔" وہ جھرجھری لے کر بولی "وہ تو شکر ہے اس کی مجھ پر نظر نہیں پڑی۔ سب سے پہلے میں نے سوچا کہ اسٹیو کے پاس چلی جاؤں لیکن پھر میں وہاں بھی نہ جاسکی۔ اکیلے گھر میں آنے کی بھی ہمّت نہیں پڑ رہی تھی۔۔۔ بالآخر میں یہیں سڑک کے دوسری طرف واقع سینما ہاؤس میں چلی گئی۔ گزشتہ دو گھنٹے سے میں وہیں تھی اور ہر دس منٹ بعد لابی میں آکر اس طرف دیکھ رہی تھی۔۔۔ اسی طرح میں نے تمھیں آتے دیکھا۔۔۔ میں نے ابھی تک اسٹیو کو فرینکی کی دھمکیوں اور اس کی آمد کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔"

"تاہم یہ تو اسے معلوم ہے ناکہ کبھی تمھاری اس سے شادی ہوئی تھی؟" جارج نے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ اس سلسلے میں تو سب کچھ اسے معلوم ہے۔" میڈلین نے جواب دیا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد جارج بولا "تم باضابطہ طور پر پولیس کے پاس جانے سے کیوں خوفزدہ تھیں؟"

"فرینکی نے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے کسی پولیس والے سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تو وہ اسٹیو کو قتل کر دے گا۔ اسٹیو کا ذکر وہ 'بندر' کہہ کر کر رہا تھا اور اسی طرح مجنونانہ انداز میں بار بار ہنس رہا تھا جس طرح میں نے اسے چھ سال قبل ہنستے دیکھا تھا جب اس نے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا۔ وہ بلاشبہ جنونی ہے۔ اس سے کچھ بعید نہیں۔" اس نے افسردہ سے لہجے میں بتایا۔

"چلو اوپر چلیں۔" جارج نے ملائمت سے کہا۔

اوپر پہنچ کر جارج نے میڈلین سے چابی لے کر خود فلیٹ کا قفل کھولا اور محتاط انداز میں اندر قدم رکھا۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ وہاں کوئی ان کے استقبال کے لیے موجود ہوتا۔ فلیٹ دو کمروں پر مشتمل تھا۔ دونوں کمرے صاف ستھرے اور سلیقے و قرینے سے آراستہ تھے۔ جارج نے پیشہ ورانہ انداز میں گہری نظروں سے ہر چیز کا جائزہ لیا۔ کمرۂ نشست میں دو کھڑکیاں تھیں۔ ان میں سے ایک کے پٹ بھی بند تھے اور بولٹ بھی چڑھا ہوا تھا جبکہ دوسری کا بولٹ چڑھا ہوا نہیں تھا۔

"کیا تم ہی یہ بولٹ کھلا چھوڑ گئی تھیں؟" جارج نے پوچھا۔

"مجھے.... مجھے صحیح طرح یاد نہیں۔" وہ الجھن زدہ لہجے میں بولی "آج میرا دماغ ٹھکانے نہیں تھا۔" وہ اب بھی تھکی تھکی اور وحشت زدہ نظر آرہی تھی "عین ممکن ہے میری عدم موجودگی میں اسٹیو آیا ہو اور اس نے تازہ ہوا کے لیے کھڑکی کھولی ہو۔ پھر یونہی چھوڑ گیا ہو۔۔۔ کبھی کبھی وہ میری عدم موجودگی میں گھر آجاتا ہے۔"

جارج نے ایک لمحے کچھ سوچا پھر فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ "میرا خیال ہے ہمیں اندازوں کے سہارے تاریکی میں سفر اب ترک کر دینا چاہیے اور کوئی ٹھوس عملی قدم اٹھانا چاہیے۔" یہ کہتے ہوئے وہ ٹیلی فون کے قریب جا بیٹھا۔

نمبر ملانے کے بعد وہ بولا "جونز سے بات کراؤ....!"

پھر چند لمحے کے توقف کے بعد بولا "جونز! ایک نوجوان ہے فرینکی کوہن۔۔۔ شکاگو کی کُک کاؤنٹی سے اس کا تعلق ہے۔ چھ سال پہلے قتل کے جرم میں جیل گیا تھا۔ منشیات استعمال کرنے کا بھی عادی ہے۔ ممکن ہے اس وقت پیرول پر ہو لیکن وہ اپنا علاقہ چھوڑ کر یہاں نیویارک پہنچ چکا ہے۔ ریکارڈ چیک کر کے مجھے بتاؤ کہ اس کے متعلق کوئی تازہ اطلاع ہے؟" پھر وہ میڈلین کا فون نمبر بتاتے ہوئے بولا "میں اس نمبر پر موجود ہوں۔"

ریسیور رکھ کر وہ مڑا تو اسے میڈلین کے تاثرات بدلے ہوئے نظر آئے۔ وہ یکدم ہی حد سے زیادہ پریشان اور متوحش نظر آنے لگی تھی۔

"کیا ہوا؟" جارج نے پوچھا۔

"ٹی وی پر اسٹیو کی ایک تصویر رکھی ہوئی تھی.... وہ غائب ہے۔ اس پر فوٹوگرافر نے اس گیس اسٹیشن کا نام و پتا بھی لکھا ہوا تھا جس کی تعمیر وغیرہ میں آج کل اسٹیو اور اس کے پارٹنرز مصروف ہیں۔ وہ تصویر اس گیس اسٹیشن پر ہی کھینچی گئی تھی۔۔۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آج صبح وہ تصویر ٹی وی پر ہی رکھی ہوئی تھی۔" میڈلین نے بتایا۔

"ممکن ہے اسٹیو ہی وہ تصویر لے گیا ہو۔" جارج نے خیال ظاہر کیا۔

"اسے کیا ضرورت ہو سکتی تھی۔" میڈلین بولی "گیس اسٹیشن پر تو وہ تصویر پہلے ہی موجود ہے۔ اور پھر آج تو گیس اسٹیشن پر اسٹیو ویسے بھی اکیلا ہی کام کر رہا ہے۔ اس لیے یہ بھی نہیں سوچا جا سکتا کہ وہ کسی کو دینے کے لیے وہ تصویر لے گیا ہوگا۔"

جارج ایک لمحے خاموش رہا پھر اٹھتے ہوئے بولا "ہمیں چلنا چاہیے۔"

اس سے پہلے کہ میڈلین کچھ پوچھتی، فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ریسیور جارج نے ہی اٹھایا۔ دوسری طرف اس کی توقع کے مطابق اس کے محکمے سے جونز بول رہا تھا۔ اس نے جارج کو بتایا کہ فرینکی کو پیرول کی حدود سے فرار ہوئے آج تیسرا دن تھا۔ شکاگو پولیس کو وہ اب بھی مطلوب تھا اور یہ کہ اس نے منشیات کا استعمال دوبارہ شروع کر دیا تھا۔

"ٹھیک ہے.... اس سلسلے میں ریڈیو کاروں کو خبردار کرنے کے لیے ایک عمومی پیغام نشر کروا دو۔" جارج نے ہدایت کی پھر وہ ریسیور رکھ کر میڈلین کی طرف مڑتے ہوئے بولا "میرے خیال میں تم میرے ساتھ گیس اسٹیشن نہ ہی جاؤ تو اچھا ہے۔"

لیکن میڈلین اس کے ساتھ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ اس سلسلے میں

جارج کی بات نہیں مانے گی۔

وہ گیس اسٹیشن پہنچے تو میڈلین اپنے شوہر کے سامنے غیر ضروری طور پر خوش و خرم نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بن بات ہنستے ہوئے اس نے اسٹیو سے جارج کا تعارف کرایا۔ "ان سے ملو اسٹیو! یہ سارجنٹ جارج ہیڈنگ ہیں۔ ان کی بیوی میری دوست ہیں۔ تمھیں تو معلوم ہوگا کہ پولیس والوں سے واقفیت رکھنا ہی اچھا ہے۔ کسی بھی وقت ان کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔"

"ہاں ــ اس میں تو کوئی شک نہیں۔" اسٹیو خوشدلی سے مسکرایا۔ "مجھے خوشی ہے کہ میری بیوی صرف حسین ہی نہیں، دور اندیش بھی ہے۔"

اسٹیو نے تینوں کے لیے کولڈ ڈرنک کے ڈبے کھولے اور وہ باہر کھلے آسمان تلے آکھڑے ہوئے۔ آسمان پر زرد چاند محوِ سفر تھا۔ اسٹیو اور میڈلین آپس میں باتیں کر رہے تھے، ہنس رہے تھے اور جارج اپنے آپ کو قدرے ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ ان کی جوڑی قابلِ رشک تھی اور ان کی مسرت قابلِ دید۔ اسٹیو کو بخیر و عافیت دیکھ کر شاید میڈلین بھی اپنے تفکرات بھول گئی تھی۔

کولڈ ڈرنک کا ڈبا خالی کرکے کوڑے دان میں پھینکتے ہوئے جارج بولا۔ "میں ہاتھ دھو کر آتا ہوں۔" وہ گیس اسٹیشن کے اس حصے کی طرف چل دیا جدھر باتھ روم بنے ہوئے تھے۔

مردانہ باتھ روم میں واش بیسن پر ہاتھ دھونے کے بعد اس نے وہیں رکھے ہوئے کاغذی نیپکن کے رول سے کچھ حصہ پھاڑا اور ہاتھ خشک کرنے لگا۔ اسی دوران اس کے عقب میں باتھ روم کے اس حصے کا اندرونی دروازہ بے آواز طریقے سے کھلا اور ایک ریوالور کی ٹھنڈی نال اس کی گردن سے آلگی۔

"تم پولیس والے ہو نا بزرگوار؟" ایک استہزائیہ سی سرگوشی ابھری اور جارج کا دل اچھل کر گویا حلق میں آن اٹکا۔ اس نے اپنے عقب میں موجود فرینکی کولن کو پہچان لیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں مجنونانہ چمک تھی۔

"اپنی جگہ سے حرکت نہ کرنا بزرگوار! کوئی چالاکی نہیں چلے گی۔" فرینکی گویا بڑی ترنگ میں بول رہا تھا۔ "وہ جو ہیرو کا بچہ باہر کھڑا ہے نا.... موت اس کا مقدر بن چکی ہے.... وہ اُلو کی پٹھی اس پیانو پر اب محبت کے مزید راگ نہیں الاپ سکے گی.... میں اسے ہمیشہ کے لیے خاموش کر دوں گا.... بس ذرا اسے میرے نشانے پر آجانے دو.... وہ دیکھو.... وہ بائیں طرف کو ہٹ رہا ہے.... لیکن تم اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا ورنہ اس سے پہلے میں تمھیں شوٹ کردوں گا۔"

کھڑکی کے راستے جارج بھی کن انکھیوں سے اسٹیو کو دیکھ رہا تھا جو لمحہ بہ لمحہ کھڑکی کی سیدھ میں آرہا تھا۔ فرینکی اس سے کچھ پیچھے ہٹ کر کھڑا ہوگیا تھا لیکن شاید اسے اندازہ نہیں تھا کہ جارج اب بھی آئینے میں اسے دیکھ رہا ہے۔

اس نے جیسے ہی اسٹیو کا نشانہ لیا، جارج پیپر نیپکن کا رول اٹھاتے ہوئے تیزی سے گھوما۔ گولی چلی لیکن رول، ریوالور سے ٹکرا چکا تھا اس لیے نشانہ خطا ہوگیا۔

فرینکی نے درندے کی طرح غراتے ہوئے ریوالور کا رُخ جارج کی طرف کیا لیکن اس وقت تک جارج اس کی کلائی پر ہاتھ ڈال چکا تھا۔ دونوں گتھم گتھا ہوکر باتھ روم کے فرش پر لڑھک گئے۔ ریوالور ایک بار پھر گرجا لیکن اس بار اس کا رخ مزید غلط ہو چکا تھا۔ نشانہ لینے والا خود نشانہ بن گیا تھا۔ جارج کی گرفت میں فرینکی کا جسم ڈھیلا پڑ گیا تھا۔

جارج اُٹھ کھڑا ہوا۔ فرینکی اس کے سامنے چت پڑا تھا۔ اس کی پسلیوں سے رستا ہوا خون اس کے کپڑے بھگونے لگا تھا۔

دروازہ کھلا اور اسٹیو گھبرائے ہوئے انداز میں اندر آنے لگا لیکن جارج بہ آوازِ بلند بولا۔ "باہر ہی رہو اسٹیو! اب اندر آنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ شخص مر چکا ہے۔"

وہ باہر آیا اور اسٹیو کا ہاتھ پکڑ کر اسے واپس میڈلین کے پاس لے گیا جو اپنی جگہ کھڑی ہوئے ہوئے کانپ رہی تھی۔

"وہ فرینکی تھا نا؟" اس نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"اور کون ہوسکتا تھا؟" جارج تھکے تھکے انداز میں مسکرایا۔ اسی لمحے ایک پولیس کار سائرن بجاتی آن پہنچی۔

جارج ایک بار پھر باتھ روم کی طرف جاتے ہوئے معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔ "میں ذرا ڈیوٹی پر آنے والے آفیسر کو اس واقعے کی رپورٹ دے دوں۔ اس کے بعد گھر جا کر مجھے اپنی بیوی کو بھی رپورٹ دینا ہوگی کہ اس نے جس مشن پر مجھے بھیجا تھا وہ بخیر و خوبی پورا ہوگیا۔"

وہ بہت تھک چکا تھا مگر بے حد خوش تھا کہ اس نے دو محبت کرنے والوں کو بربادی سے بچا لیا تھا۔

A KILLER AT HIS BACK
William Fay.

بازگشت

حاجی عدیل

آدمی کتنا ہی صُلح جو، امن پسند اور نیک طینت کیوں نہ ہو، اس کے لہو میں بھی گرمی تو آخر ہوتی ہے اور جب وہ کسی پر ظلم ہوتے دیکھتا ہے تو یہ حرارت بہت تیز ہوجاتی ہے اور وہ جذبات کے ہاتھوں مجبور و بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔

ایک مجاہد کا قصہ جسے اپنی ہزیمت کا احساس بہت شدید تھا

مکتی باہنی کے تربیت یافتہ گوریلوں کے مقابلے میں اس کی مختصر سی ٹولی نے بڑے یادگار کارنامے انجام دیے تھے۔ وہ نہ صرف مدافعتی جنگ کا ماہر تھا بلکہ اُسے حملہ کرنے کے بھی بڑے گُر آتے تھے۔ اس نے اپنے تئیں کئی معرکوں میں پاکستانی افواج کی مدد کی تھی اور اپنے طور پر بھی پاکستان دشمنوں کے چھکے چھڑا دیے تھے۔ ویسے نہ تو اس نے کہیں دُو بدو جنگ کی تربیت حاصل کی تھی اور نہ ہی کسی اجتماعی جنگ میں اُس نے حصہ لیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو پیدائشی "جنگ باز" کہہ کر سینہ تان لیا کرتا تھا۔ ایک طرح سے وہ کہتا صحیح تھا ورنہ کسی غیر تربیت یافتہ فرد کا "پیشہ ور گوریلوں" کے مقابل ڈٹ جانا اور اُن پر فتح پانا کیا معنی رکھتا ہے۔ یہ اس کی خداداد صلاحیت ہی کا نتیجہ تھا کہ مکتی باہنی کے گوریلوں کو جب یہ معلوم ہوتا کہ شیخ مجاہد فلاں بستی میں ہے تو وہ اس طرف کا رُخ ہی نہیں کرتے تھے۔

اس کی توقع اور جدّ و جہد کے باوجود جب مشرقی پاکستان، بنگلہ دیش بن گیا تو اس کے جذبۂ جہاد پر اوس گر گئی۔ اس کے جذبات و احساسات سرد ہوگئے اور پھر وہ وقت بھی آیا جب اس نے ایک زندہ لاش کی طرح بنگلہ دیش سے ہجرت کرکے کراچی کی سرزمین پر قدم رکھا۔

شیخ مجاہد سابق مشرقی پاکستان میں ریلوے کا ملازم تھا۔ یہاں بھی اُسے ریلوے میں ملازمت ملی اور ساتھ ہی اورنگی ٹاؤن میں ایک پلاٹ۔ اس کا خاندان مختصر سا تھا۔ ایک بیوی، ایک لڑکی اور ایک لڑکا۔ اس نے "پاکستان بچاؤ" سرگرمیوں کے لیے جو گروہ ترتیب دیا تھا، اس میں سے کچھ تو سابق مشرقی پاکستان ہی میں کام آگئے تھے اور جو بچ رہے تھے اُن سے بھی اس نے قطع تعلق کرلیا تھا۔ اسے اندر ہی اندر ایک احساسِ ہزیمت کھائے جاتا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں سے آنکھیں چار کرتے ہوئے گھبراتا تھا۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کا تصور ہی اس کی... زندہ دلی اور سرفروشانہ جذبات کے لیے پیغامِ اجل تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں سے کہا کرتا تھا۔ "فتح ہمیشہ حق کی ہوتی ہے۔ ہم حق پر ہیں پھر بھلا ہمیں

شکست کیسے ہوسکتی ہے۔ تم دیکھ لینا ایک دن ہم پاکستان دشمنوں کو عبرتناک شکست دیں گے۔"

تقریباً دو سال تک تو شیخ مجاہد اورنگی ٹاؤن میں بہاریوں کے ساتھ جیسے تیسے گزارا کرتا رہا، لیکن پھر اس نے اورنگی ٹاؤن کو چھوڑ دیا۔ کیوں کہ اس نے محسوس کرلیا تھا کہ وہ لُٹے پِٹے بہاریوں کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ انھیں دیکھ دیکھ کر اس کا احساسِ ہزیمت اُسے کچوکے لگاتا رہتا تھا اور وہ ٹوٹنے پھوٹنے لگتا تھا۔

جس بستی میں اس نے رہائش اختیار کی تھی، یہاں اسے جاننے والا کوئی نہیں تھا اور اس نے یہاں آنے کے بعد ہی سے اس بات کی کوشش کی تھی کہ اپنی ذات، شخصیت اور سابق مشرقی پاکستان سے تعلق کو پوشیدہ ہی رکھے۔ اس نے اپنی بیوی اور بچّوں کو سختی سے تاکید کردی تھی کہ وہ کسی مرحلے پر بھی سابق مشرقی پاکستان سے اپنے تعلق کو ظاہر نہ کریں، لیکن ان کی زبان، رہن سہن کا انداز اور کھانا پینا اس امر کی چغلی کھاتا رہتا تھا کہ وہ کہاں سے آئے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ پورے خاندان کی کوششوں کے باوجود چند دنوں ہی میں یہاں وہ سابق مشرقی پاکستانی یا بہاری مشہور ہوگئے۔ اس کے باوجود بھی شیخ مجاہد کو یہاں ایک طرح کا سکون سا تھا۔ اِس لیے کہ یہاں ایسا کوئی نہیں تھا جو اسے اس کے کارناموں کے حوالوں سے جانتا ہو یا یہ کہ اس کے بلند بانگ دعووں کے جھوٹے ہونے کا چشم دید گواہ ہو۔

یہ گزشتہ نومبر کی بات ہے جب لانڈھی ریلوے کراسنگ پر منی بسوں اور ٹرین کا ایک ہولناک حادثہ ہوا اور پھر کراچی کے مختلف علاقوں میں نسلی فسادات پھوٹ پڑے، قانون نافذ کرنے والے ادارے حرکت میں آگئے اور پھر تقریباً سارے شہر پر کرفیو کا تسلط قائم ہوگیا۔ ہر طرف خوف و ہراس اور دہشت و بربریت کے سائے منڈلانے لگے۔ شیخ مجاہد کھانا کھانے کے بعد اپنے بچّوں کے ساتھ بیٹھا موجودہ صورتِ حال پر افسوس کا اظہار کر رہا تھا کہ کسی نے دروازے پر آہستہ آہستہ دستک دی۔ "اس وقت کون ہوسکتا ہے؟" اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا اور پھر اپنے لڑکے سے بولا "دیکھو ندیم کون ہے؟"

ندیم نے دروازہ کھولا۔ سامنے کھڑے ہوئے چہرے اُسے شناسا سے لگے۔ "جی، فرمائیے!"

"تمھارے ابّو گھر پر ہیں؟" ان میں سے ایک نے پوچھا۔

"جی ہیں، ابھی بھیجتا ہوں۔"

"ارے آپ لوگ!" شیخ مجاہد نے دروازے ہی میں سے اُنھیں پہچان کر کہا۔ "نجمہ! پردہ کرلو۔ میرے چند دوست آئے ہیں۔ آؤ رشید، اندر آجاؤ۔" اس نے دروازے سے ایک طرف ہٹتے ہوئے کہا۔

"کیوں بھئی مجاہد، آخر ہم نے تمھیں ڈھونڈ ہی لیا نا۔" رشید نے اپنے دوسرے دو ساتھیوں کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "حالانکہ تم ہم لوگوں سے کہے بغیر ہی اورنگی سے غائب ہوگئے تھے۔"

"نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں، آپ لوگوں سے اس وقت ملاقات ہی نہیں ہوئی ورنہ میں کہہ کر ہی آتا۔ پھر یہاں آنے کے بعد اپنے دھندوں سے فرصت ہی نہیں ملی۔" اس نے اپنے شرمندگی کے احساس کو دبانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "اور سناؤ، یہ رات کے آٹھ بجے تم لوگ کیسے آگئے۔ اس علاقے میں تو کرفیو لگا ہوا ہے اور جہاں سے تم لوگ آئے ہو، وہ علاقہ بھی کرفیو زدہ ہی ہے۔"

"ہاں، کرفیو تو ہے ہی، لیکن کسی نہ کسی طرح تو تم سے ملاقات کرنا ہی تھی اور دیکھو، ہم آ ہی گئے۔" رشید نے شیخ مجاہد کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

رشید، شیخ مجاہد کا بچپن کا ساتھی ہی نہیں، اس کے گروہ کا سرگرم کارکن بھی تھا۔ اس نے بھی مکتی باہنی کے تربیت یافتہ گوریلوں کا مقابلہ مجاہد کے ساتھ قدم سے قدم ملا کے کیا تھا۔

"بھائی مجاہد! اورنگی کے حالات سے تو تم آگاہ ہی ہو۔ صورتِ حال انتہائی خراب ہے۔ اگر یہ سلسلہ اسی انداز میں چلتا رہا تو پھر......"

"تمھارا خیال غلط ہے رشید!" مجاہد نے رشید کا جملہ پورا ہونے سے قبل ہی کہا۔ "قانون نافذ کرنے والے اداروں نے خاصا کنٹرول کرلیا ہے۔ آج کرفیو کے وقفے کے وقت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ اب صورتِ حال معمول پر آجائے گی۔"

"میرا خیال تم سے مختلف ہے اور میرا ہی کیا، اورنگی کے رہنے والے بیشتر افراد کا یہی خیال ہے کہ یہ آگ دبے گی نہیں بلکہ وقفے وقفے سے بھڑکتی رہے گی۔ اگر ہم نے خود ہی اپنی حفاظت کے انتظامات نہ کیے تو پھر زندگی گزارنا مشکل ہوجائے گی۔"

"آپ لوگ اس طرح کیوں سوچتے ہیں۔ کیا یہاں لاقانونیت کا راج ہے؟ حکومت شرپسندوں سے ضرور نمٹ لے گی۔" مجاہد نے فرش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہم جس صورتِ حال سے گزر کر یہاں آئے ہیں، وہ بات کچھ اور تھی۔ وہ معاملہ بہت مختلف تھا۔ ویسے حالات خدا نہ کرے، یہاں پیدا ہوں۔"

"ہم لوگ یہ کب کہہ رہے ہیں بھئی۔" رشید نے اپنے دونوں نوجوان ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ خود کو اس قابل کرلیں کہ کل کلاں کو کوئی بُرا وقت پڑے تو ہم اپنے بچّوں کی بہتر طور پر حفاظت کرسکیں۔ تم بتاؤ، کیا ہمیں اپنی حفاظت کا بندوبست نہیں کرنا چاہیے؟"

"اپنی حفاظت کا بندوبست کرو۔ اِس سلسلے میں تمھیں کون روک سکتا ہے۔"

"اِسی سلسلے میں ہم لوگ تمھارے پاس آئے ہیں۔ یہ دونوں نوجوان اورنگی کے بہت سرگرم سماجی کارکن ہیں اور حالیہ فسادات میں انھوں نے خاصی گرم جوشی سے لوگوں کی حفاظت کی ہے۔" رشید نے اپنے ساتھیوں کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "ہم یہ چاہتے ہیں کہ اورنگی کے نوجوانوں کا ایک مضبوط گروہ بنائیں اور تم اس کی سربراہی کرو۔ اور گروہ میں شامل نوجوانوں کو حفاظت اور مدافعت کی تربیت دو اور ساتھ ہی ساتھ انھیں دھماکا خیز چیزیں بنانا بھی سکھاؤ۔ تاکہ بوقتِ ضرورت اس سے کلاشنکوف کا مقابلہ کیا جاسکے۔"

"رشید! تمھارا دماغ تو درست ہے یا نہیں۔ یہ کہاں کی باتیں لے بیٹھے ہو۔ بھیّا میرے یہاں پاکستان کی حفاظت کا مسئلہ درپیش نہیں۔ یہ نسلی فسادات کا ہوّا چند شرپسندوں نے کھڑا کیا ہے۔ یہ ہیروئن اور اسلحہ کی اسمگلنگ کرنے والے لوگ زیادہ دیر تک حکومت کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔"

"تم میری بات نہیں سمجھ رہے ہو میرے یار!" رشید نے تعجب سے مجاہد کی طرف دیکھا اور کہا۔ "اِن فسادات کو ہوا دینے کا کام کچھ اور لوگ بھی کررہے ہیں اور یقیناً ایسے لوگوں کی سرپرستی کوئی نہ کوئی بڑی طاقت کررہی ہے۔"

"میں کسی لمبی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔" مجاہد نے کسی قدر بیزاری سے کہا۔ "میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ جن حالات میں ہم نے وہاں ہتھیار اٹھائے تھے، یہاں ایسے حالات نہیں ہیں۔ وہ بات ہی دوسری تھی۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم خود حفاظتی اقدامات کرنے میں ہمارا ساتھ نہیں دوگے، کیوں؟"

"ساتھ دینے یا نہیں دینے کا مسئلہ نہیں، بہرحال ہمیں قانون کو ہاتھ میں نہیں لینا چاہیے۔ جہاں تک بڑے پیمانے پر ہونے والی شرپسندی کا تعلق ہے تو یہ زیادہ دن نہیں چلے گی۔"

"اچھا یار، ٹھیک ہے اب ہم چلتے ہیں۔" رشید نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"چلتے کہاں ہیں بھئی، چائے تو پیتے جاؤ، ویسے بھی اس وقت تم لوگوں کا اورنگی تک پہنچنا مشکل ہے، رات میرے ساتھ ہی گزارلو۔"

"چائے رہنے دو، پھر کبھی پی لیں گے۔ ہمیں یہیں قریب میں جانا ہے۔ اس وقت اورنگی کون جاسکتا ہے۔"

وہ رات بھر بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ رشید وغیرہ کو رخصت کرنے کے بعد مجاہد پر ایک بے چینی کا دورہ سا پڑا تھا۔ اور تمام رات اسی بے چینی کی نذر ہوگئی۔ اس کے ذہن کی اسکرین پر سابق مشرقی پاکستان میں رونما ہونے والے واقعات کے کئی سین ابھرتے اور مٹتے رہے۔ اس رات کے بعد وہ پھر اداس اداس سا رہنے لگا۔ یوں تو چند دن بعد کراچی کی صورتِ حال ٹھیک ہوگئی تھی۔ کرفیو اٹھا لیا گیا تھا۔ زندگی معمول کے مطابق رواں دواں ہوگئی تھی، لیکن اس کے دل و دماغ میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ ایک لاوا سا پک رہا تھا۔ اس نے بہت سوچ بچار کے بعد ایک فیصلہ کیا۔

اس فیصلے کے بعد ہی اپنی پس انداز کی ہوئی رقم سے اس نے دھماکا خیز مواد خریدنا شروع کیا۔ جب حسبِ ضرورت چیزیں خرید چکا تو پھر اس کے دستِ ہنر نے اپنے جوہر دکھانے شروع کیے... دستی بم، پٹرول بم وغیرہ بنالینا اس کے لیے مشکل نہیں تھا۔ ڈیوٹی سے آنے کے بعد وہ اپنے کام میں مشغول ہوجاتا۔ یہ تباہ کن اشیاء بناتے بناتے بھی اکثر اس کی ذہنی رَو بہک جاتی اور وہ گھنٹوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بے کار بیٹھا رہتا۔ پھر ایک دن اس نے یہ سارا سامان اٹھا کر چھپا دیا۔ نہ جانے کیوں اُسے ان چیزوں سے نفرت سی ہونے لگی تھی۔ اسے اکثر ایسا لگتا جیسے اس کا ضمیر ملامت کررہا ہو۔ ضمیر کے خلاف کوئی کام کرنا بہرحال اسے گوارا نہیں تھا۔

ڈیوٹی پر جانے سے قبل محلّے کے ہوٹل میں ایک چائے پینا اور اخبار دیکھنا جیسے اس کی عادت تھی۔ آج بھی وہ اپنی عادت کے مطابق اخبار دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نے اس کے چہرے پر مسرّت کی لہر دوڑا دی۔ "آپریشن کلین اپ"۔

ہیروئن کی تجارت اور اسلحہ کی اسمگلنگ ہی تو شرپسندوں کی زندگی ہے۔ اگر اس پر خاطر خواہ وار کیا جائے گا تو یہ مٹھی بھر شرپسند اپنی موت آپ ہی مرجائیں گے۔ پوری خبر پڑھنے کے بعد اس نے سوچا۔

آپریشن کلین اپ کے سبب حاصل ہونے والی مسرّت اسے زیادہ دنوں تک حاصل نہیں رہی۔ اس اندوہ ناک خبر نے کہ علی گڑھ کالونی پر مسلح افراد نے حملہ کردیا، کلاشنکوف کا آزادانہ استعمال ہوا، عمارتوں کو آگ لگادی گئی، جلتی عمارتوں سے جان بچا کر بھاگ نکلنے والے بچّوں اور بوڑھوں کو پکڑ پکڑ کر آگ میں پھینک دیا گیا۔

پھر یہ فسادات جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئے۔ جوابی کارروائیاں بھی شروع ہوگئیں۔ اسپتال لاشوں اور زخمیوں سے بھرنے لگے۔ کرفیو مسلّط ہوگیا، سڑکوں پر فوجی گشت کرنے لگے اور شیخ مجاہد کا جذبۂ انسانیت بھی میٹھی نیند سو گیا۔ انتقام کی آگ میں اس کے دل و دماغ جلنے لگے۔ "مجھے اپنے بھائیوں کی مدد کرنا چاہیے۔ خالی ہاتھوں سے کلاشنکوفوں کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔"

چھپا کے رکھا ہوا آتش گیر مادہ اس کے آگے تھا اور وہ بڑے انہماک سے مختلف شکلوں میں اُسے ڈھال رہا تھا۔ جب اس نے خاصی

مقدار میں چھوٹے چھوٹے دستی بم وغیرہ بنالیے تو پھر انھیں نہتّے ہاتھوں تک پہنچانے کا مرحلہ تھا۔ بہُت غور کرنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ خود ہی لے جانا زیادہ مناسب ہے۔

جب وہ گھر سے نکلا تو اس کے جسم کے مختلف حصّوں پر دستی بم بڑے سلیقے سے بندھے ہوئے تھے۔ سردی چونکہ حد سے زیادہ ہی تھی اس لیے ہلکا کمبل اوڑھ کر چلنا اچنبھے کی بات بھی نہیں تھی۔ وہ مختلف گلیوں سے گزر رہا تھا گو منزل ابھی بہُت دور تھی لیکن ہر اٹھنے والا قدم اسے منزل کے قریب ہی کر رہا تھا۔ ویسے تو شہر بھر میں کرفیو لگا ہوا تھا لیکن گلی کوچوں میں چہل پہل تھی۔ شام ڈھلنے لگی تھی، اندھیرا پھیلنے کے بعد ہی وہ اس علاقے میں پہنچنا چاہتا تھا جہاں رشید رہتا تھا۔ اسی کے توسّط سے یہ دستی بم اور دیگر دھماکا خیز اشیا، وہ لوگوں تک پہنچانا چاہتا تھا۔

مختلف گلیوں سے گزرتے ہوئے شیخ مجاہد کو ایک گھنٹے سے زیادہ ہوگیا تھا۔ اندھیرا گہرا ہوگیا تھا، لیکن جگہ جگہ روشن اسٹریٹ لائٹس اسے الجھن میں ڈال رہی تھیں۔ وہ تاریک گلیوں کا انتخاب کرتے ہوئے منزل کے قریب ہو رہا تھا۔ اس سفر میں کئی مرحلے ایسے بھی آئے جب اسے مین روڈ کو کراس کرنا پڑا۔ ان مرحلوں سے بھی وہ گزر ہی آیا تھا۔ اب تک اسے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

جیسے جیسے وہ اورنگی کے قریب ہو رہا تھا، اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ وہ اندر ہی اندر ایک عجیب سی مسرّت محسوس کر رہا تھا۔ رشید مجھے دیکھ کر کتنا خوش ہو گا۔ اس نے سوچا۔ اللّٰہ نہ کرے کہیں اس کا گھر نہ جلا ہو، کہیں اسے گولی نہ لگی ہو۔ مرنے والوں کے نام تو شاید اخبار میں بھی نہیں تھے۔ خیر دیکھا جائے گا، رشید نہ سہی کوئی اور سہی۔

جس گلی سے وہ گزر رہا تھا، اس کے اختتام پر اسے آگ جلتی نظر آئی۔ لوگوں کا ہجوم بھی تھا۔ جو اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے۔ مجاہد ایک اور پتلی سی گلی میں مڑ گیا۔ جانے کیوں وہ ان لوگوں کے قریب سے گزرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے اپنی سمت کا علم تھا اور وہ مختلف گلیوں سے ہوتا ہوا آخر صحیح سمت پر آگیا۔ اب شاید دو یا تین گلیاں پار کرنے کے بعد مین روڈ تھا اور اس کے بعد اورنگی کا علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ اس مین روڈ کو کراس کرنا بھی ایک اہم اور پُرخطر مرحلہ تھا۔

آخری گلی کے نکڑ پر کھڑے ہو کر اس نے مین روڈ کا جائزہ لیا۔ روڈ دُور دُور تک صاف تھا۔ کہیں کوئی فوجی جیپ یا گاڑی کھڑی ہوئی نہیں تھی۔ نہ ہی کوئی گشت کرتا سپاہی نظر آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر یہاں کھڑے ہو کر جائزہ لینا چاہیے؛ اس نے سوچا۔ مگر کھڑے رہنا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا، گلی سنسان تھی کسی وقت بھی کوئی دروازے سے سر نکال کر سوال کر سکتا تھا یا پھر دشمن سمجھ کر کوئی جان لیوا حرکت!

مجاہد نے گلی سے باہر قدم رکھا اور پھر بڑے چوکنّا انداز میں اِدھر اُدھر کا جائزہ لیتے ہوئے روڈ کراس کرنے لگا۔ حالانکہ وہ تیز تیز چل رہا تھا لیکن اسے اپنا ایک ایک قدم منوں وزنی لگ رہا تھا۔ آدھا روڈ کراس کرنے کے بعد اس نے ترچھی نظروں سے بائیں جانب دیکھا اور اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ جس گلی سے وہ نکلا تھا اُس سے تیسری گلی میں اسے جیپ کھڑی ہوئی نظر آئی۔ اللّٰہ خیر کرے۔ واپس ہونے میں چونکہ زیادہ خطرہ تھا، اس لیے وہ آگے ہی بڑھنے لگا۔

آگے، اور آگے، اور آگے اور پھر اس نے روڈ کراس کر ہی لیا۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا، میں تو بلا وجہ ڈر رہا تھا۔ اس نے ایک گلی میں داخل ہوتے ہوئے سوچا۔ شاید کسی شہری کی جیپ ہو۔ پوری گلی ویران تھی۔ اس میں جیسے جیسے وہ آگے بڑھ رہا تھا ویسے ویسے اسے تنہائی کا احساس ہو رہا تھا۔ کیا یہاں کے سارے مکین چلے گئے۔ کہاں چلے گئے؟ ایسا نہ ہو کہ کسی خالی گھر سے موت سنسناتی ہوئی اس کی طرف چلی آئے۔ اس احساس کے ساتھ ہی وہ کانپ سا گیا۔

اس سنسان گلی میں چلتے چلتے اس نے ایک بغلی گلی کا انتخاب کیا اور اس میں گھُستا چلا گیا۔ اس بغلی گلی کے اختتام پر پھر ایک کشادہ گلی میں داخل ہوا۔ یہاں چند لمحے رُک کر اس نے اپنی منزل کا تعیّن کیا اور تیزی سے اس سمت چل پڑا۔ اس کے حساب سے وہ اپنی منزل کے بہُت قریب تھا۔ زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ کی مسافت پر اس کی منزل تھی۔ اس نے ایک سی رفتار سے کئی گلیاں پار کیں۔ اب شاید اُسے تین یا چار گلیاں اور پار کرنا تھیں، پھر وہ رشید کے مکان پر دستک دینے کے قابل ہوتا۔ یہی سوچتا ہوا وہ ایک قدرے کشادہ گلی میں داخل ہوا ہی تھا کہ اس کی سماعت سے ایک کرخت آواز ٹکرائی ”ہالٹ...!“

وہ ایک لمحے کے لیے جھجکا اور پھر یک لخت پلٹ کر اسی گلی میں داخل ہونے کی کوشش کی جس سے نکلا تھا، لیکن وہ گولی سے زیادہ تیز رفتار نہیں تھا۔ رائفل چلنے کی آواز کے ساتھ ہی ایک زوردار دھماکے نے بھی فضا کا سینہ پھاڑ دیا۔ شاید کئی دستی بم ایک ساتھ پھٹ گئے تھے۔ اس دھماکے کے ساتھ ہی مجاہد کا بدن ان گنت حصّوں میں تقسیم ہو گیا اور اس کا احساسِ ہزیمت بھی اس کے ساتھ ہی فنا ہو گیا۔

خود غرضوں اور مفاد پرستوں کی اس دُنیا میں خلوص کی قدر کرنے والے بھی بس خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ جتنی کمی پُرخلوص انسانوں کی ہے، اُسی قدر خلوص کے قدر دانوں کی کمی ہے۔ ایک اخلاص کی ماری دوشیزہ کا فسانہ جو مفاد پرستوں میں گھری ہوئی تھی۔

سچّی کہانیوں کے سلسلے کی ایک کہانی مرزا امجد بیگ کی ڈائری کے چند اوراق

پشیمان

راوی: مرزا امجد بیگ (ایڈووکیٹ)

تحریر: عبدالقیوم شاد

میرا خیال ہے کہ لوگ مجھے وکیل کی حیثیت سے کم اور قلمکار کی حیثیت سے زیادہ جاننے لگے ہیں۔ حالانکہ میری سرگرمیاں زیادہ تر وکالت تک محدود ہیں۔ بہرحال گاہے بہ گاہے کوئی اجنبی مدّاح مل ہی جاتا ہے اور جب وہ میری وکالت کے بجائے ان صفحات میں شائع ہونے والی کہانیوں کی تعریف کرنے لگتا ہے تو میں عموماً الجھن کا شکار ہو جاتا ہوں اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے اس تعریف پر خوش ہونا چاہیے یا احتجاج کرنا چاہیے۔ کیونکہ آپ بخوبی جانتے ہیں کہ ان صفحات

میں میں صرف راوی کی حیثیت سے جلوہ گر ہوتا ہوں۔ قلم کی موشگافیاں سردست میرے بس کی بات نہیں۔

ایک روز مجھے معلوم ہوا کہ پولیس میں بھی میرے مدّاح موجود ہیں۔ اس وقت رات کے دس سوا دس بجے تھے اور میں کھانے سے فارغ ہو کر اپنی خواب گاہ میں ایک کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا کہ اچانک باہر سے ایک عجیب سی آواز آئی۔ میں نے سوچا کہ کوئی بلّی وغیرہ کُودی ہوگی، اس لیے اپنا مطالعہ جاری رکھا۔ لمحے بھر کے بعد دروازے پر دستک سنائی دی، پھر اطلاعی گھنٹی کی آواز سماعت سے ٹکرائی۔ میں سمجھ گیا کہ باہر جو کوئی بھی ہے وہ یا تو عجلت میں ہے یا پہلی دفعہ ہمارے دروازے پر آیا ہے۔ میں نے کتاب الٹی کر کے رکھ دی اور چپّل پہن کر دروازے کی طرف بڑھا۔ گھنٹی کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ گویا میرا ملاقاتی واقعی عجلت میں تھا۔ تاہم میں نے اسے تیسری گھنٹی بجانے کا موقع نہیں دیا اور دروازہ کھول کر اس کے سامنے جا موجود ہوا۔

وہ ایک نہیں تین تھے اور تینوں پولیس کی وردی میں تھے۔ اُن میں سے ایک دیوار کے اوپر سے اندر کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہا تھا۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہاں کیا ہو رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

جو شخص دروازے کے سامنے کھڑا تھا، وہ اے ایس آئی تھا۔ اس کی وردی اتنی اچھی نہیں تھی جتنی ہونا چاہیے تھی۔ وہ چالیس بیالیس سال کا قدرے ڈھیلا اور بے پروا شخص نظر آتا تھا۔ اس کے ساتھی فِٹ کانسٹیبل تھے اور ابھی نوجوان تھے۔ ان کے کندھوں پر دوسری جنگِ عظیم کی یادگار ڈنڈا مارکہ رائفلیں نظر آ رہی تھیں۔

"معافی چاہتا ہوں جناب! ایک بدمعاش آپ کے بنگلے میں گھس گیا ہے۔" اے ایس آئی نے کہا۔ "اگر آپ اجازت دیں تو ہم اُسے اندر جا کر گرفتار کر لیں۔"

"مجھے تو کوئی بدمعاش نظر نہیں آیا۔" میں نے کہا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ میں نے تھوڑی دیر قبل عجیب سی آواز سنی تھی۔ "ویسے آپ دیکھ لیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اِدھر اُدھر کہیں چھپا ہوا ہو۔"

اے ایس آئی سپاہیوں سمیت اندر آ گیا۔ انھوں نے چند منٹوں کے اندر صحن، برآمدہ اور لان دیکھ ڈالا۔

ایک سپاہی درمیانی دیوار کے اوپر سے ساتھ والے بنگلے میں دیکھتے ہوئے بولا۔ "شاہ جی! میرا خیال ہے کہ وہ یہاں سے ساتھ والے بنگلے میں کُود گیا ہے۔"

شاہ جی نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "ہم کمروں کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔"

اس کے لہجے میں تحکّم پایا جاتا تھا جو میری سماعت پر گراں گزرا۔ میں نے کہا۔ "اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے کسی کو اندر جاتے نہیں دیکھا۔ آپ جا سکتے ہیں۔"

"تلاشی تو آپ کو دینا پڑے گی۔ کیا نام ہے آپ کا؟"

"تلاشی تو آپ ہرگز نہیں لے سکتے۔" میں نے کہا۔ "میرا نام مرزا امجد بیگ ہے اور میں ایڈوکیٹ ہوں۔"

اس نے غور سے میرے چہرے کی طرف دیکھا اور سوچنے والے انداز میں بولا۔ "مرزا... امجد... بیگ... ایڈوکیٹ۔ نام تو کچھ جانا پہچانا لگتا ہے۔" لمحے بھر کے بعد وہ چونکا۔ "اچھا اچھا... تو آپ ہیں مرزا امجد بیگ ایڈوکیٹ۔ یوں کہیں کہ آپ رائٹر ہیں۔ میں آپ کی کئی کہانیاں پڑھ چکا ہوں۔" اس نے گرم جوشی سے میرے ساتھ ہاتھ ملایا۔ "بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ بہت خوب لکھتے ہیں آپ۔ میرا نام اے ایس آئی حسین شاہ ہے۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ضرور بتائیں۔"

میں نے مزاح کے رنگ میں کہا۔ "خدا نہ کرے کبھی آپ کی ضرورت پڑے۔ مجھے دو جگہوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ ایک اسپتال اور ایک تھانہ۔"

اس نے قہقہہ لگایا، بولا۔ "وکیل صاحب! سب سے خطرناک جگہ تو آپ کا اڈّا ہے یعنی کچہری۔ وہاں سے آدمی یا تو جیل جاتا ہے اور یا پھانسی کے پھندے پر۔"

"اور باعزت بَری ہو کر گھر بھی آ جاتا ہے۔" میں نے اُسے عدالت کی تیسری خصوصیت بتائی، پھر پوچھا۔ "یہ بدمعاش کون ہے، جس کے پیچھے آپ لگے ہوئے ہیں؟"

"اس کا نام جبّار خان ہے۔ ایک بیوہ عورت کی بیٹی کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ وہ اسکول جانے کے لیے گھر سے نکلتی ہے تو یہ اس کے پیچھے لگ جاتا ہے۔ دونوں ماں بیٹی اس کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔"

"یہ تو واقعی بہت بڑا مسئلہ ہے۔" میں نے کہا۔ "ایسے اوباش نوجوانوں کا کوئی مستقل علاج ہونا چاہیے۔"

"وکیل صاحب! ان کا علاج ڈنڈے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔"

"یہی سب سے بڑی خرابی ہے۔ پولیس والے ہر مسئلے کو ڈنڈے سے حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"آپ کی اور ہماری کبھی نہیں بن سکتی۔" حسین شاہ نے کہا اور اپنے ساتھیوں سمیت رخصت ہو گیا۔

ان کے جانے کے بعد میں نے گیٹ بند کر دیا اور برآمدے سے ہوتا دروازے کی طرف بڑھا۔ تب ہی ایک نوجوان مجھے کمرے سے نکلتا دکھائی دیا۔ اس کی وضع قطع شریفوں جیسی نہیں تھی۔ اس نے بڑے بڑے بال رکھے ہوئے تھے اور چُست پتلون قمیص پہن رکھی تھی۔ گلے میں سونے کی زنجیر نظر آ رہی تھی۔ وہ کسی آسودہ حال خاندان کا فرد معلوم ہوتا تھا۔

میں رُک گیا اور تحکّمانہ لہجے میں پوچھا۔ "کون ہو تم؟ اندر کیوں گھُسے تھے؟"

"نام جبّار خان ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "میں نے آپ کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا، پولیس کے ڈر سے اندر گھس گیا تھا۔ معافی چاہتا ہوں۔ میں آپ ہی سے ملنے آ رہا تھا۔"

"لیکن تم کمرے میں کیسے گھس گئے؟"

اس نے دانت نکالے، بولا۔ "میں برآمدے میں چھپا کھڑا تھا۔ آپ گھنٹی کی آواز سن کر باہر نکلے تو میں اندر گھس گیا۔"

اس روز گھر میں میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ دیگر افرادِ خانہ کسی شادی میں گئے ہوئے تھے۔

"آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا۔" میں نے اُسے تنبیہ کی۔ "اے ایس آئی نے مجھے بتایا ہے کہ تم محلّے کی لڑکیوں کو پریشان کرتے ہو۔ ایک عورت نے تمھارے خلاف رپورٹ بھی درج کرائی ہے۔"

"میں اسی سلسلے میں آپ سے ملنا چاہتا تھا۔ پولیس والے مجھے کئی روز سے پریشان کر رہے ہیں۔ ہر دفعہ پچّیس تیس روپے لے جاتے ہیں۔ کبھی کوئی آ جاتا ہے، کبھی کوئی آ جاتا ہے۔"

"معاملہ کیا ہے؟ پولیس تمھیں کیوں پریشان کر رہی ہے؟"

"ادھر ایک عورت رہتی ہے، شمشاد بیگم اس کا نام ہے۔ اس نے میرے خلاف جھوٹی رپورٹ لکھوائی ہے۔ کہتی ہے کہ میں اس کی بیٹی صبا کو پریشان کرتا ہوں۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"کیا وہ عورت بیوہ ہے؟" میں نے پوچھا اور اثبات میں جواب پا کر کہا۔ "تم اس عورت کے بارے میں اتنی باتیں کیسے جانتے ہو؟ تمھیں اس کا اور اس کی بیٹی کا نام بھی معلوم ہے۔"

"میں بھی اسی محلّے میں رہتا ہوں۔ نام تو معلوم ہو ہی جاتا ہے۔"

"مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟"

وہ قدرے تامّل کرتے ہوئے بولا۔ "میں اس بیوہ پر ایک کیس کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کی فیس کتنی ہوگی؟"

"فیس کا تعیّن کیس کی نوعیت جاننے کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے۔ کیس کی تفصیل کیا ہے؟"

"دراصل بات یہ ہے کہ شمشاد بیگم نے مجھے بہت پریشان کیا ہے۔ خواہ مخواہ پولیس کو میرے پیچھے لگا دیا۔ ہزاروں روپے خرچ ہو گئے۔ میں اس کو تھوڑا سبق سکھانا چاہتا ہوں۔ ایک صاحب نے مشورہ دیا ہے کہ ان کے اوپر رقم کی وصولی کا مقدمہ دائر کر دو۔ دوسرے صاحب کا کہنا ہے کہ ان پر فحاشی کا الزام عائد کر کے ایک درخواست آئی جی کو بھجوا دو۔ کئی لوگ اس عورت کے خلاف بیان دینے پر تیار ہیں۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"میرا مطلب ہے کہ اس قسم کا کوئی بھی سلسلہ بنایا جا سکتا ہے۔ مثلاً آج کل ایک نیم حکیم قسم کے ڈاکٹر کا شمشاد بیگم کے گھر بہت آنا جانا ہے۔ اس شخص کو بھی کسی چکّر میں ملوّث کیا جا سکتا ہے۔ آپ میرا مقصد تو سمجھ ہی گئے ہوں گے اور فیس کی آپ بالکل پروا نہ کریں۔"

میں نے دل میں کہا۔ مقصد تو میں تمھارا خوب سمجھ گیا ہوں۔ تم واقعی بدطینت انسان ہو۔ پھر بلند آواز سے کہا۔ "فیس تو خیر مل ہی جائے گی لیکن یہ بتاؤ کہ اصل بات کیا ہے؟"

وہ قدرے تذبذب کے بعد بولا۔ "بات کچھ ذاتی قسم کی ہے۔ میں اس عورت کو جھکانا چاہتا ہوں۔"

"ذرا کھل کر بات کرو۔" میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ "وکیل سے کوئی بات نہیں چھپانا چاہیے۔"

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور دھیمی آواز میں بولا۔ "شمشاد بیگم کی بیٹی کے بارے میں میری اپنے دوستوں سے شرط لگ گئی تھی۔ ایک دوست نے کہا کہ ثروت صبا بڑی مغرور لڑکی ہے، کسی کو لفٹ نہیں دیتی۔ میں نے کہا۔ اس یتیم لڑکی نے کیا غرور کرنا ہے۔ میں اسے ایک دن میں رام کر لوں گا۔ اس پر میری اپنے دوستوں کے ساتھ ایک ہزار روپے کی شرط لگ گئی۔ اگلے روز میں نے اپنا حلیہ سیٹ کیا، بہترین کپڑے پہنے اور اپنی موٹر سائیکل پر ثروت صبا کا تعاقب شروع کر دیا۔ تین روز تک میں دور دور سے اس کا جائزہ لیتا رہا۔ مجھے پتا چلا کہ صبا میٹرک میں پڑھتی ہے اور زیادہ ذہین نہیں ہے۔ اس کا اسکول آٹھ بجے لگتا ہے اور ساڑھے بارہ بجے چھٹی ہو جاتی ہے۔ یہ صبح ساڑھے سات بجے گھر سے نکلتی ہے اور بس پر اسکول جاتی ہے۔ چوتھے روز میں نے اپنی موٹر سائیکل اس کی بس کے پیچھے لگا دی۔ جب وہ بس سے اُتر کر اسکول کی طرف بڑھی تو میں نے اس کے قریب پہنچ کر موٹر سائیکل روکی اور نہایت ادب سے کہا۔ "سنیے، آپ میٹرک میں پڑھتی ہیں؟"

اس نے تیوری چڑھا کر میری طرف دیکھا، بولی۔ "آپ کو اس سے مطلب؟"

میں نے پہلے سے تیار شدہ ایک کتاب اس کی طرف بڑھائی اور کہا۔ "کل میں یہاں سے گزر رہا تھا تو یہ کتاب مجھے یہاں پڑی ہوئی ملی تھی۔ یہ میٹرک کی کسی طالبہ کی کتاب ہے۔

اندر نام بھی لکھا ہوا ہے۔ آپ یہ کتاب رکھ لیں اور جس لڑکی کی ہو، اُسے پہنچا دیں۔ ثواب کا کام ہے۔"

اس نے جھجکتے ہوئے کتاب میرے ہاتھ سے لے لی۔ پھر قبل اس کے کہ وہ کتاب کھول کر اندر دیکھتی، میں نے موٹر سائیکل آگے بڑھا دی۔ دراصل وہ انگریزی کی کتاب تھی جو میں نے ایک روز پہلے خریدی تھی۔ کتاب کے اندرونی صفحے پر میں نے اسی کا نام لکھ دیا تھا اور اندر ایک لفافہ بھی رکھ دیا تھا جس میں سو روپے کا ایک نوٹ اور ایک مختصر سا رقعہ تھا۔ رقعے میں صرف اتنا لکھا تھا کہ میں بارہ بجے بس اسٹاپ پر اس کا انتظار کروں گا۔ ایک یتیم لڑکی کے لیے سو روپے اچھی خاصی رقم تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ کسی بہانے آدھ گھنٹا پہلے چھٹی کر کے ضرور مجھ سے ملنے آئے گی۔ لہٰذا میں بارہ بجے سے چند منٹ پہلے ہی بس اسٹاپ پر پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واقعی بس اسٹاپ کی طرف آتی دکھائی دی۔ اس وقت بس اسٹاپ پر گنتی کے چند افراد کھڑے تھے۔ دو تین عورتیں بھی تھیں۔ جب صبا قریب پہنچی تو میں نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کرتے ہوئے اُسے پیچھے بیٹھنے کے لیے کہا۔

اس نے اپنے بیگ سے میری دی ہوئی انگریزی کی کتاب نکالی اور اسے گھما کر میری کنپٹی پر دے مارا، بولی "ذلیل کمینے! یہ کتاب اور پیسے اپنی اماں کو دے دینا"

میں نے انجان بننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "ارے تو اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔ یہ کتاب کسی اور کی ہوگی۔ لاؤ، ذرا دکھاؤ اور پیسوں کی فکر نہیں کرو۔"

اس نے ایک تھپڑ میرے منہ پر مارا اور بہت غصے میں مجھے برا بھلا کہنے لگی۔ آس پاس کھڑے ہوئے لوگ فوراً ہمارے اردگرد جمع ہو گئے۔ صورتِ حال خراب ہو گئی تھی اور وہاں ٹھہرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں نے کتاب اٹھائی، موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور فوراً وہاں سے نکل گیا۔

اس کے بعد میں نے دو تین بار اور صبا سے راستے میں بات کرنے کی کوشش کی، مگر اس نے بالکل لفٹ نہیں دی۔ چند روز کے بعد میں نے صبا کو ایک کار میں اسکول جاتے دیکھا۔ واپسی میں بھی وہی کار اُسے لینے آئی تھی۔

ڈرائیور چالیس بیالیس سال کا ایک سخت مزاج شخص معلوم ہوتا تھا۔ اس کا رنگ سانولا اور جسم بھاری تھا۔ میں نے اس کے بارے میں پتا کیا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک رجسٹرڈ میڈیکل پریکٹشنر ہے۔ اس کا نام ڈاکٹر علی اختر ہے۔ ایم بی بی ایس ڈاکٹر نہیں ہے۔ ایک پسماندہ علاقے میں دواخانہ چلاتا ہے اور غالباً صبا کے باپ کے جاننے والوں میں سے ہے۔ کچھ روز سے اس نے زیادہ ہی ادھر آنا جانا شروع کر دیا ہے۔ شاید شمشاد بیگم میں دلچسپی لے رہا ہے۔ میرے خلاف پولیس میں شکایت بھی اسی نے کی ہے۔ ایک روز اس نے مجھے کار سے ٹکر مارنے کی کوشش بھی کی تھی۔ میں نے احتجاج کیا تو اس نے پستول نکال لیا۔ کہنے لگا کہ اگر اس نے مجھے آئندہ صبا کا پیچھا کرتے دیکھا تو وہ مجھے شوٹ کر دے گا۔" اس لفنگے کی یہ باتیں سن کر مجھے بہت غصّہ آیا۔

"لہٰذا پیشتر اس کے کہ اُسے دوبارہ دھمکی دینے کی ضرورت پیش آئے، تمھیں اس لڑکی کا پیچھا چھوڑ دینا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "اسی میں تمھاری بہتری ہے۔"

اس نے حیرانی سے میری طرف دیکھا، بولا "وکیل تو مؤکل کو اللہ کی رحمت سمجھتے ہیں اور آپ مجھے پورے معاملے ہی سے دستبردار ہونے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ میں اس معاملے میں بہت ذلیل ہو چکا ہوں۔ اب پیچھے ہٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ اصلاحِ معاشرہ کی باتیں چھوڑیں، کیس تیار کر کے اپنی فیس کھری کریں۔ کیس ایسا بنائیں کہ اس میں ڈاکٹر علی اختر بھی پھنس جائے۔ اگر آپ حکم کریں تو میں اپنے ساتھیوں کی مدد سے کچھ بلوے شلوے کا سین بھی بنا سکتا ہوں۔"

"بات سنو میاں! میں مجرموں کی نہیں، بے گناہوں کی وکالت کرتا ہوں۔"

"کمال ہے... آپ عجیب وکیل ہیں۔ میں نے آپ کو بتایا تو ہے کہ ڈاکٹر علی اختر نے مجھے قتل کی دھمکی دی ہے۔"

"میں سن چکا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اس نے تمھیں معقول جواز کے تحت دھمکی دی ہے۔ تم اس کے دوست کی یتیم بیٹی کو تنگ کرو گے تو وہ ایسی ہی دھمکی دے گا۔ تمھیں گھر میں بلا کر دعوت تو نہیں کھلائے گا۔ یہ بات صحیح ہے کہ بہت سے وکیل فیس کی خاطر ہر قسم کے کیس لے لیتے ہیں لیکن میں ان وکیلوں میں سے نہیں ہوں۔"

"ہونہہ... مجھے آپ کی باتیں سن کر بہت مایوسی ہوئی ہے۔"

"آج کل یہی ہو رہا ہے۔ اچھی باتیں لوگوں کو پسند نہیں آتیں۔"

وہ فضول سی آوازیں نکالتا گیٹ کی طرف بڑھا۔ میں نے کہا "جاتے جاتے ایک بڑی بات بھی سن لو۔ میں شمشاد بیگم اور اس کی بیٹی کو نہیں جانتا لیکن اگر تم ان عورتوں کو تنگ کرنے سے باز نہ آئے تو میری گواہی بھی تمھارے خلاف ہوگی۔"

اگلے روز مجھے خیال آیا کہ شمشاد بیگم کو جبّار خان کے ارادے سے آگاہ کر دینا چاہیے۔ دفتر سے واپسی پر میں پتا پوچھتا ہوا اس کے گھر پہنچ گیا۔ وہ خاصے خوبصورت بنگلے میں رہتی تھی۔ باہر ایک پرانے ماڈل کی کار کھڑی تھی۔ اطلاعی گھنٹی کی آواز پر دو افراد دروازے پر آئے۔ آگے ایک سانولے رنگ کا قوی الجثّہ مرد تھا۔ اس نے نیلے رنگ کا سفاری سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے پیچھے شلوار قمیص میں ملبوس ایک بھاری جسم کی عورت تھی۔ اس نے خوب میک اپ کر رکھا تھا اور کہیں جانے کے لیے تیار معلوم ہوتی تھی۔

میں نے اپنا تعارف کرایا اور کہا کہ میں شمشاد بیگم سے ملنا چاہتا ہوں۔

عورت، مرد کو ایک طرف کر کے سامنے آگئی، بولی "آپ مجھ سے کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں؟"

"کل جبّار خان نامی ایک نوجوان میرے پاس آیا تھا۔" میں نے کہا۔ "وہ آپ کے خلاف کوئی کیس بنانا چاہتا تھا۔ لیکن تفصیل سننے کے بعد میں نے اس کی مدد کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ میں صرف یہ کہنے آپ کے پاس آیا ہوں کہ آپ اس شخص سے محتاط رہیں۔ وہ کمینہ صفت آدمی ہے اور کوئی بھی الٹی سیدھی حرکت کر سکتا ہے۔"

شمشاد بیگم کے چہرے پر ممنونیت کے تاثرات نمودار ہو گئے، بولی "آپ اندر تشریف لے آئیں۔"

میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا "میں دفتر سے آ رہا ہوں اور خاصا تھکا ہوا ہوں۔"

مرد اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا "میرا نام ڈاکٹر علی اختر ہے۔ آئیں نا، کم از کم ایک کپ چائے ہو جائے۔"

شمشاد بیگم نے کہا "اس بدمعاش نے ہمیں بہت تنگ کر رکھا ہے۔ اگر آپ بیٹھتے تو میں آپ کو اس کے کرتوت سناتی۔ بھائی صاحب کی مہربانی سے ہمیں کچھ سکون کا سانس لینا نصیب ہوا ہے۔ ورنہ اس نے تو ہمارا جینا حرام کر دیا تھا۔" بھائی صاحب اس نے ڈاکٹر علی اختر کو کہا تھا۔

اسی لمحے پندرہ سولہ سال کی ایک خوبصورت لڑکی دروازے کے قریب نمودار ہوئی۔

"یہ میری بیٹی ثروت صبا ہے۔" شمشاد بیگم نے کہا "بیٹی! یہ وکیل صاحب ہیں۔ وہ بدمعاش جبّار خان ان کے پاس گیا تھا، ہمارے خلاف کوئی جھوٹا کیس بنانا چاہتا تھا، مگر انھوں نے اُسے دھکے دے کر نکال دیا، اگر سارے وکیل ایسے ہو جائیں تو ان ڈاکوؤں اور بدمعاشوں کا دماغ ٹھکانے پر آ جائے۔"

صبا نے مجھے سلام کیا، پھر بولی "کیا آپ ہمیں شکریے کا موقع نہیں دیں گے؟"

میں نے کارڈ نکال کر ڈاکٹر علی اختر کے ہاتھ میں تھمایا اور صبا سے کہا "اس بات کا فیصلہ یہ جاننے کے بعد کروں گا کہ آپ کس طرح میرا شکریہ ادا کرنا چاہتے ہیں۔ فی الحال میں بہت تھکا ہوا ہوں اور جانا چاہتا ہوں۔"

جب میں رخصت ہو کر اپنی کار کی طرف بڑھا تو میں نے دیکھا کہ ثروت صبا نے ڈاکٹر علی اختر... کے ہاتھ سے میرا کارڈ لے لیا تھا اور بڑے غور سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

چند روز کے بعد یہ سارا معاملہ میرے ذہن سے محو ہو گیا۔

ایک روز میں عدالت سے فارغ ہو کر دفتر پہنچا تو ایک ادھیڑ عمر عورت کو اپنا منتظر پایا۔ اس کے ساتھ ایک دس بارہ سالہ لڑکا بھی تھا۔ عورت کا لباس زیادہ قیمتی نہیں تھا تاہم وہ پڑھی لکھی اور سلیقہ شعار عورت معلوم ہوتی تھی۔ اس نے اپنا نام مسز زرینہ اختر بتایا اور ایک کارڈ میری طرف بڑھایا۔ وہ میرا ہی کارڈ تھا۔ اس کی پشت پر یہ عبارت لکھی تھی۔

جناب بیگ صاحب! چند روز قبل آپ سے شمشاد بیگم کے بنگلے پر ملاقات ہوئی تھی۔ آپ کی شخصیت نے مجھے بہت متاثر کیا تھا، اس لیے جب وکیل کی ضرورت پڑی تو آپ ہی یاد آئے۔ اپنی بیوی کو آپ کے پاس بھیج رہا ہوں۔ اس وقت میں جبّار خان کے قتل کے الزام میں حوالات میں بند ہوں۔ تفصیل میری بیوی آپ کو بتا دے گی۔

فقط ڈاکٹر علی اختر

خط پڑھ کر میرے دل میں سب سے پہلے یہ خیال پیدا ہوا کہ کیا ڈاکٹر علی اختر نے واقعی جبّار خان کو قتل کر دیا تھا؟ مجھے جبار خان کی موت سے زیادہ ڈاکٹر علی اختر کی گرفتاری پر افسوس ہوا تھا کیونکہ وہ ایک معقول آدمی تھا اور دو بے سہارا عورتوں کی مدد کر رہا تھا۔

جبّار خان نے ایک یتیم لڑکی پر شرط لگائی تھی۔ وہ اس شرط پر رقم کے علاوہ زندگی بھی ہار گیا تھا۔ ایسے نوجوانوں کے لیے اور کس قسم کے انجام کی توقع کی جاسکتی ہے۔

میں نے ڈاکٹر علی اختر کی بیوی سے پوچھا "یہ واقعہ کب پیش آیا ہے؟"

وہ خاصی پریشان نظر آتی تھی۔ اس نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "یہ... یہ تین روز پہلے کی بات ہے۔ پولیس اچانک ہمارے گھر آئی اور ڈاکٹر صاحب کو گرفتار کر کے لے گئی۔ کہتے ہیں کہ انھوں نے ایک آدمی کو قتل کر دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ایسے آدمی نہیں ہیں۔ وہ قسمیں کھاتے ہیں کہ انھوں نے جبّار خان کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ وکیل صاحب، ہم بہت بڑی مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ ہمارے گھر میں اور کوئی کمانے والا بھی نہیں ہے۔ میں نے انھیں کہا بھی تھا کہ شمشاد بیگم سے زیادہ مراسم نہ بڑھائیں۔ اب انھیں اپنی غلطی کا احساس ہو رہا ہے۔ صبح میں تھانے میں ان سے ملنے گئی تو مجھے دیکھ کر رونے لگے، کہنے لگے "زرینہ! اگر میں تمھاری بات مان لیتا تو آج یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔"

"واردات کب ہوئی ہے؟"

"تین تاریخ کو۔" اس نے جواب دیا۔ "کہتے ہیں، قتل ڈاکٹر صاحب کے پستول سے کیا گیا ہے۔ پولیس نے اُن کا پستول بھی اپنے قبضے میں لے لیا ہے۔"

میں نے محتاط لہجے میں پوچھا۔ "آپ کو پتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے جبّار خان کو قتل کی دھمکی دی تھی؟"

"یہی بات پولیس بھی کہتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ایسی دھمکی دی ہو لیکن وہ قتل نہیں کر سکتے۔ انھیں ایسی باتیں کرنے کی بہت عادت ہے۔ دوسروں کی ہمدردی میں خواہ مخواہ پریشان ہو جاتے ہیں مگر وہ اتنا آگے نہیں جا سکتے۔"

"شمشاد بیگم سے آپ کا کیا تعلق ہے؟" میں نے پوچھا۔ "کوئی رشتے داری ہے یا محض جان پہچان ہے؟"

"نہ رشتے داری ہے اور نہ جان پہچان۔" اس نے جواب دیا۔ "میں تو آج تک اس عورت سے ملی بھی نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی ان سے نئی نئی جان پہچان ہوئی ہے۔ پتا نہیں اس عورت نے ان پر کیا جادو کر دیا تھا۔ صبح شام اس کے غم میں گھلے جا رہے تھے۔ روزانہ رات کو اس کے گھر چلے جاتے تھے۔ اس کی وجہ سے ان کی پریکٹس بھی متاثر ہو رہی تھی۔"

میں نے ضروری باتیں نوٹ کرلیں، کچھ ایڈوانس فیس وصول کی اور اپنی اوّلین فرصت میں ڈاکٹر علی اختر سے ملنے کا وعدہ کیا۔ زرینہ اختر پُرنم آنکھوں کے ساتھ رخصت ہوگئی۔

اگلے روز میں نے تھانے میں جاکر ایف آئی آر کی نقل حاصل کی اور حوالات میں ڈاکٹر علی اختر سے ملاقات کی۔ وہ پریشان اور چُپ چُپ تھا۔ میرے سوال کے جواب میں اُس نے کہا۔ "بیگ صاحب! میں آپ سے یہ نہیں کہوں گا کہ میں بالکل بے گناہ ہوں۔ لیکن میں نے جبّار خان کو قتل نہیں کیا۔"

ایف آئی آر کے مطابق جبّار خان کو اس کے پستول سے قتل کیا گیا تھا۔ بوقتِ قتل اس کا جائے واردات پر موجود ہونا ثابت ہو چکا تھا۔ کم از کم تین معتبر گواہوں نے فائرنگ کی آواز سنی تھی اور اُسے جائے واردات سے فرار ہوتے دیکھا تھا۔

میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! ایف آئی آر میں لکھا ہے کہ قتل آپ کے پستول سے کیا گیا ہے۔ اس بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟"

"پولیس یہی کہتی ہے۔ یہ لوگ مجھ سے اقبالی بیان حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے مجھ پر بہت تشدّد کیا ہے لیکن میں نے ابھی تک اقبالی بیان نہیں دیا۔ اب آپ جو حکم دیں گے میں وہی کروں گا۔ میں نے سنا ہے کہ پولیس تشدّد کی وجہ سے دیے گئے بیان کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ عدالت میں جا کر بیان بدلا جاسکتا ہے۔"

"ملزم کے اقبالی یا انکاری بیان سے زیادہ فرق نہیں پڑتا۔" میں نے کہا۔ "عدالت پہلے شہادتوں کو دیکھتی ہے۔ ایف آئی آر کے مطابق آپ نے جبّار خان پر اپنے پستول سے تین فائر کیے تھے۔ تینوں گولیاں نشانے پر لگی تھیں اور جبّار خان موقع پر ہلاک ہو گیا تھا۔ پولیس نے واردات کے ایک گھنٹے کے اندر آپ کو آلۂ قتل سمیت گرفتار کر لیا۔ ایف آئی آر میں یہ بھی لکھا ہے کہ پولیس نے آپ کے محلّے کے دو معتبر گواہوں کی موجودگی میں آپ کا پستول چیک کیا تھا اور پستول کی تین گولیاں چلی ہوئی پائی تھیں۔ ان باتوں میں کتنی صداقت ہے؟"

"یہ بات میری سمجھ میں بھی نہیں آئی۔ جب پولیس نے میرے سامنے پستول کا کلِپ چیک کیا تو اس کی تین گولیاں واقعی چلی ہوئی تھیں۔ ہوسکتا ہے کہ پولیس نے خود ہی کوئی گڑبڑ کی ہو۔"

"جب یہ واردات وقوع پذیر ہوئی تو آپ کہاں تھے اور آپ کے سامنے کیا واقعہ پیش آیا تھا؟"

"یہ تین تاریخ کی بات ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "اُس وقت رات کے تقریباً دس بجے تھے۔ میں نے رات کا کھانا شمشاد بیگم کے گھر میں کھایا تھا۔ جب میں جانے لگا تو اچانک شمشاد بیگم نے مجھے بتایا کہ جبّار خان آیا ہے۔ یہ بات سن کر مجھے تعجب بھی ہوا اور غصّہ بھی آیا۔ میں نے شمشاد بیگم سے کہا کہ میں جبّار خان سے بات کرتا ہوں۔ اس نے کہا۔ 'آپ ادھر ہی ٹھہریں، میں اسے شریفانہ طور پر سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں۔'

مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی۔ میں نے کہا۔ 'تمھیں اس بدمعاش کے منہ نہیں لگنا چاہیے۔ وہ اس بات کو تمھاری کمزوری سمجھے گا۔ اس لیے تم یہ بات مجھ پر چھوڑ دو۔ میں ایسے لوگوں کی فطرت کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔'

لیکن شمشاد بیگم نے میرا مشورہ نہیں مانا اور مجھے ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر جبّار خان سے بات کرنے چلی گئی۔ میں نے سوچا کہ مجھے فوراً وہاں سے چلے جانا چاہیے اور دوبارہ اُدھر کا رخ نہیں کرنا چاہیے۔ میں اس عورت کے لیے اتنی قربانی کر رہا تھا اور وہ میری کوئی بات ماننے پر تیار نہیں تھی۔ پھر دو یا تین منٹ کے بعد میں نے گولیاں چلنے کی آواز سنی۔ میں باہر کی طرف بھاگا۔ برآمدے میں میں شمشاد بیگم سے ٹکرا گیا۔ وہ بہت بدحواس ہو رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ بے ہوش ہو جائے گی۔ خوف کی وجہ سے اس نے مجھے بڑی مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔ اس کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ میرے بار بار پوچھنے پر اس نے بتایا کہ کسی نے جبّار خان کو قتل کر دیا ہے۔

اس کی لاش خواب گاہ میں پڑی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ شمشاد بیگم اسے بغلی دروازے سے خواب گاہ میں لے گئی تھی۔ یہ اندازہ میں نے کھلا ہوا دروازہ دیکھ کر لگایا تھا۔ جبّار خان کی لاش دیکھ کر میں گھبرا گیا۔ مجھے خیال آیا کہ پولیس سب سے پہلے مجھ پر شک کرے گی۔ کیونکہ میں... مم... میرا مطلب ہے کہ جبّار خان یہ پروپیگنڈا کر رہا تھا کہ میں نے اسے قتل کی دھمکی دی ہے۔ میں نے شمشاد بیگم سے کہا کہ میری وہاں موجودگی مناسب نہیں ہوگی۔ اس نے بھی یہی مشورہ دیا کہ مجھے وہاں سے چلے جانا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن بدحواسی کی وجہ سے میرے دماغ کے سارے چراغ گُل ہو چکے تھے۔ اُدھر فائرنگ کی آواز سن کر کچھ پڑوسی باہر نکل آئے تھے۔ جب میں نے اپنی گاڑی باہر نکالی تو انھوں نے مجھے دیکھ لیا۔"

میں نے پوچھا۔ "واردات والی رات شمشاد بیگم کے گھر میں اور کون تھا؟"

"میرا خیال ہے کہ واردات کے وقت وہاں میرے علاوہ باہر کا کوئی آدمی موجود نہیں تھا۔ تھوڑی دیر پہلے صبا کا چچا نصیر علی وہاں آیا تھا اور چند منٹ ٹھہر کر واپس چلا گیا تھا۔"

"جب آپ نے فائرنگ کی آواز سنی، اُس وقت صبا کہاں تھی؟"

"وہ کسی دوسرے کمرے میں تھی۔ اس نے ہمارے ساتھ ہی کھانا کھایا تھا لیکن کھانے کے بعد وہ اٹھ کر اندر چلی گئی تھی۔ اس کے بعد میں نے اُسے نہیں دیکھا۔"

"آپ اپنا پستول کہاں رکھتے ہیں؟"

"پستول میں عموماً کار کے خانے میں رکھتا ہوں۔ اس روز بھی وہیں رکھا تھا۔"

"کیا آپ گاڑی کو لاک کر کے اندر گئے تھے یا کھلا چھوڑ گئے تھے؟"

"میرا خیال ہے کہ گاڑی لاک تھی۔ میں ہمیشہ گاڑی کو لاک رکھتا ہوں۔"

"شمشاد بیگم نے واردات کے بارے میں کیا بیان دیا ہے؟"

"مجھے اس کا بیان معلوم نہیں ہے۔ اس نے مجھے صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ جبّار خان کو کمرے میں بٹھا کر کوئی چیز لینے یا رکھنے کے لیے باہر نکلی تو اچانک باہر کی بتّی بند ہوگئی اور فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ اس کا خیال ہے کہ کسی نے کھڑکی سے فائرنگ کی تھی۔"

"آپ نے فائرنگ سے پہلے یا بعد میں کوئی غیر معمولی بات تو نوٹ نہیں کی؟"

اس نے تامّل کرتے ہوئے کہا۔ "میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا، بعض باتیں خواہ مخواہ ذہن میں کھٹکنے لگتی ہیں۔ ہو سکتا ہے، وہ سب میرا وہم ہو اور سچ پوچھیں تو اس وقت میرا ذہن صحیح کام نہیں کر رہا۔"

"وکیل صاحب! اب اس کی جان چھوڑ دو۔" حوالات کے سامنے پہرہ دینے والے سپاہی نے کہا۔ "قتل کرنے والے نے کبھی اپنا جرم تسلیم کیا ہے۔ یہاں آکر سب بے گناہ بن جاتے ہیں۔"

میں نے ڈاکٹر علی اختر سے چند اور باتیں پوچھیں اور اندر جاکر ایس ایچ او سے گواہوں کے بارے میں دریافت کیا۔ اس نے جواب دیا کہ جب تفتیش مکمل ہوگی اور چالان عدالت میں پیش کیا جائے گا تو گواہوں کے بارے میں بھی پتا چل جائے گا۔ دراصل میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ شمشاد بیگم نے پولیس کو کیا بیان دیا تھا اور اس کا بیان کس حد تک ڈاکٹر علی اختر کی صفائی میں استعمال ہوسکتا تھا۔

چونکہ شمشاد بیگم ہمارے گھر کے قریب ہی رہتی تھی،

اس لیے دو روز کے بعد میں اس سے ملنے چلا گیا۔ اس نے قدرے خشک لہجے میں میرے سلام کا جواب دیا اور میری آمد کا مدعا پوچھا۔ مجھے اس کے رویّے پر خاصا تعجب ہوا۔ اس نے مجھے اندر بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہا تھا۔

"میں آپ کو شکریے کا موقع دینے آیا ہوں۔" میں نے کہا "بشرطیکہ آپ کو کوئی زحمت نہ ہو۔"

اس نے پیچھے کی طرف دیکھا اور قدرے ناگواری سے بولی "ہم اس وقت کام سے جا رہے تھے۔ خیر... آئیں، تشریف لائیں۔"

وہ مجھے برآمدے میں لے گئی اور بید کی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "بیٹھیں، کیا پینا پسند کریں گے؟"

"پسند تو میں کچھ بھی نہیں کروں گا لیکن اگر آپ خوشی سے... خالی چائے بھی پلا دیں گی تو میں انکار نہیں کروں گا۔"

اس کے چہرے پر کوئی نرمی ظاہر نہیں ہوئی، اس نے اندرونی دروازے میں جا کر اپنی بیٹی کو آواز دی اور اسے چائے لانے کے لیے کہا پھر واپس آ کر کرسی پر بیٹھ گئی اور سنجیدگی سے بولی "وکیل صاحب! بات یہ ہے کہ ایک بیوہ عورت کو اس معاشرے میں بہت ڈر کر رہنا پڑتا ہے۔ اگر کوئی ملنے آ جاتا ہے تو لوگ طرح طرح کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ پھر میری عمر بھی اتنی زیادہ نہیں ہے۔"

"جی ہاں، یہ تو ہے۔ سفید کپڑے کا دھبّا دور سے نظر آ جاتا ہے۔" میں نے کہا، پھر موضوع بدلا "میں نے اخبار میں جبّار خان کے قتل کی خبر پڑھی تھی۔ میں نے سوچا کہ شاید آپ کو قانونی مدد کی ضرورت ہو، اس لیے چلا آیا۔"

"وکیل صاحب! آج کل ہر شخص کسی نہ کسی ہیر پھیر کے چکّر میں رہتا ہے۔ اب دیکھیں نا ڈاکٹر علی اختر دیکھنے میں بڑے مخلص نظر آتے تھے، مگر..." اس نے دائیں بائیں سر ہلایا "چھوڑیں، کیا فائدہ کسی کی برائی کرنے سے۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ عورت ڈاکٹر علی اختر کی ہمدرد نہیں تھی۔ دوسرا اندازہ میں نے یہ لگایا کہ اس نے جو بیان پولیس کو دیا ہوگا، وہ اگر ڈاکٹر علی اختر کے خلاف نہیں ہوگا تو ہمدردی میں بھی نہیں ہوگا۔ لہٰذا میں نے اس کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے کہا "میں تو پہلی ہی ملاقات میں ڈاکٹر علی اختر کی اصلیت سمجھ گیا تھا لیکن اس خیال سے خاموش رہا کہ مجھے پرائے معاملے میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے۔ اس شخص سے آپ کی جان پہچان کیسے ہوئی تھی؟"

"جان پہچان کیسی؟" اس نے تیوری چڑھا کر کہا "زبردستی کے ہمدرد بن گئے تھے۔ وہ کیا کہتے ہیں، مچھلی کے منہ سے بچتے بچتے مگرمچھ کے منہ میں جا پھنسے۔ ایک روز صبا کو اسکول سے چھٹی ہوئی تو وہ جبّار سؤر اس کے پیچھے لگ گیا۔ یہ صاحب کار میں اُدھر سے گزر رہے تھے۔ ان کے ساتھ ایک عورت بھی تھی۔ انھوں نے ہمدردی کرتے ہوئے صبا کو لفٹ دی اور یہاں گھر چھوڑ گئے۔ مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ میں نے انھیں ایک کپ چائے پلانے کے لیے روک لیا۔ اس کے بعد یہ زبردستی ہمارے سرپرست بن گئے۔ کہنے لگے کہ ان کا یہی راستہ ہے، وہ صبا کو روزانہ اسکول چھوڑ دیا کریں گے۔ میں نے انھیں شریف آدمی سمجھ کر صبا کو ان کے ساتھ بھیجنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد ان کا زیادہ وقت ہمارے گھر میں گزرنے لگا۔ پھر انھوں نے مجھ سے شادی کی خواہش کا اظہار کر دیا۔ ہونہہ... انسان کو اپنی اوقات دیکھ کر بات کرنا چاہیے۔"

میں نے چالاکی سے کہا "میرا خیال ہے کہ وہ اصلی ڈاکٹر نہیں ہیں اور ان کی مالی حالت بھی زیادہ اچھی نہیں۔ اس کے علاوہ بیوی بچّوں والے بھی ہوں گے۔ یہ... انھوں نے شادی کی تجویز کب پیش کی تھی؟"

وہ سوچتی ہوئی بولی "جبّار خان کے قتل سے تقریباً ایک ہفتہ پہلے۔"

اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ عورت اچھی خاصی موقع پرست تھی۔ جب اُسے یہ بات معلوم ہو گئی کہ ڈاکٹر علی اختر اس سے شادی کرنا چاہتا ہے تو اُسے یا تو اس سے فوراً قطع تعلق کر لینا چاہیے تھا یا اس کی تجویز کا مثبت جواب دینا چاہیے تھا۔

میں نے یہ جاننے کے لیے کہ آیا وہ ڈاکٹر علی اختر کو جبّار خان کے قتل کا ذمّے دار سمجھتی ہے یا نہیں، کہا "میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر علی اختر نے آپ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے جبّار خان کو قتل کیا ہے۔"

وہ چپ سی ہو گئی، تھوڑی دیر بعد بولی "میں اس سلسلے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔"

"پولیس کے خیال میں تو سارا کیس بہت سیدھا سادا ہے۔" میں نے کہا "بقول ان کے انھوں نے گواہوں کی موجودگی میں ملزم کو آلۂ قتل سمیت گرفتار کیا ہے۔ اس کے علاوہ ملزم کی موقعِ واردات پر موجودگی بھی ثابت ہے۔ اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے؟ سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ملزم نے مقتول کو دو تین بار قتل کی دھمکی بھی دی تھی۔ اس بات کا تو میں بھی گواہ ہوں۔ یہ بات خود جبّار خان نے مجھے بتائی تھی کہ ڈاکٹر علی اختر نے اسے قتل کی دھمکی دی تھی۔"

"دھمکی تو انھوں نے واقعی دی تھی۔" شمشاد بیگم نے کہا۔

پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی "عدالت کو یہ بھی تو سوچنا چاہیے کہ مقتول نے ایک معصوم اور یتیم لڑکی کی زندگی عذاب بنا رکھی تھی اور وہ اسی سزا کا مستحق تھا۔"

"اس کا انحصار تو آپ کے بیان پر ہے۔ آپ کے اور آپ کی بیٹی کے بیان پر۔"

"میں تو اس معاملے سے دور ہی رہنا چاہتی ہوں۔"

اتنے میں ثروت صبا چائے بنا کر لے آئی اور چونکتے ہوئے بولی "ارے! آپ بیگ صاحب ہیں، السلام علیکم... آپ برآمدے میں کیوں بیٹھے ہیں؟"

"یہ تو گھر والوں کی مرضی ہے۔" میں نے اس کی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "جہاں بٹھائیں گے وہیں بیٹھنا پڑے گا۔"

"امّی تو بس ایسے ہی ہیں۔" صبا نے کہا "کبھی کبھی ان کی باتیں میری سمجھ میں بھی نہیں آتیں۔ آپ اندر آ کر بیٹھیں۔ آپ سے تو ہمیں بہت ساری باتیں کرنا ہیں۔ پولیس نے ہمیں بہت پریشان کر رکھا ہے۔" اس نے مجھے اندر ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور چائے سامنے رکھ کر بولی "پولیس چاہتی ہے کہ ہم انکل اختر کے خلاف جھوٹا بیان دیں۔"

"صبا..." شمشاد بیگم نے سخت لہجے میں کہا "تم اندر چلو، میں خود ہی بیگ صاحب سے بات کر لیتی ہوں۔"

صبا اپنی ماں کے حکم کی پروا کیے بغیر صوفے پر بیٹھ گئی، بولی "ہمیں ایسا بیان نہیں دینا چاہیے جس سے انکل اختر پر الزام آئے۔ ذرا سوچیں تو، انھوں نے ہمارے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ اگر وہ مکان کی قسطیں ادا نہ کرتے تو آج ہمارا مکان نیلام ہو چکا ہوتا۔"

"ہائے... خوامخواہ بک بک کیے جا رہی ہے۔" شمشاد بیگم نے غصّے سے کہا "میں واپس کر دوں گی ان کی رقم۔ قرض لینے کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ ہم انھیں سر پر چڑھا لیں۔"

"ٹھیک ہے، لیکن ہمیں ان کے خلاف بھی بیان نہیں دینا چاہیے۔"

"کیا تم یہ چاہتی ہو کہ... کہ میں پھانسی پر چڑھ جاؤں؟" شمشاد بیگم نے کہا۔ پھر فوراً ہی لہجہ بدل کر بولی "تم خوامخواہ ہی پریشان ہو رہی ہو۔ میں نے ان کے خلاف کوئی بیان نہیں دیا۔"

صبا میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "بیگ صاحب! اگر ہم پولیس کے گواہوں میں اپنا نام دیں گے تو کیا ہمارا بیان انکل کے خلاف نہیں ہو جائے گا؟"

"پولیس آپ کا بیان تو ضرور لے گی۔" میں نے کہا "کیونکہ قتل آپ کے گھر میں ہوا ہے۔ آپ کو عدالت میں بھی بیان دینا پڑے گا لیکن اگر آپ سمجھتی ہیں کہ ڈاکٹر صاحب بے گناہ ہیں تو آپ عدالت میں بیان دینے سے پہلے وکیلِ صفائی سے مشورہ کر لیں۔" میں نے انھیں یہ نہیں بتایا تھا کہ ڈاکٹر علی اختر نے مجھے وکیلِ صفائی مقرر کیا ہے۔

"ہمیں اس چکّر میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟" شمشاد بیگم نے کہا "اگر کوئی وکیلِ صفائی ہمارے پاس آئے گا تو دیکھا جائے گا۔ ہمیں اپنے آپ کو بھی تو... میرا مطلب ہے کہ اپنی مجبوریوں کو بھی تو دیکھنا ہے۔"

میں نے اندازہ لگایا کہ شمشاد بیگم اصل حقیقت کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی باتوں سے یہ اندازہ بھی ہوتا تھا کہ وہ ڈاکٹر علی اختر کو بے گناہ سمجھتی تھی لیکن کسی مصلحت کے تحت اس بات کا اظہار نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میں نے سوچا۔ کیا اصل قاتل کوئی اور تھا اور کیا شمشاد بیگم اُسے جانتی تھی؟

تھوڑی دیر بعد جب صبا چائے کے برتن اٹھا کر اندر چلی گئی تو میں نے رازدارانہ لہجے میں کہا "لڑکی ابھی نادان ہے۔ اسے نرمی سے سمجھائیں۔ آپ کو تو اللہ نے ایک ساتھ دو مصیبتوں سے بچا لیا۔ مچھلی سے بھی اور مگرمچھ سے بھی۔"

"کبھی کبھی یہ لڑکی بہت ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے۔"

میں نے قدرے محتاط لہجے میں کہا "ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ آپ نے جبّار خان کو اندر کیسے بلا لیا؟"

وہ تامّل کرتے ہوئے بولی "اس کمبخت کو یہ بات معلوم نہیں ہے کہ اس کتّے نے اسے اغوا کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ وہ بہت کمینہ شخص تھا۔ کسی کی پروا نہیں کرتا تھا۔ اس نے یہاں گھر آ کر مجھے اغوا کی دھمکی دی تھی۔ پہلے میں نے سوچا کہ مکان کو کرائے پر اٹھا کر کسی دوسرے علاقے میں چلے جانا چاہیے لیکن پھر کسی نے مشورہ دیا کہ اس طرح چھپنے سے بات نہیں بنے گی۔"

وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی، مگر کسی مصلحت کے تحت چپ ہو گئی۔ میں نے پوچھا "کیا ڈاکٹر علی اختر کو یہ بات معلوم تھی کہ جبّار خان نے صبا کو اغوا کرنے کی دھمکی دی ہے؟"

"نن... نہیں، میں نے انھیں یہ بات نہیں بتائی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ صبا کو بتا دیں گے اور صبا پریشان ہو گی۔ لہٰذا میں نے کسی کو یہ بات نہیں بتائی۔"

میں نے شمشاد بیگم کا شکریہ ادا کیا اور جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ صبا بھی کمرے میں آ گئی۔

"آپ کو اس کمرے میں جاتے ہوئے تو بہت ڈر لگتا ہو گا جس میں قتل ہوا تھا۔" میں نے کہا "کیا میں وہ کمرہ دیکھ سکتا ہوں؟"

صبا بولی "آپ چاہیں تو پورا گھر دیکھ سکتے ہیں۔ آیئے میرے ساتھ۔"

وہ مجھے ایک چھوٹی سی خواب گاہ میں لے گئی۔ اس میں دو چھوٹے بیڈ، ایک الماری، دو آرام کرسیاں، ایک سنگھار میز اور ایک شوکیس رکھا تھا۔ کرسیاں دروازے کے مقابل والی دیوار کے ساتھ رکھی تھیں۔ بستر بائیں طرف رکھے تھے۔ بائیں طرف والی دیوار کے ساتھ کمرے کی واحد کھڑکی تھی جو کرسیوں سے تقریباً آٹھ فٹ دور تھی۔ صبا نے مجھے بتایا کہ جب جبار خان پر فائر کیا گیا تو اس وقت وہ کرسی پر بیٹھا تھا۔ قالین اور دیوار پر اس کے خون کے دھبے ہنوز دیکھے جا سکتے تھے حالانکہ انھیں دھونے کی کوشش کی گئی تھی۔ میں کرسی پر سیدھا بیٹھ گیا۔ میرا دایاں بازو اور دائیں کنپٹی کھڑکی کی طرف تھی۔ اگر کسی نے کھڑکی سے فائر کیا تھا تو گولیاں جبّار کے جسم کے دائیں حصّے پر لگنا چاہیے تھیں۔

میں نے شمشاد بیگم سے پوچھا کہ جب جبار پر فائر کیا گیا تو اس وقت وہ کہاں تھی؟

"جب میں جبّار کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوئی تو میں نے میز پر کچھ گندے برتن پڑے ہوئے دیکھے۔" اس نے جواب دیا۔ "میں نے جبّار کو بٹھایا اور برتن اٹھا کر باورچی خانے کی طرف چلی گئی تھی۔"

"چائے کے برتن؟" میں نے بظاہر بے خیالی میں پوچھا۔

"آں... ہاں... دو کپ تھے شاید۔" وہ تھوڑی سی گڑبڑا گئی۔ "ابھی میں باورچی خانے سے دو قدم ادھر ہی تھی کہ میں نے گولیاں چلنے کی آواز سنی۔ مجھ پر تو سکتہ ہی طاری ہو گیا۔ برآمدے میں جا کر دیکھا تو باہر کی بتّیاں بجھی ہوئی تھیں اور ڈاکٹر صاحب اپنی کار کی طرف بھاگے جا رہے تھے۔" اچانک وہ چپ ہو گئی۔ شاید وہ ضرورت سے زیادہ بول گئی تھی۔ میں نے باہر نکل کر دائیں بائیں نظر دوڑائی۔ باورچی خانہ بائیں طرف تھا اور اُدھر ہی سے باہر جانے کا راستہ تھا۔ سامنے کی طرف ایک دروازہ تھا جو غالباً ڈرائنگ روم کی طرف جاتا تھا۔

قاتل یا تو کمرے میں چھپا ہوا تھا یا باورچی خانے کی طرف سے آیا تھا یا ڈرائنگ روم کی طرف سے۔ باورچی خانے کی طرف شمشاد بیگم تھی اور ڈرائنگ روم میں ڈاکٹر علی اختر تھا۔ چوتھا امکان یہ تھا کہ قاتل نے کھڑکی کے راستے سے جبّار خان پر فائرنگ کی تھی اور خاموشی سے باہر چلا گیا تھا۔

پولیس نے قتل کا جو نقشہ کھینچا تھا وہ کچھ یوں تھا۔ ڈاکٹر علی اختر کو یہ بات سخت ناگوار گزری کہ شمشاد بیگم نے جبار خان کو اندر بلا کر بٹھایا ہے۔ اس نے غصّے میں پستول نکال لیا اور ڈرائنگ روم کے اندرونی دروازے سے اس خواب گاہ میں پہنچ گیا جہاں جبار خان بیٹھا تھا۔ اتفاق سے اس وقت شمشاد بیگم برتن رکھنے باورچی خانے میں گئی تھی۔ اس نے جاتے ہی جبار خان پر تین گولیاں چلائیں اور فوراً واپس چلا گیا۔

کیس کی تیاری سے پہلے میں دو تین بار ڈاکٹر علی اختر سے ملا اور ضروری باتیں نوٹ کر لیں۔

چند روز کے بعد پولیس نے عدالت میں چالان پیش کر دیا۔ ابتدائی سماعت کے دوران میں نے ڈاکٹر علی اختر کی ضمانت کرانے کی بہت کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ اس بات پر مجھے کوئی زیادہ تعجب نہیں ہوا کہ شمشاد بیگم اور اس کی بیٹی ثروت صبا کا نام استغاثے کے گواہوں میں شامل تھا۔ استغاثے کی طرف سے کُل دس گواہوں کی فہرست عدالت میں پیش کی گئی تھی۔

ان میں تین گواہ شمشاد بیگم کے پڑوسی تھے۔ انھوں نے تین تاریخ کو رات کے سوا دس بجے شمشاد بیگم کے گھر سے گولیاں چلنے کی آواز سنی تھی اور ڈاکٹر علی اختر کو اپنی کار میں وہاں سے رخصت ہوتے دیکھا تھا۔

تین گواہ مقتول جبار خان کے دوست تھے۔ انھوں نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ ڈاکٹر علی اختر نے جبار خان کو قتل کی دھمکی دی تھی۔

دو گواہ ڈاکٹر علی اختر کے پڑوسی تھے۔ پولیس نے ان گواہوں کی موجودگی میں ڈاکٹر کی کار سے آلۂ قتل یعنی پستول برآمد کیا تھا۔

آخری دو گواہ شمشاد بیگم اور ثروت صبا اس کیس کی اہم گواہ تھیں۔ ان کے بیانات کی تفصیل آگے آئے گی۔

میں پولیس اور عدالت کی ضابطے کی کارروائیوں کا ذکر حذف کرتے ہوئے گواہوں کے بیانات اور ان پر ہونے والی جرح کی کارروائی آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

تاہم اس سے قبل کچھ ضروری باتیں۔ میڈیکل ایگزامینر کی رپورٹ کے مطابق مقتول کے جسم پر گولیوں کے تین نشانات پائے گئے تھے اور یہی اس کی موت کا سبب تھے۔ ایک گولی ہنسلی کی ہڈی کے قریب، ایک دل پر اور ایک دل سے ذرا نیچے لگی تھی۔ گولیاں بہت قریب سے چلائی گئی تھیں اور یہ بات بھی ثابت ہو گئی تھی کہ وہ ڈاکٹر علی اختر کے پستول سے چلائی گئی تھیں۔

سب سے پہلا گواہ جو استغاثے کی طرف سے پیش کیا گیا، اس کا نام اعظم علی تھا۔ وہ اٹھائیس اُنتیس سال کا ایک بازاری قسم کا نوجوان تھا۔ وہ کسی فیکٹری میں ملازم تھا اور جبّار خان کا پرانا دوست تھا۔ اس نے اپنے بیان میں کہا کہ جبّار خان ایک شریف نوجوان تھا اور ہمیشہ دوسروں کے کام آتا تھا۔ اس نے کبھی کسی لڑکی کو بُری نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ شمشاد بیگم کے ساتھ اس کے پڑوسیوں والے مراسم تھے اور وہ اکثر ان کے گھر آتا جاتا تھا۔ ملزم علی اختر کو اس کا آنا جانا اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس نے جبار خان کو دھمکی دیتے ہوئے کہا تھا کہ اگر اس نے شمشاد بیگم کے گھر آنا جانا بند نہ کیا تو وہ اُسے قتل کر دے گا۔

گواہ کا بیان ختم ہوا تو وکیلِ استغاثہ نے اس سے چند سرسری قسم کے سوالات کیے۔ وہ عدالت کو یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ گواہ ایک معتبر شخص تھا۔ اس کے بعد میں گواہ پر جرح کرنے کے لیے آگے آیا۔ ایک ضمنی بات کا ذکر کر دینا مناسب ہو گا۔ مقتول جبّار خان کا باپ ایک اعلیٰ سرکاری افسر ہے، اس لیے اس کا واضح الفاظ میں ذکر نہیں کیا جا سکتا۔

میں نے گواہ سے پوچھا "کیا یہ صحیح ہے کہ مقتول کی عمر چھبیس سال تھی، وہ نان میٹرک تھا اور کوئی کام نہیں کرتا تھا؟"

"عمر تو آپ نے ٹھیک بتائی ہے۔" اعظم علی نے جواب دیا۔ "لیکن یہ مجھے معلوم نہیں ہے کہ اُس کی تعلیم کتنی تھی اور جہاں تک کام کا تعلق تھا اُسے کام کی ضرورت ہی نہیں تھی۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔ "اُسے کام کی ضرورت کیوں نہیں تھی؟"

"اس کے ابا سرکاری افسر ہیں اور تنخواہ کے علاوہ اُن کی اوپر کی... میرا مطلب ہے کہ ان کی معقول آمدنی ہے۔"

"کون سی آمدنی معقول ہے؟ تنخواہ یا اوپر کی آمدنی؟"

وکیلِ استغاثہ نے جلدی سے اٹھ کر کہا "جنابِ عالی! مجھے اعتراض ہے۔ وکیلِ صفائی ایک معزز سرکاری افسر کی عزت کو اچھالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"جنابِ عالی! میں نے صرف گواہ کو اپنے جواب کی تشریح کرنے کے لیے کہا ہے۔"

جج نے اعتراض تسلیم کیا۔

میں نے گواہ سے پوچھا "کیا ملزم نے تمھارے سامنے مقتول کو دھمکی دی تھی؟"

"نہیں" گواہ نے جواب دیا" یہ واقعہ میرے سامنے پیش نہیں آیا۔ مجھے جبّار خان نے دھمکی کے بارے میں بتایا تھا۔"
"تمھاری مقتول سے کتنی پرانی دوستی تھی؟"
"تقریباً دس بارہ سال پرانی"
گواہ نمبر دو اور تین بھی جبّار خان کے دوست تھے۔ انھوں نے بھی تقریباً وہی بیان دیا جو اعظم علی نے دیا تھا۔ انھوں نے اعتراف کیا کہ وہ جبّار خان کے پرانے دوست تھے اور انھیں بھی جبّار خان نے ہی دھمکی کے بارے میں بتایا تھا۔
میں نے گواہ نمبر تین سے پوچھا "کیا جبّار خان نے یہ نہیں بتایا کہ ملزم نے اُسے کیوں دھمکی دی تھی؟"
اس نے جواب دیا کہ ملزم کو جبّار خان کا شمشاد بیگم کے گھر آنا جانا پسند نہیں تھا۔
میں نے جج سے مخاطب ہو کر کہا "جنابِ عالی! یہ تینوں گواہ درحقیقت دوستی کا حق ادا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور رٹا ہوا بیان دُہرا رہے ہیں۔ مقتول کا شمشاد بیگم سے نہ تو کوئی تعلق تھا اور نہ ہی گھر میں آنا جانا تھا۔ مقتول شمشاد بیگم کی بیٹی ثروت صبا کو آتے جاتے چھیڑتا تھا اور اس سے بے تکلف ہونا چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں شمشاد بیگم نے اس کے خلاف پولیس میں رپورٹ بھی درج کرائی تھی جس کی نقل عدالت کے طلب کرنے پر پیش کی جا سکتی ہے۔"
گواہ نمبر چار اور پانچ نے بڑی مختصر گواہی دی۔ انھوں نے تین تاریخ کو رات کے دس سوا دس بجے فائرنگ کی آواز سنی اور صورتِ حال معلوم کرنے کے لیے باہر نکلے تو انھوں نے شمشاد بیگم کے بنگلے سے ایک نیلے رنگ کی فیئٹ کار نکلتے دیکھی۔ یہ کار وہ پہلے بھی وہاں دیکھ چکے تھے۔ اس وقت انھیں کار کے مالک کا نام معلوم نہیں تھا لیکن وہ اُسے شکل سے پہچانتے تھے۔
وکیلِ استغاثہ نے ان سے پوچھا کہ کیا ملزم ڈاکٹر علی اختر وہی شخص ہے جسے انھوں نے وقوعہ والے روز نیلے رنگ کی فیئٹ کار میں جاتے دیکھا تھا۔ انھوں نے اثبات میں جواب دیا۔
استغاثے کے چھٹے گواہ کا نام بختیار احمد تھا۔ اس کی عمر چوبیس پچیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اس کی محلّے میں الیکٹریشن کی دُکان تھی۔ اس کے بارے میں پتا چلا تھا کہ واردات کے بعد وہ کئی مرتبہ شمشاد بیگم کے گھر آتا جاتا دیکھا گیا تھا۔ اس نے اپنے بیان میں کہا کہ وقوعہ والے روز وہ رات کے دس بجے شمشاد بیگم کے گھر کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ اچانک اس نے گولیاں چلنے کی آواز سنی۔ وہ پریشان ہو گیا اور صورتِ حال معلوم کرنے کی غرض سے گیٹ کی طرف بھاگا۔ چند منٹوں کے بعد ڈاکٹر علی اختر نے گیٹ کھولا اور اپنی نیلے رنگ کی فیئٹ کار میں بیٹھ کر تیزی سے ایک طرف روانہ ہو گیا۔ گواہ نے مزید کہا کہ ڈاکٹر بہت گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔ پھر وہ ایک قدم اور آگے بڑھ گیا، بولا "جب ملزم گیٹ کھول رہا تھا تو میں نے اس کے ہاتھ میں کوئی چمکدار چیز دیکھی تھی۔"
میں اس کی بات سن کر چونکا۔ وہ ملزم کو مجرم ثابت کرنے میں خاصا مستعد نظر آتا تھا۔ یا تو اُسے اس کام کے لیے رشوت دی گئی تھی یا کوئی اور بات تھی۔
جب اس کا بیان مکمل ہو چکا تو میں اس پر جرح کرنے کے لیے کٹہرے کے قریب جا ٹھہرا اور پوچھا "تم ملزم ڈاکٹر علی اختر کو کتنے عرصے سے جانتے ہو؟"
"میں نے اسے پہلی مرتبہ واردات والے دن دیکھا تھا۔" اس نے جواب دیا۔ "آج دوسری مرتبہ دیکھ رہا ہوں۔"
"تم شمشاد بیگم کو کتنے عرصے سے جانتے ہو؟"
"بیگم صاحبہ سے میری جان پہچان بہت پرانی ہے۔ دو تین سال تو ضرور ہو گئے ہوں گے۔"
"پرانی جان پہچان کا مطلب یہ ہے کہ تمھارا ان کے گھر آنا جانا بھی ہو گا۔ کیا تم نے کبھی ڈاکٹر علی اختر کو ان کے گھر میں نہیں دیکھا تھا؟"
"نہیں جی، میں نے اس کو وہاں کبھی نہیں دیکھا۔ ویسے مجھے پتا چلا تھا کہ یہ اُدھر آتا جاتا ہے۔"
وہ یوں بات کر رہا تھا جیسے اس کی شمشاد بیگم سے قریبی رشتے داری ہو۔
میں نے سلسلۂ سوالات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "مسٹر بختیار احمد! تمھارے اپنے بیان کے مطابق تم نے وقوعہ والی رات سے پہلے ملزم کو کبھی نہیں دیکھا تھا، لہٰذا قطعی طور پر تم تعارف کے بغیر اُسے پہچان نہیں سکتے تھے۔ لیکن تمھارا کہنا یہ ہے کہ گولیوں کی آواز سننے کے بعد تم نے ڈاکٹر علی اختر کو گیٹ کھولتے دیکھا تھا۔ تم نے کیسے جانا کہ وہ ڈاکٹر علی اختر ہی ہے؟"
اس نے آنکھیں جھپکائیں اور تامّل کرتے ہوئے بولا۔ "وہ... وہ تھا تو ڈاکٹر علی اختر ہی۔ میرے پہچاننے یا نہ پہچاننے سے کیا ہوتا ہے۔ یہ بات تو آپ لوگ بھی جانتے ہیں۔"
جج نے چشمے کے اوپر سے گواہ کو گھورا، پھر بولا "دیکھو مسٹر بختیار! ہم کیا جانتے ہیں اور کیا نہیں جانتے، اس کا تمھاری گواہی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تم صرف وہ بات بتاؤ جو تم جانتے ہو۔ پہلے سوال کو اچھی طرح سمجھو، پھر جواب دو۔ تم یہ تو کہہ سکتے ہو کہ تم نے ایسے ایسے حلیے کے ایک شخص کو گیٹ کھولتے دیکھا تھا لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ تم نے ملزم علی اختر کو دیکھا تھا۔ کیونکہ تم یہ اعتراف کر چکے ہو کہ تم ملزم کو نہیں جانتے تھے۔"
وہ بے حس اور بونگا شخص تھا۔ اس نے جج کی تنبیہ کا کوئی اثر نہیں لیا، بولا "بہت بہتر جناب! آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ ویسے میں سمجھ گیا تھا کہ گیٹ کھولنے والا ملزم ہی ہے۔ مجھے اجازت ہے جناب؟"
"ابھی سوالات ختم نہیں ہوئے۔" میں نے کہا۔ "مسٹر بختیار احمد! ذرا سوچ کر بتاؤ کہ جب تم نے ایک شخص کو گیٹ کھولتے دیکھا تو کیا اس وقت بنگلے کے برآمدے یا صحن میں کوئی بتی جل رہی تھی؟"
"بتّی..." اس نے تی... کو لمبا کرتے ہوئے چھت کی طرف دیکھا۔ "نہیں جل رہی تھی۔"
"اور تم نے اندھیرے کے باوجود ایک ایسے شخص کو شناخت کر لیا جسے تم نے زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا اور تمھیں اس کا نام بھی معلوم نہیں تھا۔ کیا تم اس بات کی تشریح کرو گے؟"
"یہ تو اپنی اپنی سوچ اور سمجھ کی بات ہے۔"
میں نے پوچھا "جب گیٹ کھلا تو اندر سے... یعنی بنگلے کے اندر سے کس قسم کی آواز یا آوازیں سنائی دی تھیں؟"
"اس وقت ٹیپ ریکارڈر پر گانے چل رہے تھے۔"
مجھے خیال آیا کہ گیٹ کے باہر کھڑا ہوا آدمی صرف گانے کی آواز سن کر کیسے یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ وہ گانے ٹیپ ریکارڈر پر بج رہے تھے یا ریڈیو پر۔ گواہ کے جوابات مجھے شک میں ڈال رہے تھے۔ میں نے پوچھا "ذرا سوچ کر بتاؤ کہ یہ آواز کس کمرے سے آ رہی تھی؟ ڈرائنگ روم سے یا اس بیڈ روم سے جس میں قتل ہوا تھا؟"
"جنابِ عالی! یہ آواز صبا بی بی کے کمرے سے آ رہی تھی۔"
اس جواب سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ وہ اندر کا حال بخوبی جانتا تھا۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ کسی گواہ نے عورتوں کے چیخنے کا ذکر نہیں کیا تھا۔ حالانکہ گھر کے اندر اگر بلّی کا بچّہ

بھی مرجائے تو عورتیں چیخنا شروع کر دیتی ہیں۔ وہاں ایک آدمی قتل ہو گیا تھا اور کسی کے چیخنے کی آواز نہیں آئی تھی۔ اس کے بجائے اندر سے گانوں کی آواز آ رہی تھی۔ اس سے ایک ہی بات سمجھ میں آتی تھی اور وہ یہ کہ جبّار خان کا قتل شمشاد بیگم اور اس کی بیٹی صبا کی سازش سے ہوا تھا اور اس سازش میں غالباً بختیار احمد بھی شریک تھا۔ لہٰذا میں نے اس امکان کو ذہن میں رکھتے ہوئے سوالات کرنے شروع کیے۔

"بختیار احمد! تم نے ملزم کے ہاتھ میں، جب وہ گیٹ کھول رہا تھا، ایک چمکدار چیز دیکھی تھی۔ کیا تم اس عدالت کو بتاؤ گے کہ وہ کیا چیز تھی؟ یا تم نے اس چیز کے بارے میں کیا اندازہ لگایا تھا؟"

"پہلے تو میں اسے پائپ سمجھا تھا، لیکن بعد میں مجھے خیال آیا کہ وہ پستول تھا۔"

"یہ بتاؤ کہ جب نیلی فیئٹ کار گیٹ سے نکل کر چلی گئی تو تم نے کیا کیا؟"

"نیلی کار کے جانے کے بعد کسی نے گیٹ بند کر دیا اور پھر شمشاد بیگم اپنی بیٹی کے ہمراہ پولیس کو فون کرنے چلی گئی۔"

"کیا اس نے تمھارے ساتھ کوئی بات نہیں کی؟"

"اسے اتنا ہوش کہاں تھا۔ گھر میں لاش پڑی ہو تو... میرا مطلب قتل — مم... میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اتنی سنگین واردات... بہرحال، اس نے میرے ساتھ کوئی بات نہیں کی تھی۔"

وہ کچھ بوکھلا گیا تھا۔ میں نے کہا "جب اس نے تمھارے ساتھ کوئی بات نہیں کی تھی تو پھر تمھیں یہ کیسے پتا چلا کہ وہ پولیس کو فون کرنے جا رہی ہے؟"

"مم... میرا خیال ہے کہ... اس نے اپنی بیٹی سے فون کرنے کے بارے میں کچھ کہا تھا۔"

"اور تمھیں یہ کیسے پتا چلا کہ ان کے گھر میں لاش پڑی ہے، میرا مطلب ہے کہ ایک آدمی قتل ہو گیا ہے؟"

"وکیل صاحب! آپ خوا مخواہ مجھ پر الزام لگا رہے ہیں" اس نے گھبرا کر کہا "میں نے کب کہا ہے کہ ان کے گھر میں کوئی آدمی قتل ہو گیا۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ..."

وکیلِ استغاثہ اس کی مدد کرتے ہوئے بولا "جنابِ عالی! وکیلِ صفائی گواہ کو ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حقیقت صرف اتنی ہے کہ گواہ اپنی سادگی کے باعث بعد میں حاصل ہونے والی معلومات کو ابتدائی مشاہدے کے ساتھ ملا رہا ہے اور یہ ایک ایسی غلطی ہے جو کوئی بھی شخص کر سکتا ہے۔"

میں نے عدالت سے کہا "جنابِ عالی! گواہ کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ واردات کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے، اگر کسی بنگلے کے اندر سے گانوں کی آوازیں آ رہی ہوں تو کوئی شخص یہ نہیں بتا سکتا کہ وہ گانے ریڈیو پر نشر ہو رہے ہیں یا ٹیپ ریکارڈر پر بج رہے ہیں لیکن گواہ کو نہ صرف یہ معلوم ہے کہ وہ گانے ٹیپ ریکارڈر پر بج رہے تھے بلکہ یہ بھی معلوم ہے کہ وہ ٹیپ ریکارڈر صبا کے کمرے میں رکھا تھا۔ گواہ کو یہ بھی معلوم تھا کہ بنگلے میں ایک قتل ہو گیا تھا اور شمشاد بیگم، پولیس کو فون کرنے جا رہی تھی۔ پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ گواہ نے تاریکی کے باوجود ایک ایسے شخص کو پہچان لیا جسے اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ نیز گواہ کا عین واردات کے وقت بنگلے کے دروازے پر موجود ہونا بھی توجہ طلب ہے۔ ان حقائق سے کوئی بھی صاحبِ فہم شخص یہ نتیجہ اخذ کر سکتا ہے کہ گواہ واردات کے وقت بنگلے کے اندر موجود تھا۔ اس لیے میں فاضل عدالت سے یہ گزارش کروں گا کہ وہ گواہ کو شاملِ تفتیش کرنے کا حکم جاری کریں۔"

میں نے دیکھا، بختیار احمد پھٹی پھٹی نظروں سے جج کی طرف دیکھ رہا تھا۔

جج نے اسے شاملِ تفتیش کرنے کا حکم تو جاری نہیں کیا لیکن اسے پابند گواہ قرار دیتے ہوئے اگلی پیشی پر حاضر ہونے کا حکم دیا اور سماعت ملتوی کر دی۔

لیکن وہ اگلی پیشی پر عدالت میں حاضر نہیں ہوا۔ جج نے اس کے قابلِ ضمانت وارنٹ جاری کر دیے۔

اس پیشی پر شمشاد بیگم گواہی کے لیے پیش ہوئی۔

اس نے گواہی دیتے ہوئے کہا کہ تین تاریخ کو تقریباً رات کے دس بجے مقتول جبّار خان اس سے ملنے کے لیے آیا۔ اس وقت ملزم علی اختر بھی اس کے گھر میں موجود تھا۔ چونکہ ملزم اور جبار خان کی آپس میں نہیں بنتی تھی، اس لیے وہ جبّار خان کو پچھلی طرف سے خواب گاہ میں لے گئی۔ اس نے جبّار خان کو وہاں بٹھایا اور کمرے میں پڑے ہوئے گندے برتن اٹھا کر باورچی خانے کی طرف چل دی۔ ابھی وہ چند قدم ہی چلی تھی کہ پیچھے سے گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی۔ وہ گھبرا گئی اور پچھلے دروازے سے ڈرائنگ روم میں پہنچی۔ وہاں اس نے ڈاکٹر علی اختر کو عجلت میں کمرے سے نکلتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور وہ اپنی کار کی طرف جا رہا تھا۔ شمشاد بیگم نے مزید کہا کہ ڈاکٹر علی اختر نے اس کے سوالات کے جواب میں اسے ڈانٹ دیا اور اپنی کار میں بیٹھ کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔ لہٰذا اس نے اپنی بیٹی کو ساتھ لیا اور ایک قریبی بنگلے میں جا کر پولیس کو فون پر واردات کی اطلاع دی۔

اس کے بیان سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے دل میں اپنے محسن کے لیے ذرا بھی ہمدردی نہیں تھی۔ وہ کھل کر اس کی مخالفت پر اتر آئی تھی۔ اس کا بیان ختم ہوا تو میں نے جج کی اجازت سے اس پر جرح شروع کی۔

"بیگم صاحبہ!" میں نے کہا "کیا یہ صحیح ہے کہ آپ نے مقتول جبّار خان کے خلاف پولیس میں رپورٹ درج کرائی تھی؟"

"یہ بہت پرانی بات ہے۔" اس نے جواب دیا "میرا خیال ہے کہ جبّار خان اتنا بُرا لڑکا نہیں تھا۔"

"میں نے آپ سے مقتول کے کردار کے بارے میں سوال نہیں کیا۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ نے اس کے خلاف پولیس میں رپورٹ درج کرائی تھی یا نہیں؟ یہ بہت سیدھا سوال ہے آپ اس کا ہاں یا نہ میں جواب دیں۔"

"ہاں، میں نے اس کے خلاف رپورٹ درج کرائی تھی لیکن..."

میں نے فوراً اس کی بات کاٹی "کیا آپ اس عدالت کو بتائیں گی کہ وہ رپورٹ کس ضمن میں تھی؟"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔ اس بات کے ذکر کی یہاں کیا ضرورت ہے؟"

"آپ جرح نہیں کریں۔" جج نے کہا "جو سوال آپ سے کیا گیا ہے اس کا جواب دیں۔"

"دراصل مجھے یہ اطلاع ملی تھی کہ جبّار خان میری بیٹی صبا کو اسکول آتے جاتے چھیڑتا ہے۔"

"یہ اطلاع آپ کو کس نے دی تھی؟"

"اطلاع تو صبا نے ہی دی تھی لیکن..."

میں نے اس کی بات کاٹی اور پوچھا "کیا یہ صحیح ہے کہ ملزم ڈاکٹر علی اختر نے آپ کی بیٹی کو اپنی کار میں لفٹ دی تھی اور آپ نے اسے یعنی ملزم کو اخلاقاً چائے پلائی تھی؟"

"یہی میری غلطی تھی۔" اس نے جواب دیا "مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"خاتون! عدالت کو اس بات سے کوئی واسطہ نہیں کہ آپ کو کیا کرنا چاہیے تھا اور کیا نہیں کرنا چاہیے تھا۔" جج نے کہا "آپ ہاں یا نہ میں جواب دیں۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ یہ فضول سوالات کیوں کر رہے ہیں؟" اس نے کہا "ہاں، یہ ٹھیک ہے۔ ملزم نے صبا کو لفٹ دی تھی اور میں نے اسے چائے پلائی تھی۔"

"مجھے بتایا گیا ہے کہ یہ آپ کی ملزم سے پہلی ملاقات تھی۔ کیا یہ صحیح ہے؟"

"ہاں، صحیح ہے۔"

"بیگم صاحبہ! کیا یہ بھی صحیح ہے کہ ملزم نے یہ دیکھ کر آپ کی بیٹی کو لفٹ دی تھی کہ جبّار خان اسے چھیڑ رہا تھا؟"

"مجھے نہیں پتا۔" اس نے چڑ کر کہا "میں اس وقت گھر پر تھی۔"

میں نے ہولے سے کہا "کوئی بات نہیں، اس بات کا جواب آپ کی بیٹی کو معلوم ہو گا۔" پھر بلند آواز سے پوچھا۔ "کیا یہ سچ ہے کہ اس روز کے بعد ملزم روزانہ آپ کی بیٹی کو اسکول چھوڑنے جاتا تھا اور گھر لے کر بھی آتا تھا؟" اس نے جواب دینے میں تامّل کیا تو میں نے مزید کہا "ویسے یہ کوئی چھپی ہوئی بات نہیں ہے۔ اسکول کی ڈیڑھ دو درجن طالبات، کم از کم نصف درجن ٹیچرز اور ایک آدھ درجن پڑوسی اس بات کی تصدیق کر سکتے ہیں۔"

"آپ تو خوا مخواہ بات لمبی کر رہے ہیں۔ میں نے

کب اس بات سے انکار کیا ہے۔"

"محترمہ! ملزم نے آپ کو یہ بات ضرور بتائی ہوگی کہ اس نے جبّار خان کو آپ کی بیٹی کا پیچھا کرنے سے منع کیا تھا۔"

"صرف منع نہیں کیا تھا۔" شمشاد بیگم نے جواب دیا۔ "اسے دھمکی دی تھی۔ حالانکہ وہ ..."

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا "محترمہ! کیا آپ اس عدالت کو بتائیں گی کہ آپ نے ایک ایسے شخص کو گھر بلا کر اپنی خواب گاہ میں کیوں بٹھایا جو آپ کی بیٹی کو آتے جاتے چھیڑتا تھا؟"

"بُرا آدمی توبہ بھی کرسکتا ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "میں اُسے سمجھانا چاہتی تھی۔"

"اس بات کا خیال آپ کو پولیس میں رپورٹ درج کرانے سے پہلے کیوں نہ آیا؟"

وکیلِ استغاثہ نے اس سوال پر اعتراض کیا اور جج نے اعتراض درست تسلیم کیا۔

میں نے سوالات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "بیگم صاحبہ! آپ نے بتایا ہے کہ جبّار خان کو خواب گاہ میں بٹھانے کے بعد آپ نے دیکھا کہ کمرے میں کچھ گندے برتن پڑے ہوئے ہیں۔ آپ نے ان برتنوں کو اٹھایا اور باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔ کیا آپ بتائیں گی کہ برتنوں کی نوعیت کیا تھی؟"

"وہ چائے کے دو کپ تھے۔"

"آپ نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ کمرے سے نکلنے کے بعد ابھی آپ چند قدم ہی چلی تھیں کہ آپ کے کانوں میں گولیاں چلنے کی آواز آئی۔ آپ نے کپ فرش پر رکھ دیے اور پچھلے دروازے سے نکل کر خواب گاہ کی طرف بھاگیں۔ کیا یہ صحیح ہے؟"

اس نے اُلجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ کوئی بات اسے کھٹکی تھی، مگر وہ اسے سمجھ نہیں پائی تھی، بولی "ہاں، ایسا ہی ہوا تھا۔ جب میں برآمدے میں پہنچی تو میں نے ڈاکٹر علی اختر کو ڈرائنگ روم سے نکل کر اپنی کار کی طرف جاتے دیکھا۔ میں نے اس سے فائرنگ کے بارے میں پوچھا، مگر اس نے مجھے ڈانٹ دیا، ایک طرف جھٹک دیا اور اپنی کار میں بیٹھ کر وہاں سے نکل گیا۔"

میں نے اس کی مدد کرتے ہوئے کہا۔ "اس کے بعد آپ نے اپنی بیٹی کو آواز دے کر بلایا اور پولیس کو فون کرنے کے لیے بنگلے سے نکل گئیں۔ کیا یہ صحیح ہے؟"

"ہاں، ہم نے یہی کیا تھا۔"

"بیگم صاحبہ! پولیس کے روزنامچے کے مطابق آپ نے فون پر یہ رپورٹ درج کرائی تھی کہ آپ کے بنگلے میں ایک آدمی قتل ہوگیا ہے۔"

"ہاں، میں نے یہی رپورٹ درج کرائی تھی۔"

میں نے قدرے اونچی آواز میں پوچھا۔ "بیگم صاحبہ! آپ کو یہ کیسے پتا چلا تھا کہ آپ کے بنگلے میں ایک آدمی قتل ہوگیا ہے؟"

"مم... میں آپ کے سوال کا مطلب نہیں سمجھی؟"

"محترمہ! آپ نے اپنے بیان میں کہیں یہ نہیں کہا کہ فائرنگ کی آواز سننے کے بعد آپ نے خواب گاہ میں جاکر دیکھا تھا۔ نیز یہ بات قرینِ قیاس بھی معلوم نہیں ہوتی۔ فائرنگ کی آواز سن کر ایک اچھا خاصا آدمی بھی فائرنگ والی جگہ سے دور بھاگنے کی کوشش کرتا ہے۔ لہٰذا آپ اس بات کی وضاحت کریں کہ آپ کو کیسے پتا چلا کہ جبّار خان قتل ہوگیا ہے؟"

اس کے چہرے پر گھبراہٹ دکھائی دینے لگی، بولی "مجھے پہلے ہی اس بات کا اندیشہ تھا۔"

"یعنی آپ کو معلوم تھا کہ جبّار خان کو قتل کردیا جائے گا؟"

وکیلِ استغاثہ نے جلدی سے اٹھ کر کہا۔ "جنابِ عالی! مجھے اعتراض ہے۔"

لیکن جج نے اس کا اعتراض مسترد کردیا۔

شمشاد بیگم نے گھبراہٹ میں کہا۔ "یہی سمجھ لیں۔"

"محترمہ! آپ نے کہا ہے کہ آپ کے دونوں ہاتھوں میں ایک ایک کپ تھا اور آپ نے فائرنگ کی آواز سن کر دونوں کپ فرش پر رکھ دیے تھے۔ حالانکہ فائرنگ کی آواز سن کر کپ گر جانے چاہئیں تھے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ کپ آپ کے ہاتھوں سے نہیں گرے۔ پولیس کی رپورٹ میں بھی ٹوٹے ہوئے کپوں کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ کیا آپ اس بات کی کچھ وضاحت کریں گی؟"

"وہ .... وہ میں نے پہلے ہی باورچی خانے میں رکھ دیے تھے۔"

"محترمہ! اگر کسی گھر میں کوئی شخص اچانک قتل ہوجائے تو گھر کے مرد عموماً اور عورتیں خصوصاً چیخنا شروع کردیتی ہیں، لیکن اس مقدمے کے کسی گواہ نے کسی کے چیخنے کا ذکر نہیں کیا۔ مفرور گواہ بختیار احمد نے بھی نہیں، جو ملزم پر قتل کا الزام ثابت کرنے کے لیے زیادہ بے چین نظر آتا تھا۔ کیا آپ اس کی وضاحت کریں گی؟"

"مم... مجھے گھبراہٹ میں کچھ... کچھ ہوش نہیں رہا تھا۔"

"جی ہاں، میرا بھی یہی خیال ہے۔" میں نے پُرخیال لہجے میں کہا۔ "گھبراہٹ میں آپ کو چیخنے کا خیال نہیں رہا ہوگا۔" پھر میں نے جج سے مخاطب ہوکر کہا۔ "جنابِ عالی! میں آپ کی اجازت سے ملزم سے ایک ضمنی سوال کرنا چاہتا ہوں۔"

جج نے اجازت دے دی۔

میں نے ملزم سے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! کیا آپ اس عدالت کو بتائیں گے کہ گولیاں چلنے کی آواز سن کر آپ برآمدے میں کیوں نکلے تھے؟ کیا آپ ڈر کی وجہ سے باہر نکلے تھے یا کوئی اور وجہ تھی؟"

"اس کے دو سبب تھے۔" ڈاکٹر علی اختر نے جواب دیا۔ "گولیاں چلنے کی آواز سن کر میں نے فوری ردِّعمل کے طور پر اندرونی دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ میرے ذہن میں سب سے پہلے یہ خیال آیا تھا کہ جبّار خان نے شمشاد بیگم اور ثروت صبا کو خوفزدہ کرنے کے لیے ہوائی فائرنگ کی ہے مگر وہ دروازہ دوسری طرف سے بند تھا، لیکن فائرنگ کے بعد جب کسی کے چیخنے کی آواز نہیں آئی تو میں یہ سمجھا کہ جبّار خان نے دونوں عورتوں کو قتل کردیا ہے اور پچھلی طرف سے فرار ہوگیا ہوگا۔ لہٰذا میں سامنے کے دروازے کی طرف بھاگا۔ جب میں برآمدے میں پہنچا تو دوسری طرف سے شمشاد بیگم دوڑتی ہوئی آئی اور اس نے مجھے بتایا کہ کسی نے جبّار خان کو قتل کردیا ہے اور فرار ہوگیا ہے۔ ساتھ ہی مجھے نکل جانے کا مشورہ دیا۔ مجھے اس کی بات پر یقین نہیں آیا۔ میں وہاں رُک کر صورتِ حال کا جائزہ لینا چاہتا تھا لیکن اس عورت نے مجھے بصد اصرار وہاں سے نکال دیا۔"

وکیلِ استغاثہ نے فوراً اعتراض کیا اور کہا۔ "جنابِ عالی! مجھے سخت اعتراض ہے۔ ملزم گواہ پر جھوٹا الزام عائد کر رہا ہے، اسے خاموش رہنے کی ہدایت کی جائے۔"

"جنابِ عالی! یہ ایک ضمنی سوال تھا۔" میں نے وضاحت کی۔ پھر میں نے شمشاد بیگم سے پوچھا۔ "محترمہ! مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ نے اپنے مکان کی قسطیں ادا کرنے کے لیے ملزم سے کچھ رقم بطور قرض لی تھی۔ کیا آپ اس عدالت کو اس قرض کی تفصیل بتانا پسند کریں گی؟"

"یہ... یہ ایک ذاتی معاملہ ہے۔ آپ... آپ اپنے دائرے میں رہیں۔"

میں نے اپنے سوال پر زور نہیں دیا اور پوچھا۔ "محترمہ! کیا یہ صحیح ہے کہ ملزم نے آپ سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا تھا؟"

"جنابِ عالی! مجھے اعتراض ہے۔" وکیلِ استغاثہ نے کہا۔ "وکیلِ صفائی حد سے تجاوز کر رہے ہیں۔"

میں نے جج کے استفسار پر جواب دیا۔ "جنابِ عالی! بات یہ ہے کہ ابھی تک قتل کا کوئی واضح محرّک ہمارے سامنے نہیں آیا۔ ملزم علی اختر اور مقتول جبار خان آپس میں اجنبی تھے۔ ان کا باہمی تعلق خواہ وہ اچھا تھا یا بُرا، شمشاد بیگم اور اس کی بیٹی صبا کی وجہ سے تھا۔ ملزم نے شمشاد بیگم کی بیٹی کو یتیم سمجھ کر مدد کی تھی جس کی وجہ سے جبّار خان اس کا دشمن بن گیا تھا۔ اب دیکھنے والی بات یہ ہے کہ ملزم ان دو عورتوں کی حمایت میں کس حد تک جاسکتا تھا اور کیوں؟"

جج نے اعتراض مسترد کردیا اور شمشاد بیگم کو جواب دینے کا حکم دیا۔

"ملزم نے مجھ سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔" شمشاد بیگم نے جواب دیا۔ "لیکن میں نے انکار کردیا تھا۔"

"جنابِ عالی! اس انکار کی وجہ سے ملزم کی شمشاد بیگم میں اور اس کے معاملات میں دلچسپی کم ہوجانا چاہیے تھی۔ لہٰذا اس کے پاس جبّار خان کو قتل کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ شمشاد بیگم اس نوجوان پر اتنی مہربان ہوگئی تھی کہ اسے اپنی خواب گاہ میں لے گئی تھی۔"

"جنابِ عالی! مجھے اعتراض ہے۔" وکیلِ استغاثہ نے اچھل کر کہا۔ "وکیلِ صفائی معزز گواہ کے کردار کو داغدار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"جنابِ عالی! درحقیقت وکیلِ استغاثہ خود گواہ کے کردار کو داغدار کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ وہ عدالت کو میرے الفاظ کے وہ معنی سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں جو میرے ذہن میں ہرگز نہیں ہیں۔ یہ بات خود گواہ نے کہی ہے کہ وہ مقتول کو اپنی خواب گاہ میں لے گئی تھی۔ میں نے فقط اس کے بیان کا حوالہ دیا ہے، اگر وکیلِ استغاثہ اس بات پر اعتراض نہ کرتے تو کوئی قابلِ اعتراض مفہوم کسی کے ذہن میں نہ آتا۔"

جج نے اعتراض مسترد کردیا۔

میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "جنابِ عالی! اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ملزم کو اس بات کا ہرگز علم نہیں تھا کہ جبار خان کو اس کے پستول سے قتل کیا گیا تھا۔ اگر اُسے یہ بات معلوم ہوتی تو وہ اپنے پستول کو کبھی کار کے خانے میں نہ پڑا رہنے دیتا۔ پولیس واردات کے ایک گھنٹے بعد اس کے گھر پہنچی تھی۔ اس عرصے میں وہ پستول کو بآسانی چھپا سکتا تھا۔ اس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ اس کا پستول اس

کی لاعلمی میں استعمال کیا گیا تھا۔اس نظریے کو کئی باتوں سے تقویت ملتی ہے۔سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ جبّار خان کو ایسے وقت گھر میں بلایا گیا جس وقت ملزم وہاں موجود تھا اور شمشاد بیگم یہ جانتی تھی کہ ملزم جبّار خان کی آمد کو پسند نہیں کرے گا۔"

وکیلِ استغاثہ نے اُٹھ کر عدالت سے سوال کیا۔"جنابِ عالی! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وکیلِ صفائی قبل از وقت دلائل کیوں دے رہے ہیں؟"

میں نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔"جنابِ عالی! میں عدالت کے علم میں یہ بات لانا چاہتا ہوں کہ واقعات اور شواہد کی روشنی میں شمشاد بیگم اور اس کی بیٹی ثروت صبا کو شاملِ تفتیش کیا جانا چاہیے تھا۔پولیس نے شمشاد بیگم کو ایک رات حوالات میں بھی رکھا تھا، لیکن بعد میں نامعلوم وجوہ کی بنا پر چھوڑ دیا اور محض گواہ بنانے پر اکتفا کیا۔میں یہ دلائل اس لیے دے رہا ہوں کہ ان دونوں خواتین کو اور ان کے ساتھی بختیار احمد کو شاملِ تفتیش کرنے کا حکم جاری کیا جائے۔"

یہ سن کر عدالت نے مجھے مزید دلائل دینے کی اجازت دے دی۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔"جنابِ عالی! اس ضمن میں مزید قابلِ غور باتیں یہ ہیں کہ شمشاد بیگم نے جبّار خان کو خواب گاہ میں بٹھایا اور مبیّنہ طور پر چائے کے خالی کپ رکھنے باورچی خانے کی طرف چلی گئی، لیکن نہ تو وہ کپ گرے اور نہ ٹوٹے۔ پھر گھر کے اندر اتنا بڑا سانحہ رونما ہوگیا اور شمشاد بیگم نے چیخنے یا شور مچانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔تیسری بات یہ بھی قابلِ غور ہے کہ ڈرائنگ روم کا اندرونی دروازہ اندر کی طرف سے بند تھا۔ چوتھی بات یہ سوچنے کے لائق ہے کہ باہر کی بتّیاں کیوں بند کی گئی تھیں۔ پانچویں بات یہ کہ شمشاد بیگم برآمدے میں ملزم سے ٹکرا گئی تھی اور اسے وہاں سے چلے جانے کا مشورہ کیوں دیا تھا؟ چھٹی بات یہ کہ شمشاد بیگم کو کمرے میں دیکھے بغیر کیسے یہ بات معلوم ہوگئی کہ جبّار خان کو قتل کر دیا گیا ہے۔ ساتویں بات یہ کہ گواہ بختیار کو کیسے یہ پتا چل گیا کہ اندر ایک آدمی قتل ہو گیا ہے؟ آٹھویں بات یہ کہ بختیار کو اس بات کا کیسے پتا چلا کہ ثروت صبا کے کمرے میں ٹیپ ریکارڈر بج رہا ہے؟ جنابِ عالی! اس کے علاوہ بھی بہت سی باتیں قابلِ توجہ ہیں لیکن میں سرِدست ان کا ذکر مناسب نہیں سمجھتا۔تاہم واقعات اور شواہد کی روشنی میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ میرے مؤکل ڈاکٹر علی اختر کو درحقیقت قربانی کا بکرا بنایا گیا ہے۔جبّار خان کا قتل درحقیقت ..." میں نے شمشاد بیگم کی طرف دیکھا جس کا رنگ پیلا پڑ چکا تھا اور آنکھیں خوف کے باعث باہر نکلی جا رہی تھیں۔"قتل درحقیقت کسی اور نے کیا ہے۔ لٰہذا میں عدالت سے استدعا کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا تین افراد یعنی شمشاد بیگم، ثروت صبا اور بختیار احمد کو شاملِ تفتیش کرنے اور گرفتار کرنے کا حکم دیا جائے۔"

ثروت صبا نے جو عدالت میں موجود تھی، اچانک چیخنا شروع کر دیا۔

"میں... میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔" اس نے چیخ کر کہا۔"میں بے گناہ ہوں، بے قصور ہوں۔سب کچھ امّی اور بختیار نے کیا تھا۔ڈاکٹر صاحب بھی بے قصور ہیں۔بختیار نے ان کی گاڑی سے پستول چوری کیا تھا۔ میں... میں یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکتی... میرا... میرا دماغ پھٹ جائے گا۔سارا قصور امّی کا ہے۔انھوں نے بختیار کو پیسے دیے تھے.... اب وہ شخص ہمیں بلیک میل کر رہا ہے۔اس نے ہماری زندگی عذاب بنا رکھی ہے..."

ثروت صبا نے بہت کچھ کہا تھا لیکن میں نے اس کی باتوں کا خلاصہ لکھ دیا ہے۔شمشاد بیگم نے کٹہرے میں بیٹھ کر رونا شروع کر دیا تھا۔

صورتِ حال کی اس ڈرامائی تبدیلی پر جج نے شمشاد بیگم اور بختیار احمد کے ناقابلِ ضمانت وارنٹ جاری کر دیے اور ڈاکٹر علی اختر کی ضمانت منظور کر لی۔

شمشاد بیگم نے پولیس کو اپنے اقبالی بیان میں بتایا کہ جبّار خان کو بختیار احمد نے قتل کیا تھا۔وہ خوابگاہ کے باہر چھپا ہوا تھا۔جیسے ہی شمشاد بیگم جبّار کو کمرے میں بٹھا کر باہر نکلی، وہ اندر گیا اور جبّار خان پر تین فائر کیے۔اس سے قبل شمشاد بیگم نے ڈاکٹر علی اختر کی گاڑی سے پستول نکال کر اس کے حوالے کر دیا تھا۔ اس نے موقع پا کر ڈاکٹر کی چابیاں اٹھالی تھیں اور پستول نکال کر چابیاں واپس میز پر رکھ دی تھیں۔اس نے برآمدے میں ڈاکٹر کو اسی لیے روک لیا تھا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بختیار احمد پستول واپس کار کے خانے میں رکھ دے اور دروازہ بند کر کے پچھلے دروازے سے باہر نکل جائے۔

دو یا تین روز کے بعد پولیس نے بختیار احمد کو بھی گرفتار کر لیا۔ وہ اناڑی مجرم تھا۔اس لیے اس نے پولیس کے تشدّد سے گھبرا کر اقبالِ جرم کر لیا۔عدالت نے ثروت صبا کے بارے میں نرم روّیہ اختیار کیا اور اسے شاملِ تفتیش نہیں کیا۔

مقدمے کا ابھی فیصلہ نہیں ہوا۔تاہم میرا اندازہ ہے کہ بختیار احمد کو سزائے موت اور شمشاد بیگم کو عمر قید ہو جائے گی۔

محدود راشن

ابوالمنصور

طوفان کی زد میں آکر تباہ ہو جانے والے ایک جہاز کے تین مسافروں کی عبرت اثر کہانی۔ وہ تین افراد تھے اور ان کے پاس بہت محدود راشن تھا جو اُن کے درمیان وجہُ فساد بن گیا تھا۔

ان کے لیے تو زیادہ جو دوسروں کی پروا کیے بغیر اپنے لیے آسائشیں حاصل کرنا چاہتے ہیں

پستہ قد

پائلٹ ڈینیل جب ہوش میں آیا تو سورج کی حدّت کسی ہتھوڑے کی مانند اُس کے سر سے ٹکرائی۔اُس نے سورج کی جھلسا دینے والی شعاعوں سے بچنے کے لیے اپنا داہنا ہاتھ چہرے کے سامنے کرنے کی کوشش کی تو بازو کے اگلے حصّے میں شدید درد اُٹھا اور وہ دوبارہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔

"ہمّت سے کام لو مَین!" ڈینیل نے اپنے ساتھی کرافٹ کی آواز سنی۔ سیاہ فام کرافٹ، جو بحری علوم کا طالب علم تھا، کسی ریسلنگ چیمپین کی طرح لحیم شحیم تھا۔"اِدھر اُدھر حرکت نہیں کرو۔" اُس نے مزید کہا۔"ورنہ نقصان بھی ہو سکتا ہے۔"

پائلٹ ڈینیل نے ٹھنڈے نمکین پانی کو مُنہ میں بھرا اور فوراً اُگلی کر دی۔اُس نے محسوس کیا کہ جس سطح پر وہ لیٹا ہوا تھا وہ جھول رہی تھی۔اُس کے سر اور بائیں بازو میں درد ہو رہا تھا۔وہ بائیں کہنی پر دھیرے دھیرے اوپر اُٹھا اور یہ دیکھ کر خوش ہوا کہ کم از کم اُس کے تباہ شدہ جہاز کا ایک مسافر زندہ تھا لیکن دوسرا مسافر کہاں تھا؟

"ریڈمین!" اُس نے بڑی مشکل سے کہا۔"ریڈمین کہاں ہے؟"

"میں یہاں ہوں۔" پائلٹ نے مائننگ انجینئر ریڈمین کی آواز سُنی۔اُس کا لہجہ شکایتی تھا۔"پورٹ لینڈ سے بروم تک کا سفر بچوّں کا کھیل ہے۔ تم نے یہی کہا تھا۔مجھے اچھی طرح یاد ہے۔کاش میں عقل مندی کرتا اور تمھارے کھٹارا ہوائی جہاز میں سفر کرنے کی غلطی نہ کرتا۔"

"ریڈمین! اس وقت یہ بات مناسب نہیں ہے۔" کرافٹ نے کہا۔"آسٹریلیا کے اس حصّے میں طوفان بہت تیزی سے آتے ہیں۔ اگر ڈینیل کو اس بات کا اندازہ ہوتا تو وہ سفر کو ملتوی کر دیتا۔"

پورٹ لینڈ، آسٹریلیا کے مغربی ساحل پر واقع ہے۔ وہاں سے بروم کا فاصلہ تین سو میل سے کم ہے اور راستے میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ڈینیل، جو اپنا چارٹر طیارہ چلاتا تھا، اس روٹ پر درجنوں مرتبہ سفر کر چکا تھا، لیکن اس دفعہ اُس نے وقت اور فیول بچانے کے لیے ساحلی روٹ کے بجائے جو طویل مگر محفوظ ہے، سمندری روٹ اختیار کیا تھا اور یہ روٹ خطرناک ثابت ہوا۔ ابھی انھوں نے نصف راستہ بھی طے نہیں کیا تھا کہ اُن کا دو انجنوں والا طیارہ طوفان کی زد میں آگیا۔ جب تباہی یقینی ہوگئی تو پائلٹ نے ربر کی ہوا والی کشتی اور ضروری راشن لے کر اپنے مسافروں سمیت سمندر میں چھلانگ لگادی۔

"باہر نکلتے وقت تمھارا سر انسٹرومنٹ پینل سے ٹکرا گیا تھا۔" کرافٹ نے ڈینیل کو بتایا "اور بازو شیشے کے ٹکڑے سے زخمی ہوگیا تھا۔ خوش قسمتی سے میں نے فرسٹ ایڈ کٹ بھی ساتھ رکھ لی تھی اور میں نے تمھارے بازو پر مضبوط پٹی باندھ دی ہے۔"

"اور راشن؟" ڈینیل نے پوچھا "کیا ہمارا راشن محفوظ ہے؟"

"ہاں، راشن محفوظ ہے۔ طیارے کے ڈوبنے سے قبل میں نے اُس میں سے راشن کی ایک پیٹی نکال کر کشتی میں رکھ لی تھی۔"

ڈینیل کے ہونٹوں پر کمزور مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ پیٹی کے اندر ڈبوں میں بند کھانا، سبزیاں اور پھل موجود تھے جو چند روز کے لیے کافی تھے۔ گویا وہ زیادہ خطرناک پوزیشن میں نہیں تھے۔ پھلوں اور سبزیوں کے ڈبوں میں موجود جوس اُن کے پینے کے کام آسکتا تھا۔ صرف ڈر یہ تھا کہ اُن کی ہوا بھری کشتی میں کوئی سوراخ نہ ہو جائے۔ وہ چھ فٹ چوڑی اور چودہ فٹ لمبی تھی۔ اُس کے گرد نائلون کا مضبوط رسا لگا ہوا تھا۔ اُس کا فرش زیادہ مضبوط نہیں تھا۔ کینوس کے نیچے ربر کی ایک تہ تھی جس کے اوپر پانی کی ہر حرکت محسوس ہوتی تھی۔

کشتی کے ایک سرے پر چھوٹا سا ٹینک منسلک تھا۔ اس ٹینک میں ہوا بھری ہوئی تھی جو اب کشتی میں منتقل ہو چکی تھی اور یہ ہوا ہی تھی جو انھیں سطحِ آب پر اٹھائے ہوئے تھی۔ ذرا سی بے پروائی انھیں تباہ کر سکتی تھی۔ کشتی کے کسی حصے میں کوئی خراش، چاقو یا پن کا گھاؤ یا پنکچر انھیں بحرِ ہند کی تہ میں پہنچا سکتا تھا۔

سورج مغرب کی طرف رواں دواں تھا اور اب اُس کی شعاعیں ترچھی پڑ رہی تھیں۔

کرافٹ نے پُرامید لہجے میں کہا "کل ہم سورج کو سمت کے تعین کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ اگر ہم مشرق کی طرف سفر کرتے رہیں تو بالآخر آسٹریلیا کے ساحل پر پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

"بشرطیکہ ہوا بھی موافق ہو۔" ریڈمین نے کہا "میرا اندازہ ہے کہ اس وقت ہم انڈونیشیا کے آس پاس ہیں۔"

"میں تمھارے اندازے سے متفق نہیں ہوں۔" کرافٹ نے کہا "طوفان جلدی ختم ہو گیا تھا اور ہوا کا رُخ تقریباً مغرب کی طرف تھا۔ میرا خیال ہے کہ طوفان نے ہمیں سمندر کی طرف دھکیل دیا ہوگا۔ بہر حال، ہم طلوعِ آفتاب کے ساتھ ہی چپّو چلانا شروع کر دیں گے۔"

"کھانے کا کیا پروگرام ہے؟" ریڈمین نے پوچھا "ڈنر کا وقت کب ہوگا؟"

"ہمیں کھانے کے معاملے میں بڑی احتیاط سے کام لینا ہوگا۔" کرافٹ نے کہا "ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ہمیں کتنے دن سمندر میں بھٹکنا پڑے گا۔ آج رات ہم بغیر کھانے کے گزارا کریں گے۔"

"مجھے سخت بھوک لگی ہے۔" ریڈمین نے سیاہ فام دیو کو گھورا "اور دوسری بات یہ ہے کہ تمھیں راشن کا انچارج کس نے بنایا ہے؟"

راشن کی پیٹی کرافٹ کے پیچھے رکھی تھی۔ اُس نے کہا "اگر تم چاہو تو مجھے راشن کا انچارج سمجھ سکتے ہو، اور اگر تم اپنی بھوک کو زیادہ اہمیت دینا چاہتے ہو تو راشن حاصل کرنے کی کوشش کر سکتے ہو۔" اُس کے لہجے میں چیلنج پایا جاتا تھا "پیٹی میرے پیچھے رکھی ہے۔"

ریڈمین بڑبڑا کر رہ گیا۔ اُس نے قوی الجثہ کرافٹ کی طرف بڑھنے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ پائلٹ ڈینیل مسکرا دیا۔ وہ کرافٹ پر اعتماد کرتا تھا اور اُسے اُمید تھی کہ اُس کی نگرانی میں کھانا محفوظ رہے گا۔ اس کے برعکس ریڈمین کو وہ قابلِ اعتماد نہیں سمجھتا تھا۔

اگلے روز صبح ہونے سے تین گھنٹے قبل انھوں نے کشتی کے گرد شارک مچھلیوں کو منڈلاتے دیکھا۔

اُس وقت ہوا ساکن اور سمندر پُرسکون تھا۔ سپیدۂ سحر نمودار ہوتے ہی کرافٹ کو شارک کا اوپری پَر سطحِ آب کو کاٹتا دکھائی دیا۔ اُس کا رنگ بھورا اور سلیٹی تھا۔ وہ کسی شیطانی خنجر کی طرح پانی کو کاٹ رہا تھا اور کشتی سے تقریباً بیس گز کے فاصلے پر تھا۔ چند لمحوں کے بعد ایک اور پر پانی کو کاٹتا دکھائی دیا۔ پھر ایک تیسرا پر بھی چھپاکے سے اوپر اُبھر آیا۔

کرافٹ اُونگھتے ہوئے ریڈمین کو ہلاتے ہوئے بولا۔

"وہ دیکھو۔ کچھ ملنے والے آئے ہیں۔"

ریڈمین نے اشارے کی سمت دیکھا تو اُس کا چہرہ خوف سے سفید پڑ گیا "شارک مچھلیاں!" اُس نے کہا "اوہ۔ میرے خدا، یہ . . . یہ ہماری کشتی تو اتنی مضبوط نہیں ہے۔ مم . . . میرا مطلب ہے اب کیا ہوگا؟"

"جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔" کرافٹ نے کہا "ویسے مجھے اُمید ہے کہ یہ مچھلیاں کشتی پر حملہ نہیں کریں گی۔ کشتی کا پیندا عام سا ہے۔ اُس میں ان مچھلیوں کے لیے کوئی کشش نہیں ہے۔"

"لیکن یہ آدم خور مچھلیاں ہیں۔" ریڈمین نے کہا "ان کا کیا اعتبار، یہ کسی وقت بھی حملہ کر سکتی ہیں۔ لل . . . لیکن میرا خیال ہے کہ انھوں نے ہمیں دیکھا نہیں، یہ . . . یہ واپس چلی جائیں گی۔"

"ہونہہ . . . دیکھا نہیں۔" کرافٹ نے کہا "یہ ہمیں اچھی طرح دیکھ چکی ہیں۔ انھیں یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ ہم خطرے میں گھرے ہوئے ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو یہ ہماری کشتی کے گرد چکر نہ لگاتیں۔"

تینوں مچھلیاں مناسب فاصلہ چھوڑ کر کشتی کے گرد چکر لگا رہی تھیں۔

"شش . . . شاید یہی بات ہے۔" ریڈمین کی آواز میں خوف کی جھلک پائی جاتی تھی "شاید انھیں بھی گدھوں کی طرح یہ پتا چل جاتا ہے کہ اُن کا شکار عنقریب مرنے والا ہے۔ لیکن . . . لیکن ہم تو اچھے خاصے ہیں . . . "

"ہمیں فوری طور پر کوئی خطرہ نہیں ہے۔" کرافٹ نے کہا "لیکن پھر بھی ہمیں بہت محتاط رہنا چاہیے۔ پانی میں ہاتھ پیر ڈالنے یا کوئی چیز پھینکنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اگر ان مچھلیوں کو کوئی کھانے والی چیز کشتی کے آس پاس نظر آگئی تو پھر یہ ہمارا پیچھا نہیں چھوڑیں گی۔ اور میرا خیال ہے کہ ڈینیل کو بھی جگا دینا چاہیے۔"

ریڈمین نے جھنجوڑ کر پائلٹ کو جگا دیا۔ اُس کا بازو سوجا ہوا تھا اور اس پر جا بجا خون جما ہوا تھا۔ بیدار ہوتے ہی وہ درد کے باعث کراہا اور کروٹ بدلی۔ پھر وہ آنکھیں کھول کر ریڈمین کی طرف دیکھنے لگا۔ ریڈمین نے کچھ کہے بغیر کشتی کا طواف کرنے والی شارک مچھلیوں کی طرف اشارہ کیا۔

ڈینیل نے اثبات میں سر ہلایا، بولا "رات کو جب میں نے ان سرخ بلاؤں کو دیکھا تھا تو میں سمجھ گیا تھا کہ یہ ہمارا پیچھا نہیں چھوڑیں گی۔"

"رات کو؟ لیکن کیسے؟"

"جب اس سمندر کے اندر کوئی چیز حرکت میں ہو تو سطح کے پانی میں چمک پیدا ہو جاتی ہے۔" ڈینیل نے کہا "مسٹر کرافٹ کو اس کی وجہ معلوم ہوگی۔ لیکن ایسا ہوتا ہے۔"

ریڈمین کو پائلٹ کی آنکھوں میں جلن کی کیفیت نظر آئی۔ اُس نے اُس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا تو وہ خاصا تپ رہا تھا۔

"ڈینیل! تمھیں تو سخت بخار ہے۔"

"ہاں، تکلیف کی وجہ سے مجھے رات بھر نیند نہیں آئی۔" ڈینیل نے کہا "میں زیادہ وقت پانی میں دیکھتا رہا تھا۔ میں نے تقریباً دس فٹ گہرائی میں مچھلیوں کے غول کے غول پھرتے دیکھے۔ پھر یہ شارک مچھلیاں وہاں پہنچ گئیں اور مچھلیوں پر جھپٹنے لگیں۔ وہ ہر مرتبہ ایک دو مچھلیوں کو نِوالہ بنا لیتی تھیں۔ میں تقریباً ایک گھنٹے تک یہ منظر دیکھتا رہا تھا۔ پھر میری آنکھ لگ گئی۔" اتنی بات کرنے کے بعد وہ نڈھال سا ہو گیا اور آنکھیں بند کر کے بولا "جھپکی . . . پپکی . . . اور ٹپکی۔"

ریڈمین اور کرافٹ نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

کرافٹ نے کہا "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ تمھارے حواس تو جواب نہیں دے گئے؟"

"جھپکی، پپکی اور ٹپکی۔" ڈینیل نے دُہرایا "میرے حواس بالکل ٹھیک ہیں۔ جب میں چھوٹا تھا تو میری ممی مجھے ایک نظم سنایا کرتی تھیں۔ جس میں جھپکی، پپکی اور ٹپکی کا ذکر آتا تھا۔" وہ بہت مدھم آواز میں بول رہا تھا "ہم نے جو ڈور پھینکی . . . جھپکی نے آنکھ جھپکی . . . پپکی، لپک کے آئی . . . ٹپکی، کہاں سے ٹپکی؟"

"شاید یہ ہذیان بک رہا ہے۔" ریڈمین نے کہا "اسے بہت تیز بخار ہو رہا ہے۔ کرافٹ! میرا خیال ہے کہ تم نے اس کی پٹی بہت ٹائٹ باندھی ہے۔ اسے تھوڑا ڈھیلا کر دو۔ یہ سوجن اس پٹی کی وجہ سے معلوم ہوتی ہے۔ خون آگے نہیں جا رہا۔"

کرافٹ نے نفی میں سر ہلایا، بولا "اگر پٹی ڈھیلی کر دی گئی تو خون دوبارہ بہنا شروع ہو جائے گا اور دوبارہ اسے روکنا مشکل ہوگا۔ ہم اس کے کپڑے گیلے رکھنے کی کوشش کریں گے۔ اِس سے اُمید ہے کہ بخار میں کمی واقع ہو جائے گی اور ایک بات کا خیال رہے، پانی میں زیادہ ہلچل نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ شارک مچھلیاں اس طرف متوجہ ہو جائیں گی۔ ہم یہ ہیٹ پانی لینے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔"

ڈینیل پر نیم بے ہوشی طاری تھی۔ ریڈمین نے ہیٹ میں پانی بھرا اور اس کے کپڑے گیلے کرنے لگا۔ اس سے ڈینیل کو کچھ افاقہ ہوا۔ پون گھنٹے کے بعد وہ مدھم آواز میں بھوک کی شکایت کرنے لگا۔

کرافٹ نے راشن کی پیٹی میں سے کھانے کے تین ڈبے نکال لیے اور اُس کے لیبل دیکھتے ہوئے بولا "ٹماٹر، آڑو اور کاک ٹیل چٹنی . . . " اُس نے مسکرا کر پائلٹ کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے ڈینیل! کیا حادثے کے بعد کاک ٹیل پارٹی کا ارادہ تھا؟"

"مجھے تھوڑی سی چٹنی اور کچھ پھل دے دو۔" ڈینیل نے کمزور آواز میں کہا۔ "باقی تم دونوں کھاؤ۔"

ریڈمین نے ندیدوں کی طرح پھل کے ڈبّے کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن کرافٹ نے ڈبّا پیچھے کر لیا۔

"اتنی جلدی مت کرو۔" اُس نے کہا۔ "پھلوں اور سبزیوں کا جُوس ضائع نہیں ہونا چاہیے۔ ہم جو کچھ کھائیں گے وہ مل کر کھائیں گے اور حساب سے کھائیں گے۔" اچانک وہ اُلجھن کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ "لیکن یہ ڈبّا کھلے گا کیسے۔ ڈینیل! تم ڈبّا کھولنے کے لیے بھی کچھ لائے ہو یا نہیں؟"

"اوہ۔۔۔ میرا خیال ہے کہ مجھے ٹن کٹر رکھنا یاد نہیں رہا۔"

ریڈمین نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور سُرخ رنگ کی کوئی چیز نکالی۔ "فوجی چاقو۔" اُس نے وضاحت کی۔ "اِس میں ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔ چاقو، قینچی، ٹن کٹر، اُسترا اور کارک کھولنے والا۔"

"مسئلہ حل ہو گیا۔" ڈینیل نے کہا۔ "انجینئر کی جیب سے ایسی ہی چیز نکلنا چاہیے تھی۔"

کرافٹ نے تینوں ڈبّے ریڈمین کی طرف بڑھا دیے اور کہا۔ "ذرا احتیاط سے۔ ہم ربر کی کشتی میں سوار ہیں۔ ان ڈبّوں میں سے جو کچھ برآمد ہوگا وہ تین برابر حصّوں میں تقسیم ہوگا۔ اور ہاں خالی ڈبّے سنبھال کر رکھنا۔ یہ ہمارے کام آ سکتے ہیں۔ اگر بارش ہوئی تو ہم ان ڈبّوں میں پانی بھر لیں گے۔"

ریڈمین نے تینوں ڈبّے کھول کر کرافٹ کے حوالے کر دیے، جس نے تینوں چیزوں کے تین برابر حصّے کر کے درمیان میں رکھ دیے۔

کھانے کے بعد کرافٹ نے ایلومینیم کے چپّو کُنڈوں میں ڈالے اور کشتی کو طلوع ہوتے ہوئے سورج کی مخالف سمت میں کھینا شروع کر دیا۔ "مچھلیوں کا خیال رکھنا۔" اُس نے ریڈمین سے کہا۔ "اگر اِن میں سے کوئی ایک کشتی کا طواف روک دے تو فوراً مجھے خبردار کر دینا۔ چپّوؤں کا چھپاکا انھیں اپنی طرف متوجہ کر سکتا ہے۔"

طواف کرتی ہوئی مچھلیوں پر نظر رکھنا خاصا مشکل کام تھا۔ ریڈمین کو بار بار سر گھمانا پڑتا تھا۔ کچھ دیر بعد اُس نے کہا۔ "یہ نہایت صابر و شاکر مچھلیاں معلوم ہوتی ہیں۔ ان کا نہ تو آگے بڑھنے کا کوئی ارادہ معلوم ہوتا ہے اور نہ ہی ہمارا پیچھا چھوڑنے کا۔"

"انھیں دیکھ کر مجھے اپنا بچپن یاد آ رہا ہے۔" ڈینیل نے کہا۔ "جھپکی، لپکی اور ٹپکی۔ مجھے ان کی وفاداری پر کوئی شبہ نہیں ہے۔ یہ آخری دم تک ہمارا ساتھ دیں گی۔"

کرافٹ کو ڈینیل کی دماغی حالت پر شبہ سا ہونے لگا تھا، تاہم وہ اس بات کو نظر انداز کر کے بولا۔ "نام تو تم نے رکھ دیے ہیں، مگر ان کی پہچان کیسے ہوگی؟"

"یہ کوئی مشکل مسئلہ نہیں ہے۔" ڈینیل نے کہا۔ "دو پَر ایک سائز کے ہیں، انھیں ہم جھپکی اور لپکی کہہ سکتے ہیں۔ دونوں میں سے ایک پَر اوپر سے تھوڑا سا کٹا ہوا ہے۔ اس پَر والی کا نام جھپکی ہے۔ صحیح پَر والی لپکی ہے۔ تیسرا پَر خاصا بڑا ہے۔ اس پَر والی کا نام ٹپکی ہے اوہ۔۔۔ ذرا سنبھلنا۔ یہ ٹپکی ہماری طرف آ رہی ہے۔"

کرافٹ نے دیکھا کہ بڑے پَر کا رُخ اچانک دائیں چپّو کی طرف ہو گیا تھا۔ اُس نے فی الفور چپّو کو اوپر اُٹھا دیا۔ ٹپکی کشتی کے بالکل قریب سے گزر گئی۔ اگر وہ تھوڑا سا اور قریب آ جاتی تو کشتی سے ٹکرا جاتی۔ کرافٹ اور ریڈمین نے دیکھا کہ وہ ایک بارہ تیرہ فٹ لمبی مچھلی تھی۔ اُس کی آنکھیں سُرخ اور خوف ناک تھیں۔ اُس کے بغلی پَر کسی عظیم الجثّہ پرندے کے پَروں کی مانند تھے۔ اُس کے آگے دوڑتی ہوئی بدحواس مچھلیاں کسی ہراول دستے کی مانند معلوم ہوتی تھیں۔ اس کی خوف ناک دُم کسی جہاز کے پنکھے کی مانند حرکت کر رہی تھی۔ کشتی کے قریب سے گزرنے کے بعد وہ بائیں طرف مُڑی اور طواف کرنے والی مچھلیوں میں جا ملی۔

"اُف۔۔۔" ریڈمین نے آنکھیں پھیلائیں۔ "مَیں نے اپنی پوری زندگی میں اتنی بڑی مچھلی نہیں دیکھی۔"

کرافٹ نے کہا۔ "بڑی بھی اور خوف ناک بھی۔"

"خدا کا شکر ہے کہ اس کے پاس انسان کی طرح عقل نہیں ہے۔"

"یہاں عقل کا کیا ذکر؟"

"اگر اس کے پاس عقل ہوتی تو یہ اتنی دیر انتظار نہ کرتی۔" ریڈمین نے کہا۔ "ہماری یہ معمولی سی کشتی اس کی ذرا سی ٹکر بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ اگر یہ ذرا سا پَر ہی مار دے تو کشتی میں سوراخ ہو جائے۔"

"یہ بات نہیں ہے۔" کرافٹ نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ یہ مچھلیاں ہمیں محفوظ راشن سمجھتی ہیں۔ ان چھوٹی مچھلیوں کی وجہ سے ابھی اُن کا پیٹ بھرا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ انسپکشن کرنے ہمارے قریب آئی تھی۔ شارک مچھلی یا تو بھوکی ہونے کی وجہ سے حملہ کرتی ہے اور یا اشتعال میں آ کر حملہ کرتی ہے۔"

"اشتعال، کیا مطلب؟"

"اشتعال کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً اگر پانی میں بے ہنگم قسم کی چھیڑ چھاڑ کی جائے تو یہ سمجھے گی کہ وہاں کوئی زخمی مچھلی ہے اور فی الفور حملہ کر دے گی۔ اسی لیے مَیں چپّو بہت متوازن طریقے سے چلا رہا ہوں۔ اپنی باری پر تم بھی اس بات کا خیال رکھنا، اور دوسری بات یہ ہے کہ کوئی چیز پانی میں نہیں لٹکنا چاہیے۔ شارک اُسے مچھلی سمجھ کر اُس پر حملہ کر سکتی ہے۔"

ریڈمین کا چہرہ پیلا پڑ گیا، بولا۔ "مَیں ایسا ہی کروں گا۔ کوئی اور بات جاننے کے لائق ہو تو وہ بھی بتا دو۔"

"ایک اہم بات یہ ہے کہ پانی میں خون نہیں گرنا چاہیے۔" کرافٹ نے کہا۔ "یہ مچھلیاں بہت دُور سے خون کی بُو سونگھ لیتی ہیں اور ہاں، اپنے اس فوجی چاقو کو احتیاط سے رکھنا۔"

دفعتاً ڈینیل اُٹھ کر سیدھا بیٹھ گیا اور سمندر کو گھورتے ہوئے بولا۔ "لپکی، جھپکی اور ٹپکی کشتی کی سیر کو نکلیں۔" اس نے سمندر کی طرف سے نظر ہٹالی اور کسی مسحور انسان کی طرح کرافٹ اور ریڈمین کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر وہ دوبارہ کشتی پر لیٹ گیا۔ اتنی سی حرکت نے اُسے بے حال کر دیا تھا۔

"یہ اپنے حواس میں نہیں ہے۔" کرافٹ نے تاسّف سے کہا۔ "اسے کچھ پتا نہیں ہے کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے لیے کیا کیا جائے۔ اس کے بازو کی سوجن بڑھتی جا رہی ہے۔"

ریڈمین نے ڈینیل کی طرف دیکھا اور اسے بے سُدھ پا کر ہولے سے بولا۔ "ایک بات میری سمجھ میں آتی ہے۔ ہمارے پاس کھانے کے صرف چھ ڈبّے ہیں۔"

"مَیں سمجھا نہیں۔" کرافٹ نے کہا۔ "کھانے کے ڈبّوں کا ڈینیل سے کیا تعلق ہے؟"

"ہمیں نہ جانے کتنے دن اس کشتی میں رہنا پڑے۔" ریڈمین بدستور سرگوشی میں بات کر رہا تھا۔ "ہمارے پاس راشن بہت کم ہے اور ان شارک مچھلیوں کی وجہ سے ہم مچھلی کا شکار بھی نہیں کر سکتے۔ بارش کا بھی کوئی امکان نظر نہیں آتا۔"

"ایسی مایوسی کی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ کوسٹ گارڈ کو حادثے کی اطلاع مل چکی ہو گی اور انھوں نے اپنا ہیلی کاپٹر یا جہاز ہماری تلاش میں روانہ کر دیا ہوگا۔ ڈینیل پورٹ لینڈ میں فلائٹ کی اطلاع درج کرانے کے بعد روانہ ہوا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی گزرتا ہوا جہاز یا ماہی گیروں کا ٹرالر بھی اس طرف آ سکتا ہے۔"

"یہ سب تسلّی دینے والی باتیں ہیں۔" ریڈمین نے کہا۔ "ہمیں کچھ پتا نہیں ہے کہ اس وقت ہم کہاں ہیں۔ نہ جانے طوفان نے ہمیں کہاں لا پھینکا ہے اور جہاں تک ڈینیل کا تعلق ہے، یہ نہ ہماری کچھ مدد کر سکتا ہے اور نہ اپنی۔ میرا مطلب ہے کہ یہ چپّو بھی نہیں چلا سکتا اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ ایک آدھ دن کا مہمان ہے۔ اس کا خون بہت ضائع ہو چکا ہے۔ ہم کچھ بھی کریں، اس کا بچنا محال ہے۔ اس لیے میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر اسے۔۔۔"

کرافٹ نے تیزی سے اُس کی بات کاٹی۔ "ریڈمین! کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ اس زخمی پائلٹ کو شارک مچھلیوں کے حوالے کر دیا جائے یا اسے بھوک سے مرنے دیا جائے۔ یا۔۔۔ یا تمھارے ذہن میں آدم خوری والی کوئی تجویز ہے؟ آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ صاف صاف بات کرو۔"

"تم خواہ مخواہ طیش میں آ رہے ہو۔ خود سوچو، جو شخص مرنے کے قریب ہو اُس پر راشن ضائع کرنے کا کیا فائدہ۔ ابھی پتا نہیں ہمیں کتنے دن اور سمندر کے اندر بھٹکنا پڑے۔ اس لیے میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ اسے۔۔۔"

"قتل کر دیا جائے۔" کرافٹ نے اُس کی بات پوری کرتے ہوئے کہا۔ "تم یہی کہنا چاہتے ہو نا، ریڈمین؟ لیکن سنو، میں تمھیں ایسا کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ ہم ڈینیل کو بچانے کی پوری کوشش کریں گے۔ اسے اس کے حصّے کا پورا راشن دیں گے۔ جب یہ راشن ختم ہو جائے گا تو پھر زندہ رہنے کے دوسرے ذرائع تلاش کریں گے۔"

ریڈمین غرّایا۔ "کالے حبشی! تمھیں انچارج کس نے بنایا ہے؟ کس نے تمھیں مَن مانی کرنے کا اختیار دیا ہے؟"

کرافٹ نے دھیرے دھیرے سر اُٹھا کر ریڈمین کو گھورا۔ واضح طور پر وہ اپنے غصّے پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک طویل توقف کے بعد اُس نے کہا۔ "ریڈمین! جو کچھ تم نے کہا ہے اُس پر مَیں تمھیں قتل بھی کر سکتا تھا لیکن پھر مجھ میں اور تم میں کوئی فرق نہ رہتا۔ مَیں بھی تم جیسا بُرا آدمی ٹھہرتا، لیکن یاد رکھو، اگر تم نے ڈینیل کو کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کی یا کوئی اور بے ہودہ حرکت کی تو مَیں تمھارے دو ٹکڑے کر دوں گا، اور مَیں ایسا کر سکتا ہوں۔ اور سنو، مجھے میری طاقت اور منصف مزاجی نے انچارج بنایا ہے۔ جب تک ہم کنارے پر نہیں پہنچ جاتے تب تک تم میرے ماتحت ہو۔ یہ لو، اب تم چپّو چلاؤ۔ مَیں آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

ریڈمین نے خاموشی سے چپّو سنبھال لیے۔

سہ پہر کے قریب کسی ہوائی جہاز کی مدھم آواز سنائی دی۔ پہلے ریڈمین نے آواز سُنی۔ اُس نے چیخ کر کرافٹ کو بتایا، جو ڈینیل کی تیمارداری میں مصروف تھا۔

"کوئی چیز لہراؤ۔" کرافٹ چلّایا۔ "اپنی قمیص استعمال کرو۔ انھیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرو۔"

وہ کوئی چھوٹا طیّارہ معلوم ہوتا تھا جو نیچی پرواز کر رہا تھا۔ دونوں کشتی پر کھڑے ہو کر اپنے کپڑے لہراتے ہوئے چیخنے لگے۔ جہاز بہت دُور تھا اور واضح طور پر نظر نہیں آتا تھا۔ اُس کی آواز قریب آ رہی تھی۔ چند لمحوں کے بعد وہ کشتی سے نصف میل دُور سیدھی پرواز کرتا ہوا مشرق کی سمت نکل گیا۔ اُس کی آواز رفتہ رفتہ معدوم ہو گئی۔

ریڈمین کسی نڈھال انسان کی طرح کشتی پر گر گیا۔ "انھوں

نے ہماری طرف نہیں دیکھا۔" اُس نے روہانسی آواز میں کہا۔" انھوں نے ہماری طرف نہیں دیکھا۔ کرافٹ! مجھے پیاس لگی ہے۔" وہ سمندر کی طرف دیکھنے لگا۔ "میں پانی پینا چاہتا ہوں۔ مجھے بہت سخت پیاس لگی ہے۔"

کرافٹ اُس کا ارادہ بھانپ کر بولا۔" ریڈمین! سمندر کے پانی سے پیاس بجھانے کی کوشش نہ کرنا۔ تم خوب جانتے ہو کہ اس کا کیا نتیجہ نکلے گا۔"

ریڈمین التجائیہ لہجے میں بولا۔" کرافٹ! ایک پھل کا ڈبا کھول لو۔ صرف ایک ڈبا۔"

کرافٹ نے نفی میں سر ہلایا، بولا۔" آج کا راشن پورا ہو چکا ہے۔ اب کل تک صبر کرو۔ میں نے سوچا ہے کہ ہم ایک دن میں صرف دو ڈبّے استعمال کریں گے۔ اس طرح ہمارا راشن مزید ایک دن چل جائے گا۔"

ریڈمین نے نفرت انگیز نظروں سے بے ہوش پائلٹ کی طرف دیکھا لیکن مُنہ سے کچھ نہیں بولا۔

سورج غروب ہونے سے کچھ دیر پہلے کرافٹ نے چپّو ریڈمین کے حوالے کر دیے۔ غذا کی کمی اور چپّوؤں کی مشقت نے اُسے خاصا نڈھال کر دیا تھا۔ وہ کشتی کے اگلے حصّے پر جا کر لیٹ گیا اور فی الفور اُس پر نیند غالب آگئی۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد عجیب سے شور سے اُس کی آنکھ کُھل گئی۔ اُس نے اپنے تھکے ہوئے جسم کو سیدھا کیا اور اپنے اردگرد کا جائزہ لیا۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور چاروں طرف شام کا دھندلکا پھیلا ہوا تھا۔

ریڈمین اپنے گھٹنوں پر سر ٹکائے بیٹھا تھا، شاید بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا۔ کرافٹ نے اس جگہ پر نظر ڈالی جہاں ڈینیل لیٹا ہوا تھا لیکن وہ جگہ خالی تھی، ڈینیل وہاں موجود نہیں تھا۔

پھر فوراً ہی کرافٹ نے پانی میں چھپاکے کی آواز سُنی، ساتھ ہی ڈینیل کی مدّھم آواز اُس کے کانوں میں آئی۔ اُس نے تیزی سے گھوم کر آواز کی سمت دیکھا۔ تقریباً پچاس قدم دور ڈینیل پانی میں ہاتھ پیر چلا رہا تھا اور تینوں شارک مچھلیاں اُس کے گرد گھیرا ڈالے کھڑی تھیں۔ یقیناً وہ اس کے مرنے کا انتظار کر رہی تھیں۔ کرافٹ نے غیر شعوری طور پر کسی رسّے کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ لیکن ظاہر ہے کہ وہاں کوئی رسّا موجود نہیں تھا۔ کرافٹ نے ریڈمین کو ایک طرف دھکیلا اور تیزی سے ایک چپّو کو اُٹھا لیا۔

تب ہی اُس نے 'جھیکی' کے پر کو پانی میں غائب ہوتے دیکھا۔ اُس کے ساتھ ہی زخمی پائلٹ کے مُنہ سے ایک دردناک چیخ بلند ہوئی اور وہ دونوں ہاتھ بلند کرتا پانی میں غائب ہو گیا۔

واضح طور پر 'جھیکی' نے اُسے اپنے خوف ناک جبڑوں میں دبا کر نیچے کھینچ لیا تھا۔ پھر سمندر کا وہ حصّہ سُرخ ہونے لگا جہاں تھوڑی دیر پہلے ڈینیل ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دوسری شارک مچھلیاں بھی تیزی سے حرکت میں آگئیں۔ پانی میں زبردست ہلچل مچ گئی۔ اگرچہ اوپر سُرخ پانی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا، لیکن یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ تینوں مچھلیوں نے پائلٹ کی تکّا بوٹی کر ڈالی تھی۔ ایک دفعہ ایک مچھلی کی دُم کشتی سے ٹکرا گئی۔ اُس معمولی ٹکّر نے کشتی کو بُری طرح ہلا ڈالا تھا۔

کرافٹ نے جلدی سے چپّو سنبھالے اور کشتی کو جائے حادثہ سے دُور لے گیا۔ ریڈمین ہنوز بے سُدھ پڑا تھا۔ کرافٹ جانتا تھا کہ وہ مکر کر رہا تھا۔ ڈینیل کو اُسی نے سمندر میں پھینکا تھا، لیکن اُس وقت کرافٹ پر تھکن اور نقاہت کا غلبہ تھا۔ وہ بھوک، پیاس اور بے خوابی کے باعث سخت نڈھال ہو رہا تھا۔ اُس نے چپّو ایک طرف رکھ دیے اور گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگا۔

اگلی صبح وہ ریڈمین سے پہلے بیدار ہو گیا۔ اُس نے اپنے حصّے کا کھانا کھایا اور ریڈمین کا حصّہ ایک طرف رکھ دیا۔ اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ ریڈمین کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دے لیکن وہ بنیادی طور پر نہایت نرم مزاج اور صُلح پسند آدمی تھا، اس لیے اُس نے کوئی انتقامی کارروائی نہیں کی۔

تھوڑی دیر بعد ریڈمین بیدار ہو گیا اور سب سے پہلے کھانا مانگا۔

" ریڈمین! تم میری تنبیہ کے باوجود باز نہیں آئے۔" کرافٹ نے کہا۔" تم نے یہ حرکت کیوں کی؟"

ریڈمین قسمیں کھانے لگا کہ اُس نے ڈینیل کو سمندر میں نہیں پھینکا۔" وہ خود ہی پانی میں گر گیا ہو گا۔ میں تو اُسی وقت سو گیا تھا۔ مجھے کچھ نہیں پتا کہ بعد میں کیا ہوا تھا۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ بہکی بہکی باتیں کر رہا تھا۔ اُس کے حواس ٹھکانے پر نہیں تھے۔ اُس نے اُٹھ کر چلنے کی کوشش کی ہو گی اور لڑکھڑا کر پانی میں گر گیا ہو گا۔ شاید اُس کی قسمت میں یہی لکھا تھا۔ میں . . . میں حلفیہ کہتا ہوں، میں نے اُسے ہاتھ نہیں لگایا۔ کیا تم مجھے کھانا نہیں دو گے؟"

کرافٹ نے اُس کے حصّے کا کھانا اُسے تھما دیا۔ اُسے اُس کی باتوں پر یقین نہیں تھا، لیکن وہ اُسے بھوکا بھی نہیں مارنا چاہتا تھا۔" ایک بات اچھی طرح سن لو۔" اس نے کہا۔" ساحل پر پہنچ کر تمھیں قتل کے الزام کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میں تمھیں آسانی سے نہیں جانے دوں گا۔"

ریڈمین کرافٹ کی باتوں پر توجہ دیے بغیر ندیدوں کی طرح

کھانے میں مشغول رہا۔ چند منٹوں کے اندر وہ اپنے حصّے کا کھانا چٹ کر گیا اور انگلیاں چاٹتے ہوئے بولا۔ "کرافٹ، ایک ڈبا اور کھول لو، اب تو . . . اب تو ہم دو آدمی رہ گئے ہیں۔"

"ابھی نہیں۔" کرافٹ نے جواب دیا۔ "میں سوچوں گا۔"

قدرے توقف کے بعد اُس نے کہا۔ "تم نے یقیناً زیادہ کھانے کے لیے ڈینیل کو سمندر میں پھینکا ہے۔ میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"بخدا یہ بات نہیں ہے۔" ریڈمین نے کہا۔ "کل مَیں نے ایسی بات ضرور کی تھی۔ لل . . . لیکن میں جیتے جاگتے انسان کو شارک مچھلیوں کی خوراک بننے کے لیے سمندر میں نہیں پھینک سکتا۔ مَیں تمھیں بتا چکا ہوں کہ وہ خود ہی گر گیا ہوگا۔ ڈینیل حادثے کا شکار ہوا ہے۔ تم میرے خلاف کچھ نہیں ثابت کر سکتے۔"

"ثابت کرنے اور جاننے میں بہت فرق ہے ریڈمین! ایک بات اچھی طرح سُن لو۔ میرے بارے میں تمھارے ذہن میں اگر کسی حادثے کا خیال ہے تو اُسے ابھی نکال دو۔ اگر تم نے ایسی کوئی کوشش کی تو وہ حادثہ تمھارے ساتھ ہوگا، میرے ساتھ نہیں۔"

"کرافٹ! مَیں قسم کھاتا ہوں، مَیں نے ڈینیل کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔"

"اپنا سانس بچا کر رکھو اور یہ چپّو سنبھال لو۔ اب تمھاری باری ہے۔"

دونوں ایک ایک گھنٹے کے وقفے سے چپّو چلاتے رہے۔ لیکن ساحل کا دُور دور تک کوئی نشان نہیں تھا۔ جب سورج نصف النہار پر پہنچا تو اُس وقت ریڈمین کی باری تھی۔ کرافٹ کشتی کے پچھلے حصّے پر لیٹ کر سونے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ ایک تو گرمی ویسے ہی بہت زیادہ تھی دوسرے سورج کی شعاعیں پانی سے منعکس ہو کر اُس کے چہرے پر پڑتی تھیں۔ کرافٹ کو رہ رہ کر ڈینیل کا خیال آتا تھا۔ جب وہ شارک مچھلیوں کے درمیان گھِرا ہوا جان بچانے کی کوشش کر رہا تھا تو اُس کی کیا حالت ہوگی۔ وہ کتنے اذیت ناک لمحے تھے۔ کرافٹ کے بدن میں جھُرجھُری آگئی۔ اُس نے کروٹ بدلی اور کشتی کے کنارے سے سمندر کے پانی کو گھُورنے لگا۔ ایک چھوٹی سی دھاری دار مچھلی کشتی کے پیچھے آرہی تھی۔ کبھی وہ تیز تیرتی ہوئی کشتی کے نیچے تک چلی جاتی اور کبھی پیچھے ہٹ جاتی۔ جب وہ کئی منٹ تک یہ عمل دُہراتی رہی تو کرافٹ کو اُس کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔

اُس کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہوگئیں۔ ایسی مچھلیاں کسی بڑی چیز کے قریب نہیں آتیں۔ خواہ وہ شارک مچھلی ہو یا کوئی کشتی ہو۔ لیکن وہ مچھلی کسی خاص چیز کے پیچھے کھنچی چلی جارہی تھی۔ یہ چپّو نہیں ہو سکتے تھے، کیوں کہ وہ خاصے دور تھے۔ پھر وہ کیسا چیز تھی؟

کرافٹ قدرے آگے جھُکا اور کشتی کے کنارے پر نظر دوڑائی، تب ہی اُسے ایک سفید چیز پانی میں لہراتی دکھائی دی۔ اُس کا ایک سرا کشتی کے گرد لگی ہوئی رسّی میں پھنسا ہوا تھا۔

کرافٹ نے احتیاط کے ساتھ ہاتھ بڑھایا اور اُس سفید چیز کو پکڑ کر باہر کھینچ لیا۔ وہ کئی لمحوں تک اُسے گھُورتا رہا۔ دفعتاً ساری بات اُس کی سمجھ میں آگئی۔ وہ سفید پٹّی تھی۔

غصّے سے کرافٹ کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ "ریڈمین!" اُس نے چیخ کر کہا۔ "تم . . . قاتل ہو . . . ذلیل، کمینے . . . ڈینیل خود پانی میں نہیں گرا، تم نے اُسے قتل کیا ہے۔"

ریڈمین نے گھبرا کر کرافٹ کی طرف دیکھا اور چپّو کو دفاعی انداز میں بلند کر کے بولا۔ "پتا نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔ مَیں تمھیں بتا چکا ہوں کہ وہ . . . وہ ایک حادثہ تھا۔"

"بکواس مت کرو۔ مَیں ساری بات سمجھ گیا ہوں، اب مجھے یاد آیا ہے کہ جب مَیں نے ڈینیل کو مدد کے لیے ہاتھ چلاتے دیکھا تھا تو اُس کے دونوں بازو خالی تھے۔ اُس کے داہنے بازو پر پٹّی موجود نہیں تھی۔"

"اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟" ریڈمین نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ پانی میں گرنے کی وجہ سے گرہ کھُل گئی ہوگی اور پٹّی اُتر گئی ہوگی۔"

کرافٹ اُسے پٹّی دکھاتے ہوئے بولا۔ "یہ رہی اُس کی پٹّی۔ جب تم نے اُسے دھکّا دیا تھا تو یہ پٹّی کشتی کے گرد لگے ہوئے رسّے میں پھنس گئی تھی۔"

"دیکھو، دیکھو مجھے الزام مت دو۔ گرہ کھُل گئی ہوگی اور پٹّی رسّے میں پھنس گئی ہوگی۔ یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔"

"اچنبھے کی بات یہ ہے کہ گرہ جوں کی توں . . . اپنی جگہ پر موجود ہے۔" کرافٹ نے پٹّی کو پلٹا۔ "لیکن یہ دیکھو . . . یہ پٹّی یہاں سے کٹی ہوئی ہے۔ یہ ٹوٹی نہیں پھٹی ہوئی ہے۔ اسے چاقو سے کاٹا گیا ہے اور اس کشتی پر صرف ایک ہی چاقو ہے اور وہ تمھارے پاس ہے۔" اُس نے پٹّی کو کشتی پر پھینک دیا اور نفرت بھری نظروں سے ریڈمین کو گھُورنے لگا۔ "تم نے سوچا ہوگا کہ ڈینیل کو صرف دھکّا دینا کافی نہ ہوگا۔ تم نے اُس کی پٹّی کاٹ دی تاکہ اُس کے زخم سے دوبارہ خون جاری ہو جائے اور شارک مچھلیاں فوراً اُس پر جھپٹ پڑیں اور یہ حرکت تم نے صرف اس لیے کی کہ تمھیں ڈینیل کے حصّے کا کھانا بھی مل جائے۔ اب تم بھی لپکی، جھپکی اور ٹپکی کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

کرافٹ اُٹھا اور لپکتا ہوا ریڈمین کے سر پر جا ٹھہرا۔ اُس نے اپنے بھاری ہاتھ ریڈمین کے گلے کی طرف بڑھائے، ریڈمین نے نہایت پھُرتی کے ساتھ چپّو گھمایا، جو سیدھا سیاہ فام کرافٹ کے سینے پر لگا۔ اگرچہ چوٹ اتنی سخت نہیں تھی تاہم کشتی کے ڈولنے کی وجہ سے اُس کا توازن بگڑ گیا اور وہ کنارے کے اوپر سے ہوتا ہوا پانی میں پہنچ گیا۔ جب وہ اُوپر اُبھرا تو اُس نے ریڈمین کو کشتی میں تیار کھڑے پایا۔ اُدھر شارک مچھلیاں بھی اُس کی طرف متوجہ ہوگئی تھیں۔ اُس نے غوطہ لگایا اور کشتی کے نیچے چلا گیا۔

ریڈمین تیزی سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ کرافٹ کسی طرف بھی نمودار ہو سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے جیب سے چاقو نکال لیا اور پانی کی طرف دیکھتے ہوئے اُس کا پھل باہر نکالا۔ لیکن چاقو کے بجائے سُوا باہر آگیا۔ اُسی لمحے کشتی کے پچھلے حصّے پر کوئی چیز ٹکرائی۔ ریڈمین تیزی سے اُس طرف مُڑا۔ کرافٹ کشتی کے کنارے پر ہاتھ جمائے، اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ریڈمین!" اُس نے التجائیہ لہجے میں کہا۔ "شارک مچھلیاں میرے پیچھے آرہی ہیں۔ مجھے بچاؤ۔ میری مدد کرو، میری مدد کرو۔"

"صبر کرو، مَیں ابھی تمھاری مدد کرتا ہوں۔" ریڈمین نے کہا اور کرافٹ کے ہاتھ پر سُوئے سے وار کیا۔ کرافٹ نے تیزی سے اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا۔ سُوا اُس کے ہاتھ پر گہری خراش ڈالتا ہوا کشتی میں پیوست ہوگیا۔ پھر جیسے ہی ریڈمین نے سُوا باہر کھینچا، ہوا خارج ہونے کی تیز آواز سُنائی دی۔ کشتی میں سوراخ ہوگیا تھا۔ ریڈمین نے فی الفور اپنی انگشتِ شہادت سوراخ میں ڈال دی۔ ہوا خارج ہونا بند ہوگئی۔

اس اثناء میں کرافٹ کا دوسرا ہاتھ بھی کشتی کے کنارے سے پھسل گیا تھا۔ پھر جیسے ہی اُس کے زخمی ہاتھ سے بہنے والا خون پانی میں شامل ہوا، تینوں شارک مچھلیوں نے اُسے گھیرے میں لے لیا۔

صورتِ حال ریڈمین کے لیے بھی خوش گوار نہیں تھی۔ کھانا کشتی کے دوسرے کنارے پر تھا اور وہ انگلی ہٹائے بغیر کھانے تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اگر وہ اُنگلی ہٹا دیتا تو صرف تیس سیکنڈ کے اندر ساری ہوا خارج ہو جاتی اور وہ کشتی سمیت ڈوب جاتا۔ اب اُسے ایک ساتھی کی ضرورت تھی۔

"کرافٹ، کرافٹ . . ." وہ چلّایا۔ "جلدی سے اِدھر آجاؤ۔ آؤ، مَیں تمھاری مدد کرتا ہوں۔"

لیکن شارک مچھلیوں کے نرغے میں آیا ہوا کرافٹ اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ اُس نے طنزیہ مُسکراہٹ کے ساتھ ریڈمین کی طرف دیکھا اور کہا۔ "ریڈمین . . . مَیں موت سے . . . نہیں ڈرتا۔ لیکن . . . تم بتاؤ . . . تمھارا کیا حشر ہوگا . . . تم کب تک اس سوراخ میں اُنگلی ڈالے بیٹھے رہو گے؟"

ریڈمین نے رونا شروع کر دیا، بولا۔ "کرافٹ کوشش کرو۔"

لیکن ابھی اُس کی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ کرافٹ پانی کے اندر غائب ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی تینوں شارک مچھلیوں کے پر بھی پانی میں غائب ہوگئے۔ چند لمحوں کے بعد پانی سُرخ ہونے لگا۔ یہ دیکھ کر ریڈمین پر غایت درجہ دہشت طاری ہوگئی۔

تھوڑی دیر بعد پانی کے اندر ہونے والی ہلچل ختم ہوگئی اور شارک مچھلیاں دوبارہ کشتی کا طواف کرنے لگیں۔

ریڈمین نے مایوس نظروں سے چاروں طرف پھیلے ہوئے سمندر کی طرف دیکھا۔ تا حدِ نگاہ پانی ہی پانی دکھائی دیتا تھا۔ اب کوئی معجزہ ہی اُسے بچا سکتا تھا۔ لیکن دو انسانوں کا قاتل کسی معجزے کی توقع نہیں کر سکتا تھا۔

وقت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا۔ دوپہر ڈھلتی جارہی تھی۔ ریڈمین نے بے بسی کے ساتھ کھانے کی طرف دیکھا۔ یہ وہ کھانا تھا جس کی وجہ سے اُس نے دو آدمیوں کو قتل کر دیا تھا۔ لیکن اب وہ اُس کھانے کو صرف دیکھ سکتا تھا۔ کھانے تک پہنچنے کے لیے اُسے انگلی ہٹانا پڑتی۔ اور انگلی ہٹانے کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ کھانے اور کشتی سمیت غرق ہو جاتا۔ تاہم اگر وہ ایک آدھ ڈبا پکڑ بھی لیتا تو اُسے کھول نہیں سکتا تھا۔ کیوں کہ اُس کا چاقو سمندر میں گر گیا تھا۔

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا اُس پر نقاہت طاری ہوتی جارہی تھی۔ جب شام کا دھُندلکا فضا پر محیط ہونا شروع ہوا تو اُس پر ایک اور ہولناک انکشاف ہوا۔ وہ سو بھی نہیں سکتا تھا۔

تب اُس کو اپنے ساتھیوں کی موت پر رشک آیا۔ اُس کی موت اُس کے گرد منڈلا رہی تھی۔ وہ بھوکا تھا، پیاسا تھا، بے خوابی کا شکار تھا اور اُس پر غنودگی طاری ہو رہی تھی، لیکن وہ سوراخ میں انگلی ڈالے کشتی پر بیٹھا تھا۔ اُسے اپنا انجام بخوبی معلوم تھا مگر وہ بقائمی ہوش و حواس سوراخ سے انگلی نکالنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا، لیکن کب تک؟

اور تین خون آشام شارک مچھلیاں بڑے سکون کے ساتھ کشتی کا طواف کر رہی تھیں۔ شاید انھیں شروع ہی سے کشتی کے مسافروں کا انجام معلوم تھا . . . وہ رات کا کھانا کھا چکی تھیں اور اب صبح کے ناشتے تک انتظار کر سکتی تھیں۔

WYNKEN, BLYNKEN, AND NOD
William Brittain.

موت کے سوداگر

اقلیم علیم

ایک نوجوان کی خود نوشت جوانپنوں کے ہاتھوں برباد ہو کر منزل کا نشان کھو بیٹھا تھا۔ ان نوجوانوں کی داستانِ عبرت جن کی پرورش رشوت کے مال سے ہوئی تھی۔ اُن زَر پرستوں کا احوال جنہیں سونے چاندی کی خیرہ کُن چمک نے بینائی سے محروم کر دیا تھا۔ موت کے ان سوداگروں کا ماجرا جو اپنے بچّوں کو اپنے ہی ہاتھوں زہر پلا رہے ہیں

سسپنس کا یہ قیمتی تحفہ نئی نسل کے بدہوشوں کی کہانی ہوشمندوں کی عبرت کے لیے

میرے والد ایک رائشی افسر تھے، ان کی موت کے بعد ان کی پہلی بیوی نے مجھے اور میری ماں کو گھر سے نکال دیا۔ ماں نے میری تعلیم و تربیت میں کوئی کمی نہیں چھوڑی مگر مصائب نے مجھے راہ سے بھٹکا دیا۔ نتیجتاً میری ماں نے مجھ سے اور اس دنیا سے منہ موڑ لیا۔ میں کراچی آ گیا، یہاں منشیات فروشوں کے ایک گروہ نے مجھے اپنی سرپرستی میں لے کر مالا مال کر دیا۔ پھر میری ملاقات غزالہ نامی ایک طالبہ سے ہوئی، جلد ہی وہ میرے دل کی دھڑکن بن گئی۔ منشیات فروشی پر میرا ضمیر ہمیشہ لعن طعن کرتا رہتا تھا بالآخر وہ جیت گیا اور میں نے موت کے سوداگروں کی اس تنظیم کو نیست و نابود کرنے کا عہد کر لیا۔ غزالہ نے میرا ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔ پہلے مرحلے پر میں نے اپنے مقامی سربراہ کو زک پہنچا کر اس کی جگہ حاصل کر لی۔ تنظیم کا سربراہ اے ٹو کہلاتا تھا، میں اس کی تلاش میں غزالہ کے ساتھ لاہور پہنچا۔ اے ٹو تو نہیں مل سکا مگر کچھ اس کے اہم لوگ سامنے آ گئے اور میں انھیں خاصا نقصان پہنچا کر واپس آ گیا۔ ایک شخص سلطان شاہ کو میں نے ملازم رکھ لیا تھا، وہ ان معاملات میں میرے بہت کام آ رہا۔ تنظیم کی ایک اہم رکن رخشی، باغی ہو کر اپنا الگ کاروبار جمانے کے لیے مجھے شیشے میں اتارنے کی کوشش کرنے گی، اس کا دوست قاسم جو تنظیم میں سی ون کہلاتا تھا اس کی پشت پر تھا۔ پھر میرے دوست جہانگیر نے مجھے اطلاع دی کہ کچھ لوگوں نے اس کے مکان پر سنگ باری کی ہے۔ میں نے اسے اور قاسم کو جیوا ہاؤز طلب کر لیا، وہاں یہ معلوم ہوا کہ یہ حرکت قاسم اور اس کے آدمیوں کی تھی۔ پھر سارے پردے اٹھ گئے اور ہمارے درمیان تنظیم کو نقصان پہنچانے والی کچھ باتیں طے ہو گئیں۔

خاصی بحث و تمحیص کے بعد ہم تینوں کے درمیان یہ معاہدہ طے پا گیا کہ قاسم ہیروئن فراہم کرے گا اور میں اور جہانگیر تنظیم کے مال کے ساتھ ساتھ اس کا مال بھی بازار میں پھیلائیں گے۔ اے ٹو کی طرف سے نئے مال کے ساتھ چار ایسے سوٹ کیس بھی مجھے ملے جنھیں ان چار دلا لڑکوں کے ساتھ بھیجنا تھا جن کو میں نے باہر بھیجنے کے لیے منتخب کیا تھا۔ میں ان کا بندوبست کر کے گھر پہنچا تو معلوم ہوا میرا سوتیلا بھائی تنویر میرے گھر میں بیٹھا ہوا ہے۔ وہ مجھے تلاش کرتا ہوا کراچی آیا تھا اور اب مجھے اپنے ساتھ لاہور لے جانا چاہتا تھا۔ اسے جب یہ معلوم ہوا کہ میں نے اپنے لیے ایک لڑکی کا انتخاب کر لیا ہے تو وہ اسے دیکھنے کی ضد کرنے لگا۔ اس کی اس ضد نے مجھے اس کی طرف سے مشکوک کر دیا۔ سلطان شاہ نے بھی اس کی کچھ پُراسرار حرکتوں کی نشاندہی کی چنانچہ میں نے زخمی سلطان شاہ کو اسپتال پہنچانے کے بہانے گھر سے نکالا اور خود بھی وہ رات غزالہ کے گھر گزارنے کا فیصلہ کیا۔ غزالہ سے بات چیت کے دوران کچھ ایسی کڑیاں ملیں جنھوں نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ تنویر ہی اے ٹو ہے۔ میں نے گھر فون کیا تو میرے ملازم رحمت نے توقیر کے بارے میں ایسے حیرت انگیز انکشافات کیے جن سے میرا شبہ یقین میں بدل گیا۔ چنانچہ میں نے ایک گمنام فون کے ذریعے پولیس کو اپنے ہی مکان پر ریڈ کرنے پر اکسایا مگر توقیر میرے گھر کو آگ لگا کر نکل گیا اور غریب رحمت بابا اس مکان کے ساتھ ہی جل مرا۔ یہ بات پوری طرح واضح ہو چکی تھی کہ میرا سوتیلا بھائی توقیر ہی اے ٹو تھا۔ وہ اب کھل کر سامنے آ چکا تھا اور مجھے برباد کرنے کے لیے اپنا پورا زور صرف کر رہا تھا مگر تقدیر مجھے ہر قدم پر بچاتی رہی۔ جہانگیر کو معلوم ہوا کہ میں ... اے ٹو کا معتوب ہو گیا ہوں تو وہ بھی اے ٹو کے خوف سے مجھ سے دوستی کا رشتہ توڑ کر دشمنی پر اتر آیا۔ سی ون یعنی قاسم کو اس کا علم ہوا تو اس نے مجھ سے کیا ہوا معاہدہ توڑنے کی کوشش کی مگر میں نے اس کی بعض کمزوریوں کے حوالے سے اسے ایسا کرنے سے باز رکھا۔ اس موقع پر بھی غزالہ ہی نے میرا ساتھ دیا تھا۔ میں اس کے گھر میں ہی روپوش تھا۔ میں نے اپنا حلیہ بدل کر ایس پی سے ملاقات کر کے اس کے سامنے اپنی پوزیشن صاف کرنا چاہی کیونکہ اے ٹو نے میری فیکٹری کو بم سے اڑانے کی کوشش کی تھی۔ میرے آدمیوں نے اس بم کو ایک ویرانے میں پھینک دیا تھا جہاں بم پھٹ گیا۔ پولیس دھماکہ کرنے والوں کو تلاش کر رہی تھی۔ ایس پی کو میری باتوں پر یقین نہیں آیا تھا مگر اس نے میرے خلاف کارروائی کرنے کے بجائے مجھے اپنی طرف سے ہر شبہ دور کرنے کا موقع دے دیا۔ میں نے اے ٹو کا حلقہ تنگ ہوتے دیکھ کر قاسم کو ٹھکانے لگا دیا اور لاہور جا کر اے ٹو کے خلاف بھرپور کارروائی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ سلطان شاہ میرے اس فیصلے سے بہت خوش تھا۔

دوسری بار لاہور پہنچ کر ہم نے بڑے ہنگامے کیے۔ وہاں لائیڈز کاٹج نامی ایک عمارت کا بھی پتا چلا۔ اس عمارت کے آس پاس ہمیں گھیرنے کی کوشش کی گئی مگر ہم اچھی خاصی تباہی پھیلا کر بچ نکلے۔ عمارت کے مالک جمی لائیڈ کا نام معلوم ہونے کے بعد مجھے ویرا لائیڈ کا خیال آ گیا۔ لاہور ہی کے ایک ہوٹل میں میری ملاقات اپنے سوتیلے بھائی تصویر سے ہوئی۔ وہ لائیڈز کاٹج میں ملازم تھا۔ اس ملاقات کے فوراً بعد تصویر قتل کر دیا گیا۔ مگر وہ میرے ذہن سے یہ الجھن دور کر گیا تھا کہ میرا دوسرا سوتیلا بھائی توقیر، اے ٹو کی حیثیت سے تنظیم کے لیے کام کر رہا ہے۔ اے ٹو کوئی اور ہی شخص تھا۔ مجھے وہاں اس سے بھی دو دو ہاتھ کرنے کا موقع ملا مگر وہ میرے ہاتھوں سے بچ کر نکل گیا۔ میں کراچی واپس آ گیا۔

میں رخشی سے ملنے اسٹون ہاؤس جا پہنچا مگر وہاں ایک اور ہی تماشا میرا منتظر تھا۔ اے ٹو سے بھی دو دو ہاتھ ہوئے لیکن ہم میں سے کوئی کسی کو زیر نہ کر سکا۔ رخشی کو اے ٹو نے غائب کر دیا تھا، میں اس کی تلاش میں بل ایریا کے ایک گودام میں پہنچا، وہاں رخشی عزیز نامی ایک بدمعاش کے ساتھ موجود تھی، جہانگیر بھی وہیں قید تھا۔ میں جہانگیر اور رخشی کو لے کر وہاں سے نکل آیا۔ رخشی راستے میں ایک جگہ اتر گئی، جہانگیر کو میں غزالہ کے گھر لے گیا اور اس کی بیوی کو بھی فون کر کے ہدایت کر دی کہ جتنی جلدی ہو سکے وہ اپنا گھر چھوڑ دے۔ میں رات کی تاریکی میں ایک بار پھر گودام جا پہنچا۔ میرے اندازے کے مطابق اے ٹو وہاں میری گھات لگائے بیٹھا تھا لیکن وہ میری توقع سے کہیں زیادہ تیاری کر کے آیا تھا، اس معرکے میں اے ٹو میرے ہاتھوں زخمی ہو گیا اور اس کا ایک کارندہ اپنی جان گنوا بیٹھا۔ میں اپنا حلیہ درست کرنے جہانگیر کے گھر چلا گیا مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے وہاں زخمی اے ٹو کو اپنے زخموں کی مرہم پٹی کراتے دیکھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ وہاں سے نکل بھاگا۔ میں نے لاہور سلطان شاہ کو فون کیا۔ اس نے بتایا کہ بڑی ماں اب اس دنیا میں نہیں ہیں اور یہ کہ شوگر کوئین دراصل ویرا لائیڈ ہی ہے۔ اچانک مجھے فون پر اس کی کراہ سنائی دی اور پھر لائن بے جان ہو گئی پھر کوشش کے باوجود دوبارہ اس سے رابطہ قائم نہ ہو سکا۔ میرے دل و دماغ میں وسوسے جنم لینے لگے۔

سلطان کی اطلاعات نے میری زندگی مزید بوجھل کر دی تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد سلمیٰ کو بمشکل اپنی طرف سے مطمئن کیا۔ حامد جسے میں نے یونیورسٹی میں ہیروئن بیچنے کے لیے پھنسایا تھا میرا دشمن بن گیا۔ ایک روز اس نے میرا پیچھا کیا لیکن جب اسے میری اصلیت کا علم ہوا تو وہ بھی میرا دوست بن گیا۔ اس سے مجھے پتا چلا کہ کراچی میں تنظیم کا کوئی بڑا آنے والا ہے۔ اس نے اس کے آتے ہی مجھے اطلاع دینے کا وعدہ کر لیا۔ میں اے ٹو کی تلاش میں ڈاکٹر اکبر کے اسپتال پہنچا، مگر وہ فطین زخمی حالت میں بھی عقبی کھڑکی سے کود کر فرار ہو گیا، وہ جاتے جاتے میری موت کا سامان کر گیا تھا۔ غزالہ کی ایک بڑی تصویر پلاسٹک کے فریم میں وہاں چھوڑ گیا تھا لیکن میرے بجائے ڈاکٹر اکبر اس کا نشانہ بن گیا۔ اسی رات تین بجے اچانک سلطان شاہ اس خبر کے ساتھ وارد ہوا کہ میری فیکٹری کو آگ لگا دی گئی ہے اور شوگر کوئین کراچی پہنچ چکی ہے۔ تمام دن کی تیاری کے بعد ہم نے جیوا ہاؤز کی سوختہ عمارت پر دھاوا بول دیا جہاں شوگر کوئین یعنی ویرا لائیڈ تنظیم کے اہم ارکان سے خطاب کر رہی تھی۔ زبردست فائرنگ اور بموں کے دھماکوں کے دوران ویرا لائیڈ نے شدید تاریکی کے باوجود مجھے یوں للکارا جیسے وہ مجھے اچھی طرح دیکھ رہی ہو، میرے ہاتھوں سے اسٹین گن چھوٹ گئی۔

مقررہ وقت میں غزالہ سے رخصت ہو کر یونٹ جا پہنچا، وہاں ویرا لائیڈ پہلے سے موجود تھی۔ میں اس کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ مجھے نئی نئی آزمائشوں میں مبتلا کر رہی تھی۔ میں نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ غزالہ سے میرا کیا تعلق ہے اور میں نے اپنی اور غزالہ کی تنظیم کے خلاف کی جانے والی ساری کارروائیاں اے ٹو کے کھاتے میں ڈال دیں۔ لائیڈز کاٹج کے حوالے سے جو داستان ویرا نے سنائی، اس کے مطابق جمی لائیڈ اس کا باپ تھا مگر وہ اپنی بیٹی کو جانتا تک نہیں تھا۔ ویرا نے اپنے باپ تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ہی اس تنظیم میں شمولیت اختیار کی تھی۔ میں بڑی حد تک اسے اپنے حق میں ہموار کر کے واپس آیا تھا۔ دوسری صبح کرنل نے غزالہ کی گم شدگی کی جان لیوا خبر سنا کر میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکال دی۔ اسے ویرا نے اغوا کیا تھا۔ وہ مجھے بلیک میل کر کے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتی تھی اور میں مجبور محض تھا۔ میں گھر والوں اور اپنے بہی خواہوں کو غزالہ کی طرف سے مطمئن کرنے کے لیے طفل تسلیاں دیتا رہا۔ پھر ویرا نے مجھے لاہور جانے کا حکم دے دیا جہاں مجھے لائیڈز کاٹج میں صفائی کرنے والے عملے کا نگراں بن کر رہنا تھا۔

لائیڈز کاٹج میں مجھ پر تشدد کے پہاڑ توڑے گئے لیکن جلد ہی ان کی غلط فہمی دور ہو گئی اور مجھے اپنوں میں شامل کر لیا گیا۔ یہاں کے انچارج ڈیسوزا نے مجھے کاٹج میں ایک کالی بھیڑ کی تلاش کا کام بھی سونپ دیا جس کی وجہ سے میری بڑی مشکل آسان ہو گئی اور مجھ پر لائیڈز کاٹج کے سربستہ راز وا ہونے لگے اور میں نے وہاں عمارت نمبر تین کے ممنوعہ حصے میں جمی لائیڈ کی وہ تصویر دریافت کر لی جو ویرا لائیڈ کو درکار تھی۔ ایک خفیہ راستے کے دو محافظوں کو ہلاک کرنے کے بعد ان کی لاشوں کے ساتھ تہ خانے میں پہنچا تو وہاں ڈیسوزا کا نائب انعام نامی گن تانے میرے استقبال کے لیے موجود تھا۔

میں نے جلد ہی اسے اپنی باتوں کے جال میں الجھا کر اس کا بھی قصہ تمام کر ڈالا۔ باہر خاصی ہلچل شروع ہو چکی تھی۔ رحمانی بہت پریشان تھا مگر میں اسے دلاسہ دے کر اور راستے میں ملنے والے پہرے داروں کو چکر دے کر اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ انٹرکام پر ڈی سوزا سے رابطہ قائم کیا تو اس نے جواب طلبی شروع کر دی لیکن میں نے اس سے مل کر اسے اپنی طرف سے مطمئن کر کے اس کا اعتماد قائم رکھا۔ وہ انعام کی گمشدگی سے فکرمند تھا، میں نے اس معاملے میں اُسے رحمانی کی طرف سے بدظن کر دیا۔ مجھے کسی نہ کسی طرح اصل معاملے کو اس وقت تک پوشیدہ رکھنا تھا جب تک میں لائیڈز کاٹج سے نکل نہ جاتا۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ دوسری رات ٹھیک آٹھ بجے میں لائیڈز کاٹج سے نکل کر ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل جا پہنچا جہاں ویرا لائیڈ میری منتظر تھی۔ میں نے اسے اس کے باپ کی تصویر اور تہ خانے میں اسلحے کے ذخیرے کے بارے میں بتایا۔ پھر اسی رات ہم دونوں اس اسلحہ خانے کو تباہ کرنے کی مہم پر نکل کھڑے ہوئے۔ ایک ٹرک کا پیچھا کرتے ہوئے ہم خفیہ راستے سے تہ خانے میں پہنچ گئے۔ میں نے ٹرک والوں کو للکارا تو جواب میں دو گولیاں میری طرف آئیں، ایک نے میرا ہاتھ زخمی کر کے ریوالور ہاتھ سے نکال دیا اور دوسری نے میری پنڈلی ادھیڑ ڈالی۔ میں تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

یہ شکر کا مقام ہے کہ مجھے کوئی کارگر زخم نہیں آیا تھا، پھر اچانک ویرا نے نمودار ہو کر بازی پلٹ دی۔ میں نے نمبر تین میں اسے لے جا کر جمی لائیڈ کی تصویر دکھائی تو اس نے مشتعل ہو کر تصویر تباہ کر دی اور یہ انکشاف کیا کہ وہ روم کا ایک بدمعاش ڈان مرسیانو ہے جسے وہ اچھی طرح جانتی ہے۔ ہم تہ خانے میں اسلحے کے ڈھیر میں ٹائم بم رکھ کر باہر نکل آئے۔ ہمارے باہر آنے کے چند منٹ بعد ہی دھماکوں کے شور نے فضا کا سکوت درہم برہم کر دیا۔ ویرا کو جیپ کے ٹرانسمیٹر پر کہا گیا کہ وہ لائیڈز کاٹج کی طرف جا کر دیکھے وہاں کیا قیامت ٹوٹی ہے۔ تنظیم کے پانچ بڑوں میں سے ایک وان ہوف کی یہ ہدایت سن کر ویرا کا ماتھا ٹھنکا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ اسے ہلاک کرنے کی ایک چال ہے۔ ویرا نے خفیہ طور پر جائے واردات پر پہنچ کر اس کی تصدیق کرنے کے بعد اس سے رابطہ قائم کرنے کے لیے جیپ کا ٹرانسمیٹر نکال لیا۔

بہت دیر کوشش کرنے کے بعد اس سے رابطہ قائم ہو سکا اور اس گفتگو کے نتیجے میں ویرا اور وان ہوف کھل کر مقابل آ گئے۔ ناصر کے ایک آدمی سے جو ٹیلی فون نمبر ہمیں ملا تھا، اس پر فون کرنے سے مجھے اس کا پتا حاصل ہو گیا اور پھر ہم دونوں اسی رات اس کی کمین گاہ میں جا گھسے اور ایک زبردست معرکے کے بعد بالآخر ویرا نے اس کا کام تمام کر دیا اور ہم اس پوری عمارت کو شعلوں کے حوالے کر کے واپس آ گئے۔ میں کراچی پہنچ کر سیدھا غزالہ کے گھر پہنچا مگر یہاں بھونچال آیا ہوا تھا۔ غزالہ کی ماں شمع زندگی کی آخری سانسیں لے رہی تھی اور کرنل کی حالت ابتر تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے شمع نے دم توڑ دیا۔ اس کے مرنے کے بعد کرنل نے کمرے میں بند ہو کر وصیت نامہ تیار کیا۔ اس نے غزالہ کو میری ذمے داری قرار دے کر مکان اپنے بیٹے

کامران کے نام کر دیا... اور اپنی کنپٹی پر گولی مار کر خود بھی بیوی کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ میرے اعصاب مضمحل ہو گئے تھے لیکن کرنل کی وصیت کا لحاظ کرتے ہوئے میں ان دونوں کی بے گور و کفن لاشیں چھوڑ کر اس گھر سے نکل آیا۔

وہاں سے نکل کر میں سلطان شاہ کے ہمراہ ویرا کے ایک غیر ملکی شناسا کے ہاں جا ٹھہرا۔ لیکن وہاں جانے کے بعد حیرت انگیز انکشافات ہوئے۔ وہ بظاہر معصوم رحم دل اور معذور شخص تنظیم کا مقامی سربراہ ثابت ہوا' لاہور میں وان ہوف کی ہلاکت کے بعد جو چار بڑے باقی بچے تھے وہ ان میں سے ایک تھا۔ ویرا نے اسے اذیتیں دے دے کر اس سے بقیہ تین کے نام بھی معلوم کر لیے اور پھر اس کے سینے میں گولی اتار دی۔

مارٹن کے تڑپتے ہوئے بدن میں ایکسپلوڈر کی گولی دل کے مقام پر پیوست ہوئی اور اس کے حلق سے اضطراری طور پر ایک چیخ آزاد ہو گئی پھر لحظہ بھر میں ایک ہلکے سے دھماکے کے ساتھ اس کے بدن کے چیتھڑے اُڑ گئے۔ اس کے بدن میں اُتری ہوئی ایکسپلوڈر کی گولی نے اس کے جسم کے اندر پھٹ کر کسی بم کی سی تباہی پھیلائی تھی' اور اب مارٹن کا کہیں وجود نہیں تھا، اس کا وجود لوتھڑوں اور چیتھڑوں کی صورت میں پورے کمرے میں یوں بکھر کر رہ گیا تھا کہ اس کی کوئی شناخت باقی نہیں رہ گئی تھی۔

"خس کم جہاں پاک۔" میں نے پھر یری لے کر کمرے میں چھایا ہوا بوجھل سکوت توڑتے ہوئے کہا۔

"ابھی خس باقی ہے۔" ویرا نے ایکسپلوڈر کی نال کو چومتے ہوئے نشیلے لہجے میں کہا "تم مارٹن کے بتائے ہوئے تین ناموں کو بھول رہے ہو، انھیں بھی یکے بعد دیگرے مارٹن کے پیچھے جانا ہے۔"

"وہ بھی چلے ہی جائیں گے۔" میں نے ویرا کے ہاتھ سے وہ ہتھیار لیتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا "لیکن یہ ننھا سا ہتھیار خوب ہے، اس کی زد میں آنے والا تو شاید بچ ہی نہیں سکتا۔"

"ایکسپلوڈر میں نے پہلی بار استعمال کیا ہے۔" وہ ایک گہرا سانس لیتے ہوئے بولی "اس کے بارے میں سن بہت کچھ رکھا تھا۔ اس میں سارا کمال میگزین کا ہے۔ ٹرائیگر سے فائر ہونے کے بعد گولی کا جو دھاتی حصہ نشانے میں پیوست ہوتا ہے' اس میں بھی ایک حساس بارودی حصہ ہے' جو جسمانی درجۂ حرارت میسر آتے ہی پھٹ جاتا ہے۔"

"یعنی میگزین کے بغیر ایکسپلوڈر بے کار ہے؟"

"نہیں۔" ویرا نے کہا "مخصوص میگزین میسر نہ ہو تو یہ اعشاریہ تین آٹھ کے عام میگزین کے ذریعے پستول کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ کمال یہ ہے کہ اس بور کے ہتھیاروں میں یہ شاید سب سے مختصر اور ہلکا ہے۔"

چند ثانیوں کے لیے کمرے کی فضا میں سکوت چھا گیا۔

"اب کیا پروگرام ہے؟" میں نے اپنے لیے سگریٹ سلگانے کے ساتھ ویرا کو بھی سگریٹ پیش کرتے ہوئے پُر خیال لہجے میں سوال کیا اور وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے خشک لہجے میں سوال کیا۔

"رونے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔" وہ اُسی موڈ میں بولی "تمھیں رُوپوش رہنے کے لیے ایک ٹھکانے کی تلاش تھی' اب وہ میسر آ گیا ہے۔ روانگی تک یہاں عیش کر سکتے ہو۔"

"زیادہ سے زیادہ دو دن میں روانگی کے کاغذات تیار ہو جائیں گے۔" سلطان شاہ نے لقمہ دیا "پروگرام بناتے ہوئے اس مدت کو ذہن میں رکھنا۔"

"دوسری بات یہ ہے کہ ہمارا یہاں قیام مخدوش بھی ہو سکتا ہے۔" میں نے ویرا کو آگاہ کیا "مارٹن نے خود اعتراف کیا تھا کہ گیراج میں منشیات موجود ہیں اور تنظیم کے اراکین یہاں آتے رہتے ہیں۔"

"تم یہ بھول رہے ہو کہ ایسے معاملات میں مارٹن کبھی ان لوگوں کے سامنے نہیں آتا ہو گا' وہ اپنی وھیل چیئر پر بیٹھے بیٹھے محض بٹن دبا کر ان کو آمد و رفت کی سہولتیں فراہم کرتا ہو گا' ایسا نہ ہوتا تو اپنے ماتحتوں کے سامنے کبھی کا بے نقاب ہو گیا ہوتا۔ یوں تم آسانی کے ساتھ اس کی جگہ لے سکتے ہو۔"

"میں جانتا ہوں کہ یہاں رہنے کے لیے مجھے کیا کیا کرنا ہو گا۔" میں نے سنجیدگی کے ساتھ کہا "مال لانے' لے جانے والوں کے علاوہ باقی ماندہ تین بڑوں میں سے بھی کوئی مارٹن سے رجوع کرنے کی کوشش کر سکتا ہے۔ ایسی صورت میں میری ہر احتیاط کے باوجود صورتِ حال زیادہ دیر تک مخفی نہ رہ سکے گی' ہماری تمام تر کوشش اب یہی ہونا چاہیے کہ مقامی معاملات میں ضرورت سے زیادہ ملوّث ہونے کے بجائے جلد از جلد نکل بھاگنے کی فکر کریں۔"

"میں سمجھ رہی ہوں کہ تم کو اب غزالہ تک پہنچنے کی عجلت ہے۔" وہ سگریٹ کا دھواں میرے منہ پر چھوڑتے ہوئے ہنس کر بولی "میں خود بھی یہاں زیادہ وقت برباد نہیں کرنا چاہتی لیکن خوش قسمتی سے ہاتھ آئے ہوئے کسی شاندار موقع کو تمھاری جلد بازی کی بنا پر ضائع بھی نہیں کروں گی۔"

میرے لیے یہ سمجھنا دشوار نہیں تھا کہ وہ بیرونِ ملک سے تنظیم کے کسی بڑے کی آمد اور اس کی سربراہی میں ہونے والے اعلیٰ سطحی اجلاس کو اپنے لیے سنہرا موقع تصور کر رہی تھی' اس کے لیے یہ انکشاف بہت سنگین ثابت ہوا تھا کہ وہ بہت زیادہ با اختیار اور صرف جمی لائیڈ کو جواب دہ ہونے کے باوجود ان پانچ مقامی بڑوں سے لاعلم تھی،

جو پاکستان میں ہیروئن کی پیداوار، مقامی کھپت اور برآمد کا کاروبار پوری رازداری کے ساتھ چلا رہے تھے۔

کمال کی بات یہ تھی کہ ویرا ان پانچوں سے بے خبر تھی مگر وہ سب نہ صرف اُسے جانتے تھے بلکہ مارٹن تو اسے دھوکے میں رکھ کر اس کا مربی بنا ہوا تھا۔ یہ محض وان ہوف کی خود غرضی اور ہوسِ اقتدار تھی، جس نے ہمیں ان پانچوں کی راہ پر ڈال دیا اور وان ہوف' ویرا کو گھیرنے کے چکر میں خود جہنم واصل ہو گیا۔ لاہور میں لائیڈز کاٹیج کی تباہی کے بعد وان ہوف کی موت دوسری بڑی کامیابی تھی لیکن وہ اس اعتبار سے ادھوری رہی کہ وان ہوف نے موت کی دہلیز پر ہوتے ہوئے بھی اپنے چار ساتھیوں کے بارے میں ذرا بھی زبان نہیں کھولی لیکن وہ کمی مارٹن نے پوری کر دی تھی۔

جب تک میں خود تنظیم کا وفادار تھا' ہیروئن کی تجارت کو سفاک اور پیشہ ور مجرموں کا کام سمجھتا رہا تھا، جس کی انجام دہی میں رازداری کو بنیادی اہمیت حاصل تھی لیکن تنظیم کے مہیب حصار سے نکلنے کے بعد اس بھیانک کھیل میں ایسے ایسے معززانہ اور معصوم چہرے ملوّث نظر آ رہے تھے، جنھیں معاشرے میں اعلیٰ مقام حاصل تھا۔

مارٹن اس بھر پور مگر مختصر سی ٹکڑی کا ایک شاہکار کردار تھا۔ ہر طرح سے صحت مند اور با صلاحیت ہوتے ہوئے بھی اُس نے اپنی ذات کو معصوم اور ہر قسم کے شبہات سے بالاتر رکھنے کے لیے معذوری کا ایسا بہروپ اختیار کیا ہوا تھا کہ اکثر اوقات شاید اسے خود بھی یاد نہ رہتا ہو کہ وہ پوری طرح صحت مند تھا۔

جب سے میں نے تنظیم کی بیخ کنی کا بیڑا اُٹھایا تھا، رہ رہ کر تنظیم کی نت نئی صورتیں بن اور بگڑ رہی تھیں۔ کئی بار سب کچھ فنا ہوتے ہوتے اچانک انکشاف ہوا کہ جو کچھ ہو رہا تھا، وہ سطحی نقصان تھا۔ تنظیم کے اختیار اور اقتدار کا سرچشمہ پوری طرح محفوظ تھا۔

مگر اب تنظیم کے خدوخال کچھ واضح ہو چلے تھے۔ یہ مقامی مجرموں کی کوئی بگڑی ہوئی ٹولی نہیں تھی بلکہ اس شرمناک دھندے میں ملک، قوم، نسل اور رنگت کے کسی امتیاز کے بغیر پیسے کی ہوس میں مبتلا وہ لوگ ملوّث تھے، جو عزت اور آبرو کی آڑ میں کامیابی کے ساتھ موت کی سوداگری کر رہے تھے۔

شاید جمی لائیڈ ان سب کا سربراہ تھا۔ خود اس کے کردار کا یہ حال تھا کہ اگر ویرا سچی تھی تو جمی لائیڈ دیدہ و دانستہ اپنی بیٹی ویرا کو محض اس خیال سے نیلام کرتا رہا تھا تاکہ تنظیم کی اعلیٰ صفوں میں پہنچنے تک وہ یہ بھول جائے کہ وہ عورت ہے، جس کا نسوانی وقار بھی کوئی حیثیت رکھتا ہے۔ چند روز پہلے تک ویرا کو صرف اپنے باپ کا نام معلوم تھا اور وہ اس کی صورت سے ناآشنا تھی اور اسی ایک خلش نے اُسے میرے ساتھ تعاون کی راہ دکھائی تھی۔

پھر لائیڈز کاٹیج کے ایک بند کمرے میں جب اس نے جمی لائیڈ کی تصویر دیکھی تو نفرت اور غصّے سے اس کی حالت غیر ہو گئی کیونکہ وہ شخص کسی اور نام سے ایک مدت تک اس کا دلال بنا رہا تھا۔

پاکستان میں جمی لائیڈ بس ایک نام تھا۔ لائیڈز کاٹیج کو ہر حلقے میں ایک خاص مقام حاصل تھا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ عمارت ہیروئن کی عالمی تجارت کا سرچشمہ رہی ہو گی اور اس کام کو چلانے والوں میں جرمن نژاد' وان ہوف اور مقامی عیسائی مارٹن کے ساتھ کم از کم دو مقامی معززین بھی شامل تھے جب کہ پانچویں کا نام میرے لیے غیر معروف تھا مگر یہ قیاس کرنا مشکل نہیں تھا کہ اس کا تعلق بھی اونچے طبقے سے ہی رہا ہو گا۔

"باہر سے کسی کے آنے کا امکان ہو سکتا ہے؟" میں نے ویرا سے سوال کیا۔

"کوئی بھی ہو سکتا ہے۔" اس نے بے پروائی کے ساتھ جواب دیا۔ "لیکن اتنا یقین ہے کہ جمی لائیڈ خود ہرگز نہ آئے گا۔ وہ حتی الامکان دور رہ کر اپنے افسانوی کردار کو برقرار رکھنا پسند کرتا ہے۔"

"تو اب اُن تینوں کی باری آئے گی؟" میں نے پوچھا۔

"ظاہر ہے' یہی تو ایک موقع ملا ہے' ورنہ آنے جانے والے سے مجھے ذرا بھی دلچسپی نہیں ہے۔ ہر ایک کو اس طرح الگ الگ گھیرنا ہو گا کہ دوسرے کو بھنک تک نہ مل سکے' ورنہ بازی اُلٹ بھی سکتی ہے۔"

"کیوں نہ یہ کام میں اپنے ذمے لے لوں؟"

"تمھارا الگ رہنا ہی بہتر ہے۔ اوّل تو تمھارا رُوپوش رہنا ضروری ہے۔ کسی کو شُبہ بھی ہو گیا کہ تم لائیڈز کاٹیج سے زندہ بچ نکلے ہو تو سارے وسائل تمھاری بازیابی پر مرکوز کر دیے جائیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ تمھارے لیے ملک سے باہر نکلنا ہی ناممکن ہو کر رہ جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان تینوں کا صفایا ہونے تک تم کو مارٹن کی جگہ لینا ہے۔ باہر سے رابطہ قائم کرنے والوں کو فون پر مارٹن کی آواز آتی رہنی چاہیے تاکہ صورتِ حال جُوں کی تُوں برقرار رہے' اس کے غائب ہوتے ہی ان تینوں میں سے کوئی ساری ذمّے داریاں سنبھال لے گا، جب کہ میں انھیں نئے سرے سے منظم ہونے کا موقع دیے بغیر وار کرنا چاہتی ہوں۔"

"یعنی اب مجھے مارٹن کی وھیل چیئر پر سوار ہونا پڑے گا؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یہ بہت مناسب رہے گا۔ دن میں ایک آدھ بار وھیل چیئر پر برآمدے وغیرہ کا چکر لگا لو گے تو باہر سے دیکھنے والوں کو اندازہ نہیں ہو سکے گا کہ مارٹن کی جگہ کسی اور نے لے لی ہے۔ تمھاری جسامت اُس سے خاصی ملتی جلتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح ہم کئی دشواریوں سے بچ سکیں۔"

وہ کچھ دیر تک نئے لائحہ عمل کی جزئیات پر تبادلۂ خیال کرنے کے بعد کار کے عقبی پائیدان میں چھپ کر سلطان شاہ کے

فیاض الرحمٰن قادری

وہ دونوں ایک بار اچانک ملے، ایک دوسرے کو دیکھا، پسند کیا اور پھر ایک دوسرے کو حاصل کرنے کی تگ و دو میں مصروف ہو گئے۔

دو محبت کرنے والوں کی ایک مختصر اور حسین کہانی

وہ لڑکی ایک کونے میں کھڑکی کے قریب بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے کتاب بند کر کے سیٹ پر رکھ دی، اور کھڑکی کی طرف منہ کر کے باہر دیکھنے لگی۔ میرے پاس بھی چند کتابیں تھیں۔ میں نے ایک کتاب اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "کیا آپ یہ کتاب پڑھنا پسند کریں گی؟"
اُس کے ہونٹوں پر ایک حسین مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے مجھ سے کتاب لے لی۔ جب اُس نے کتاب کے ٹائٹل پر نظر ڈالی تو میں نے محسوس کیا کہ اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا ہے۔ اُس کے چہرے سے ایسا ظاہر ہو رہا تھا جیسے میں نے اُس کے ہاتھوں میں کسی کتاب کے بجائے بچھو تھما دیا ہو۔ "شاعری!" اُس نے دہشت زدہ لہجے میں کہا۔ "نہیں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ میں شاعری کی اتنی کتابیں پڑھ چکی ہوں جو میری پوری زندگی کے لیے کافی ہیں۔"

میں نے اُس سے کتاب واپس لے لی۔ "اگر آپ کو شاعری پسند نہیں ہے تو اتنی زیادہ شاعری کی کتابیں پڑھنے کی ضرورت نہیں تھی۔" میں نے کہا۔

"مجھے نہیں پڑھنا چاہیے تھا؟" اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "دیکھیے میں اس کی وجہ بتاتی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ میں کیٹی سے شروع کروں۔"

"کیٹی؟"

"ہاں کیٹی۔ یہ اس لڑکی کا نام ہے جو میرے ساتھ دفتر میں کام کرتی تھی۔ اس بے چاری کو شاعری سے بے انتہا لگاؤ تھا۔ ایک دن اُس نے لنچ کے وقفے میں مجھ سے کہا کہ اُسے دفتر میں کچھ اضافی کام کرنا ہے۔ اس لیے میں اُس کی ایک کتاب پبلک لائبریری کو واپس کر دوں اور اُن سے ایک کتاب لے لوں جو انھوں نے اُس کے لیے سنبھال کر رکھی ہو گی۔ میں نے اُس کے کہنے کے مطابق عمل کیا۔ یہ نظموں کی ایک کتاب تھی۔ ٹائٹل بے حد خوبصورت تھا۔ کتاب کی بیرونی جاذبیت سے میں کچھ مسحور سی ہو گئی تھی۔ اس لیے میں نے کتاب کی ورق گردانی شروع کر دی۔ فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے میں کتاب دیکھ رہی تھی کہ کسی نے پیچھے سے کہا۔ "ایکسکیوز می۔" میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ ایک لمبا، وجیہہ اور پرکشش شخصیت کا..... جوان شخص تھا۔ ظاہری طور پر اُس کی شخصیت ایسی تھی کہ کسی کمی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔

"آپ کو یہ کتاب پڑھتے ہوئے دیکھ کر میں بہت خوش ہوا ہوں۔" اُس نے کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ جیسی شخصیت کو یہ کتاب پڑھتے ہوئے دیکھ کر یوں محسوس ہو رہا ہے کہ یہ کوئی اہم تخلیق ہے۔ خود کتاب کی شان کچھ بڑھ گئی ہے۔ میں نے ہی یہ کتاب لکھی ہے۔"

اس کا سراپا میرے سامنے تھا۔ میں یہ تسلیم نہیں کر سکتی تھی کہ وہ شاعری کی پتلی پتلی کتابیں لکھنے والا شاعر ہے۔ ہاں اگر وہ یہ کہتا کہ وہ باکسنگ کا چیمپئن ہے، قومی ٹیم کا فاسٹ باؤلر ہے یا یہ کہ وہ اسسٹنٹ فلموں کا ہیرو ہے تو میں کسی شک و شبے کا اظہار کیے بغیر اس کی بات کو تسلیم کر لیتی۔ میں نے صرف ایک نظم پڑھی تھی۔ اُس میں اُس نے زندگی کو ڈوبتے سورج کی کرنوں سے تشبیہ دی تھی۔ میں کیسے تسلیم کرتی کہ زندگی اور زندہ دلی سے بھرپور نظر آنے والا وہ شخص ایک مایوس شاعر ہے۔

"کیا آپ نے میری کوئی اور بھی کتاب پڑھی ہے؟" اُس نے پوچھا۔

اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ مجھے فوراً ہی یہ جواب دے دینا چاہیے تھا کہ میں نے اُس کی کتاب نہیں پڑھی ہے۔ لیکن میں اُس کی شخصیت سے متاثر ہو گئی تھی۔ مجھے فوراً ہی کوئی ایسا جواب دینا تھا جو اُس کے لیے خوشگوار ہوتا اور اس بات کا بھی امکان ہوتا کہ وہ مجھ میں بھی دلچسپی لے۔ "میں نے آپ کی پچھلی کتاب پڑھی ہے۔" میں نے جھوٹ بولا۔ "مجھے وہ کتاب اتنی پسند آئی کہ میرے دل میں یہ خواہش ہوئی کہ میں آپ کی دیگر کتابیں پڑھوں۔ اسی وجہ سے میں آج یہ کتاب لے جا رہی ہوں۔"

اُس کا چہرہ کھل اُٹھا تھا۔ اُس کے چہرے پر رقصاں خوشی قابلِ دید تھی۔ "میرا خیال ہے کہ آپ کا تعلق وِنٹر ادبی گروپ سے نہیں ہے۔"

میں اس بار جھوٹ نہیں بول سکی۔ میں نے نفی میں گردن ہلا دی کیونکہ میں نے اس گروپ کا نام آج پہلی دفعہ سُنا تھا۔

"یہ شاعروں کی ایک تنظیم ہے۔ یہاں شاعری کے جدید رجحانات پر بحث کی جاتی ہے۔" اُس نے مجھے بتایا۔ "کل اس کی ماہانہ میٹنگ ہونے والی ہے۔ آپ بھی اس میٹنگ میں میرے ساتھ شرکت کیجیے۔ مجھے بے حد خوشی ہو گی۔"

اس سے پہلے بھی مختلف مواقع پر مجھے مختلف دعوتیں ملی تھیں لیکن یہ دعوت ایسی تھی جسے میں رد نہیں کر سکتی تھی کیونکہ اس میں شاعری سے میری دلچسپی کو ملحوظِ خاطر رکھا گیا تھا۔ اس دلچسپی کا انکشاف آج سے پہلے نہیں ہوا تھا۔ "آپ کی دعوت کا شکریہ۔" میں نے کہا۔ "میں یقیناً آپ کے ساتھ چلوں گی۔"

جب میں دفتر واپس پہنچی تو میں اینڈریو کے سحر سے نکل چکی تھی۔ جی ہاں اُس شاعر کا نام اینڈریو ہی تھا۔ میں نے لنچ کے وقفے میں پیش آنے والے واقعات پر غور کیا تو مجھ پر کپکپی طاری ہو گئی۔ اگلے روز شام کے وقت ہونے والی میٹنگ سے پہلے جدید شاعری کے بارے میں مجھے کافی معلومات اکٹھی کرنا تھی اور اس کے رجحانات کے بارے میں اپنی ایک رائے قائم کرنا تھی۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں اینڈریو کو یہ بات معلوم ہو جاتی کہ میں نے اس سے جھوٹ بولا ہے۔

"میں نے کیٹی سے اس موضوع پر بات کی لیکن اس بات کا خیال رکھا کہ وہ معاملے کی تہ تک نہ پہنچ سکے۔ اُس نے مجھے دو ایسی کتابوں کے نام بتائے جن سے مجھے موضوع کی مناسبت سے کافی مواد مل سکتا تھا۔ میں پھر لائبریری گئی اور وہاں سے دونوں کتابیں حاصل کیں۔ لائبریری سے نکلتے ہی میں نے مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ آپ یقین کریں، میرا یہ مطالعہ آدھی رات تک جاری رہا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اگر کوئی مرد نظر میں آ جائے تو عورت اس کے لیے کیا کچھ کر سکتی ہے۔ میں نے وِنٹر ادبی گروپ کی میٹنگ سے پہلے کافی کچھ پڑھ لیا تھا۔ اب میں کسی بھی شخص کو آسانی سے یہ بتا سکتی تھی کہ مشہور شاعر براؤننگ سے جدید شعرا کس حد تک متاثر ہوئے ہیں۔

"لیکن مجھے اپنی معلومات کو استعمال کرنے کا موقع نہیں ملا کیونکہ ادبی گروپ کے اراکین جن کی تعداد درجن بھر سے زائد نہ تھی، آپس میں گفتگو کرنے میں اس قدر مصروف تھے کہ کسی اور کی بات سُننے کے لیے اُن کے پاس وقت ہی نہیں تھا۔

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اینڈریو مجھ سے بے حد خوش تھا۔ مجھے گھر پر ڈراپ کرتے وقت اُس نے یہ تجویز پیش کی کہ اتوار کے دن میں اُس کے ساتھ مضافات کی طرف چلوں وہ سرے میں ایک ایسے پب سے واقف ہے جہاں بہترین چائے دستیاب ہے۔

ہم دونوں سرے گئے۔ واقعتاً اُس چھوٹے سے پب کی چائے انتہائی فرحت انگیز تھی۔ ہم نے ایک خوشگوار دن گزارا۔ میرے لیے یہ زندگی کا خوشگوار ترین دن ثابت ہو سکتا تھا اگر وہ تمام وقت شاعری کے متعلق باتیں نہ کرتا رہتا۔ اس موضوع پر اس کی گفتگو اکتا دینے والی تھی۔ نہ اُس نے میرے نئے سوٹ کی کوئی تعریف کی اور نہ مجھ سے کوئی ذاتی سوال کیا۔ بس تمام وقت شاعری اور صرف شاعری پر بات ہوتی رہی۔

جب میں گھر پہنچی تو..... یہ غور کر رہی تھی کہ کیا اس کا کچھ صلہ بھی ہے۔ پھر میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ مجھے صلہ ملنا چاہیے۔ میں یہ محسوس کر رہی تھی کہ اینڈریو میری زندگی میں آ چکا ہے اور جب بھی اُس کا خیال آتا ہے، دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے۔ اب میری زندگی کا مشن یہ تھا کہ اُسے اپنی زندگی بنا لوں۔ میں نے شاعری کا مطالعہ تیز تر کر دیا تاکہ میں اُس کے معیار پر پہنچ کر اُسے حاصل کر لوں۔ جب میں شاعری کی کتاب پڑھتے پڑھتے تھک جاتی تو دل میں یہ خواہش جاگتی کہ میں کوئی خوبصورت سی جاسوسی کہانی پڑھ لوں کہ مجھے جاسوسی کہانیوں سے عشق تھا۔

بلاشبہ اینڈریو مجھ پر بے حد مہربان تھا اور بھرپور توجہ مجھے حاصل تھی۔ وہ مجھے لنچ پر لے جانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتا جس طرح وہ پھولوں کے گلدستے اور چاکلیٹ کے پیکٹ میری نذر کرتا، اُس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ اُس کی شاعری سکوں کے معیار پر بھی کھری ہے۔ ہم ایک ساتھ جاز کی محفلوں اور نمائشوں میں گئے۔

ان جگہوں پر جانے کا انتخاب ہمیشہ اینڈریو ہی کرتا۔ ان جگہوں پر گھوم پھر کر یہ احساس ہوا کہ لندن میں دانشور اپنی دانشوری کا بھرم رکھنے کے لیے تفریحات کے لیے بھی خشک چیزوں کا انتخاب کرتے ہیں۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور اسی قسم کی فضولیات میں ضائع ہو رہا تھا۔ وہ مجھ پر مہربان تھا لیکن میں اُس سے جس قسم کی توجہ کی طالب تھی، وہ مجھے اب تک میسّر نہیں ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں مایوسی کے بادلوں میں پوری طرح گھر جاتی، مجھے اُمید کی ایک کرن نظر آئی۔ ایک ایسا موقع ملا تھا جس سے اپنے مسئلے کو حل کر سکتی تھی۔

اینڈریو اب مجھے اکثر ادبی محفلوں اور مذاکروں میں ساتھ لے جاتا تھا۔ ایک دن اُسے اپنے پبلشر کی طرف سے ایک دعوت موصول ہوئی۔ یہ ایک بال پارٹی کی تقریب تھی۔ اینڈریو نے مجھے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ اس سے پہلے میں اینڈریو کے ساتھ کسی رقص کی محفل میں شریک نہیں ہوئی تھی۔ میں نے ہامی بھر لی کیونکہ یہ ایک ایسی محفل تھی جہاں میں ایک عورت کی حیثیت سے بھرپور طریقے سے اس کی نگاہوں میں آسکتی تھی۔ اُس کے دل میں اپنے لیے گدگدی پیدا کر سکتی تھی۔ یہ ایک ایسی محفل تھی جہاں مجھے اُس کی نظموں کے سامع کی حیثیت سے شریک نہیں ہونا تھا بلکہ مجھے وہاں اُس کی نگاہوں کا مرکز بننا تھا۔

اپنے آپ کو حسین اور مرکزِ نگاہ بنانے کے لیے میں نے جس قسم کے لباس، میک اَپ اور اداؤں کا انتخاب کیا تھا، اگر میں ان کے بارے میں چھ ماہ قبل سوچتی تو شرما جاتی لیکن میں کیا کرتی۔ میں بے حد اُلجھی ہوئی تھی۔

پارٹی میں مجھے اپنے حصّے کی توجہ حاصل ہوئی اور ہاں اینڈریو نے بھی صرف ایک بار پھٹی پھٹی نگاہوں سے مجھے دیکھا لیکن اس کے علاوہ اس کی طرف سے کسی اور غیر معمولی جذبے کا اظہار نہیں کیا گیا۔ حسبِ معمول وہ ایک لااُبالی سا شاعر تھا۔

ڈنر کے بعد میں اُسے باہر لان کے ایک تنہا گوشے میں لے گئی۔ میں نے تہیّہ کر لیا تھا کہ اگر وہ باہر کی مدھ بھری ہوا، چاند کی دودھیا روشنی اور سب سے بڑھ کر میرے ہوش رُبا قرب میں بھی نہیں پسیجا تو میں اپنے دل کا دروازہ بند کر لوں گی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اُسے بھول جاؤں گی۔

گفتگو کا آغاز ہوا۔ مجھے تمام باتیں اچھی طرح یاد ہیں۔ وہ بائرن، شیلے وغیرہ کی باتیں کرتا رہا۔ ان شاعروں کے حوالے سے بات کرنے کے لیے اُسے کسی تحریک کی ضرورت نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ایک خود کار نظام کے تحت ان شعرا کے حوالوں سے بات کرتا ہے۔ میری اُمید اب دم توڑ رہی تھی کہ اُس نے میرے کاندھے پر اپنا ہاتھ رکھا۔ میرے پورے جسم میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ کچھ اُمید بندھی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور جانتے ہیں اُس شاعرِ بے مثل نے کیا کہا۔ اُس نے کہا: "دیکھو یہاں کافی ٹھنڈ ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بیمار پڑ جاؤ اور جمعہ کو ہونے والی ادبی گروپ کی میٹنگ میں شریک ہونے سے محروم رہ جاؤ۔"

میرے غصّے کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ میں اُس کے بالکل قریب کھڑی ہو گئی اور تقریباً چیختے ہوئے بولی: "تمھیں تمھارا گروپ مبارک، تمھیں اپنی شاعری مبارک، مجھے ان چیزوں سے کوئی سروکار نہیں۔ میں ان چیزوں کو ایک لمحے کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتی۔" اور پھر میں دندناتی ہوئی گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔

اینڈریو تقریباً دوڑتا ہوا میرے پیچھے لپکا اور میرا بازو تھام کر بولا: "کیا تم نے صرف میرے لیے شاعری کے عاشق کا روپ بھرا ہوا تھا؟"

"ہاں ہاں، صرف تمھارے لیے۔" میری آواز ابھی تک تیز تھی "میرا بازو چھوڑو، مجھے جانے دو۔"

"اوہ! غضب خدا کا، میں بے وقوف شخص صرف تمھاری خاطر شاعری کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھا۔ مجھے تو شاعری سے چڑ ہے۔" وہ بھی تقریباً چیختے ہوئے بولا۔ اُس کی آواز پر خوشی کا عنصر غالب تھا۔ میں حیرت زدہ سی اُسے گُم صُم تکتی رہی۔ چند لمحے بعد پھر میں گڑبڑاتے ہوئے بولی: "لیکن وہ تمھاری شاعری اور تمھاری نظموں کی کتابیں۔ یہ سب کچھ کیا ہے؟"

"یہ ایک مجبوری ہے۔" وہ بولا: "میری ایک آنٹی ہیں۔ کچھ خبطی سی ہیں۔ وہ میرا ادبی مستقبل دیکھنا چاہتی ہیں۔ اُن کے پاس کافی دولت ہے اور وہ یہ دولت میرے نام صرف اس صورت میں کریں گی کہ میں سال بہ سال نظموں کی ایک کتاب لاتا رہوں۔ اور تم جو میرا یہ کرّوفر دیکھ رہی ہو، وہ شاعری کی دین نہیں ہے بلکہ..." وہ بولتے بولتے رُک گیا۔

"بلکہ میں ایک دوسرے قلمی نام سے جاسوسی کہانیاں لکھتا ہوں۔" اور اُس نے مجھے اپنا قلمی نام بتایا۔

"میرے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی، کیونکہ یہ نام میرے پسندیدہ رائٹر کا تھا۔" اتنا کہہ کر کھڑکی کے قریب بیٹھی ہوئی وہ لڑکی خاموش ہو گئی۔ کچھ دیر بعد وہ شوخ لہجے میں بولی: "اب ہمیں اس بات کا فیصلہ کرنا ہے کہ ہمیں اپنے پہلے بچّے کا نام شیلے رکھنا ہے یا شرلاک؟"

POET AMONG THE SELUTHS
L.S.Howarth.

شیخ
ابوعثمان سلام مغربی

ضیاء تسنیم بلگرامی

نازونعم میں زندگی گزارنے والا امیرزادہ، دُنیا اور علائقِ دنیا سے بے نیاز اور غافل شکاری کُتّوں میں بہت خوش رہتا تھا۔ اس کے لیے زندگی اور دنیا میں بڑی کشش تھی لیکن جب اس کو کسی تارکِ دُنیا نے یہ بتایا کہ وہ سراب کے پیچھے بھاگ رہا ہے اور جو چیز اُسے سونا نظر آرہی ہے وہ کچھ اور ہی ہے، اس میں گریز پیدا ہوا اور پھر تو سوچ اور غور و فکر کے لاتعداد دروازے کھل گئے۔ کُتّے نے اس کی رہنمائی کی اور اس کو ایک ایسے موڑ پر لا کھڑا کیا جہاں دُنیا تھی تو ضرور مگر اپنی دل کشی سے محروم۔ جنگلوں، پہاڑوں کی خاک چھاننے والا جب تیس سال بعد اپنے گھر کے بجائے خُدا کے گھر میں داخل ہوا تو ایک بے بدل صوفی دُنیا کے سامنے آیا۔ دلچسپ واقعات، عبرت ناک حالات۔

افریقہ کے مشہور شہر قیروان کو حسّان بن نعمان نے فتح کیا اور اس شہر کو اسلامی عساکر کی چھاؤنی بنا دیا۔ یہاں مسلمانوں نے آباد ہونا شروع کر دیا اور آخر کار یہ شہر بھی کوفہ اور بصرہ کی طرح ہمیشہ کے لیے مشہور اور اہم قرار پایا۔ یہیں کے ایک قصبے کوکب میں ایک مسلمان خاندان خوشحال زندگی بسر کر رہا تھا۔ یہ لوگ عرب تھے لیکن اپنے آبائی وطن کو خیرباد کہہ کے یہاں آباد ہو گئے تھے۔ آس پاس مقامی لوگ آباد تھے، ان میں سے بعض مسیحی تھے اور اکثر افریقی قبائلی بُت پرست لیکن آہستہ آہستہ اسلام کی طرف مائل ہوتے جا رہے تھے۔ ان کی زندگی بڑی دشوار تھی۔ جانوروں کا شکار، باہمی جنگ و جدل اور مسلمانوں سے معرکہ آرائیوں نے انھیں بلا کا چست و چالاک کر دیا تھا۔ اس ماحول میں آباد عرب مسلمان خاندان بھی بہت ہوشیار اور خبردار رہتے تھے۔ مذکورہ بالا عرب مسلمان خاندان اپنی اولاد کو ہمیشہ یہی بتاتا رہتا تھا کہ یہاں رہنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنے بازوؤں کی قوت پر بھروسا کرے۔ سراسر حکومت پر انحصار خطرناک بھی تھا اور تباہ کن بھی۔ وہاں کے مقامی وحشی قبائل ان پر چوری اور دھوکے سے حملے کر دیا کرتے تھے اور جو وحشی عربوں کی تہذیب اور تمدّن کا اثر قبول کر رہے تھے وہ عربوں کے دوست اور ہم خیال بنتے جا رہے تھے۔

ایک جگہ بستی بسا کے بیٹھ جانا مزاج اور عادت کو یکسر بدل دیتا ہے، بدوی زندگی کی جفاکشی ختم ہو جاتی ہے اور حضری تن آسانی اُس کی جگہ لے لیتی ہے اور یہ عمل کچھ اتنا سست اور ناقابلِ محسوس ہوتا ہے کہ نسلوں بعد جب تبدیلی واضح ہو چکی ہوتی ہے تب کہیں اسے دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ کوکب میں رہ بس جانے والے عرب خاندانوں کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ جب وہ یہاں آئے تھے تو ان کے پاس زیادہ کچھ نہیں تھا لیکن جب وہ یہاں ٹھہر گئے، رہ بس گئے تو زندگی کے لوازمات میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ زمینیں قبضے میں آگئیں، پختہ مکانات اور قصر تیار ہو گئے، عہدے اور مناصب نے زندگی بھر کی آسائشیں مہیا کر دیں۔ ایک ایسے ہی خاندان میں سعید کی ولادت ہوئی، باپ کا نام سلام تھا اور سلام کی رسائی ..... قاہرہ تک تھی۔ باپ نے سعید کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ سعید کا رسا ذہن ہر بات بہ آسانی اور بعجلت قبول اور اخذ کر لیتا تھا۔ پڑھنا اور دوست احباب کے ساتھ گھومنا پھرنا ان کے بہترین مشاغل تھے۔ جب ذرا زیادہ سن و شعور کو پہنچے تو سیر و شکار میں وقت گزرنے لگا۔ ہم عمر دوستوں کا ساتھ ہوتا، تیز رفتار گھوڑے ہوتے اور جنگل اور اس کے جانور ہوتے، جانوروں کو بھگا بھگا اور دوڑا دوڑا کے مارنا ان کا بہت پُرلطف شوق تھا۔ شب و روز جنگلوں میں گزرنے لگے۔

اسی عالم میں قرب و جوار کے وحشیوں نے ان کی بستی پر حملہ کر دیا۔ کوکب والوں نے ان کا پامردی سے مقابلہ کیا لیکن وحشی اور شہری تربیتوں کے فرق نے کوکب والوں کو بہت نقصان پہنچایا۔ وحشیوں کو جان کی کوئی پروا نہ تھی مگر کوکب کے نسلی آباد کاروں کو اپنی زندگی کے ساتھ ساتھ ان تمام چیزوں کی فکر تھی جو سالہا سال کی کوششوں اور عرق ریزیوں سے حاصل کی گئی تھیں۔ سلام نے اپنے بیٹے سعید سے کہا کہ "ہتھیار سنبھال اور وحشیوں کا مقابلہ کر۔"

اس للکار پر سعید نے تلوار سنبھال تو لی لیکن ان کو اس کے استعمال کا کوئی خاص تجربہ حاصل نہیں تھا، اس لیے وحشی غالب آئے اور شہری پٹ گئے، مکانات پھونک دیے گئے اور انسانی جانوں کا اتنا اتلاف ہوا کہ جس نے دیکھا رو دیا۔ سلام بھی زخمی ہو گئے۔ ہتھیاروں کا زہر ان کے پورے جسم میں پھیلنے لگا اور زندگی کی طرف سے مکمل مایوسی کے بعد سلام نے اپنے نوجوان بیٹے کو اپنے پاس بلایا۔

سعادت مند بیٹا دم توڑتے باپ کی پائینتی کھڑا ہو گیا۔ باپ نے پوچھا "بیٹے سعید! کچھ پتا ہے کہ میں نے تمھیں کیوں بلایا ہے؟"

سعید کو اندازہ ہو گیا تھا کہ باپ کی حالت ٹھیک نہیں ہے اور یہ کسی وقت بھی ہمیشہ کے لیے ساتھ چھوڑ سکتے ہیں، پھر بھی تجاہل عارفانہ سے کام لیا اور کہا "مجھے کچھ پتا نہیں کہ آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے؟"

باپ نے کراہتے ہوئے کہا "بیٹے سعید! اب یہاں کی زندگی بہت دشوار ہو گئی ہے۔"

سعید نے جواب دیا "وہ تو میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔"

باپ نے سعید کو سمجھانے کی کوشش کی "یہاں کے مقامی لوگ ہمیں چین سے رہنے نہیں دیں گے۔ وہ ہم پر ہمیشہ حملے کرتے رہیں گے۔"

سعید نے تائید کر دی "اندازہ تو یہی ہو رہا ہے۔"

باپ نے جھنجلا کر متنبہ کیا "میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہاں وہی شخص رہ سکے گا جو وحشیوں اور جنگلیوں سے تابِ مقابلہ رکھتا ہو۔"

سعید کے لیے یہ کوئی نیا انکشاف نہیں تھا، جواب دیا "باوا جان! یہ بات تو مجھے بہت پہلے سے معلوم ہے۔"

باپ نے تیوریوں پر بل ڈالے اور پوچھا "اگر یہ بات ہے تو میں تم سے پوچھتا ہوں کہ کیا تم نے خود میں تابِ مقابلہ پیدا کی ہے؟"

سعید نے عاجزی سے عرض کیا "وہ کس طرح پیدا ہوگی، وہی تو میں جاننا چاہتا ہوں۔"

باپ نے جواب دیا "غور کرو کہ وحشیوں میں وہ کون سی چیز زیادہ ہے جس نے نبرد آزمائی اور جنگ جوئی میں ان کو تم پر فائز کر دیا ہے۔"

سعید غور کرنے لگا اور کچھ دیر بعد جواب دیا "وہ شہری نہیں ہوتے، ان کی ضروریاتِ زندگی محدود ہوتی ہیں اور ان کا کوئی خاص پُر آسائش ٹھکانہ نہیں ہوتا، وہ موت سے نہیں ڈرتے اور ہر وقت موت سے آنکھیں لڑانے کے لیے تیار اور مستعد رہتے ہیں۔"

باپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہو کر غائب ہو گئی "بے شک، بالکل صحیح تجزیہ ہے تمھارا۔ اب میں تم سے یہ کہوں گا کہ تم بھی ان جیسے بن جاؤ، تو صحیح مقابلہ ہو گا۔"

سعید نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا "لیکن یہ تو بہت دشوار ہے، ہم ان جیسے نہیں بن سکتے اور وہ ہمارے جیسے نہیں بن سکتے۔"

باپ کی فکروں میں اور اضافہ ہو گیا کہا "بے شک، لیکن اگر تم چاہو تو جفاکش بن جاؤ اور اُن جیسے بہادر کہلانے لگو۔"

سعید نے پوچھا "وہ کس طرح؟"

باپ نے جواب دیا "آسائشوں سے کنارہ کشی اور پُر صعوبت زندگی کا آغاز کر دو تو یہ کام آسان ہو جائے گا۔"

سعید کو باپ کی اس تجویز سے قطعی اختلاف تھا، لیکن اس اختلاف کا اظہار نہیں کیا، کہا "آپ نے جو کچھ فرمایا، میں اس سے کسی طور اختلاف نہیں کر سکتا لیکن پھر بھی یہ ضرور پوچھوں گا کہ آپ نے جو تجویز پیش کی ہے کیا اس پر عمل درآمد اتنا ہی آسان ہے جتنا آپ سمجھ رہے ہیں؟"

باپ نے غصے کا اظہار کیا "کیوں؟ یہاں ناممکن کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں، ہم جب یہاں آئے تھے تو بڑے جفاکش اور سخت خو تھے لیکن پھر نسلوں کے فرق اور عمل نے ہمیں پہلے جیسا نہیں رکھا اور ہم یہ ہو گئے جو آج ہیں۔"

سعید نے پوچھا "پھر باوا جان، اب آپ ہی بتائیں کہ ہم نسلوں کے اس فرق کو کس طرح دور کر سکتے ہیں؟"

باپ نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا "بس یہی تو مجبوری ہے جس پر ہم میں سے کوئی بھی قابو نہیں پا سکتا۔"

باپ کا انتقال ہو گیا اور سعید کے لیے نئی دنیا اور نئی بلاؤں کے نزول کا آغاز ہوا۔ اب باپ کا سہارا نہیں رہا تھا اور جو کچھ کرنا تھا سعید کو اپنے طور پر خود کرنا تھا۔ کچھ دن تو بڑی پریشانی رہی اور سعید کو قدم قدم پر مشکلات کا احساس ہوتا رہا۔ اب وہ سوچنے لگے تھے کہ کیا زندگی گزارنے کا یہی طریقہ ہے کہ انسان انسان کے خلاف نبرد آزما ہے؟ کیا زندگی کی آسائشوں کے لیے مفاہمت ضروری ہے؟ کیا زندگی کا پُر آسائش ہونا ضروری ہے؟ ان جیسے لاتعداد سوالات پیدا ہوتے رہے اور جواب کے لیے سعید کو پریشان اور فکر مند کرنے لگے۔

اسی عالم میں سعید نے ایک راہب کو دیکھا جو آبادی سے دور جنگل میں جانوروں کے درمیان رہ رہا تھا۔ اس نے سالوں سے انسانوں کی شکل تک نہیں دیکھی تھی، سعید شکار کے سلسلے میں اس جنگل میں داخل ہوئے تو اس عجیب و غریب شخص کو اکیلا دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔

راہب بھی انھیں اور ان کے ساتھیوں کو دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

سعید نے راہب کے پاس جا کے پوچھا "یہ یہاں آپ کیا کر رہے ہیں؟"

راہب نے پوچھا "کیا تم شہر سے آئے ہو؟"

سعید نے جواب دیا "ہاں میں شہر سے آیا ہوں، مگر کیوں؟ یہ کیوں پوچھا آپ نے؟"

راہب نے کہا "تم نے مجھ سے یہ پوچھا تھا کہ میں یہاں کیا کر رہا ہوں اور اب میں تم سے یہ پوچھ رہا ہوں کہ تم شہر میں رہ کے کیا کر رہے ہو؟"

سعید کو یہ شخص کچھ عجیب سا لگا، پوچھا "آپ کا دماغی توازن تو ۔ ۔ ۔ ۔"

لیکن وہ اپنی بات پوری نہ کر سکے اور راہب نے ان کا مطلب پا لیا، راہب نے پوچھا "کیا تم کو میرے دماغی توازن پر کسی قسم کا شبہ ہے؟"

سعید نے جواب دیا "شبہ تو نہیں ہے لیکن میں یہ ضرور سوچ رہا ہوں کہ آخر وہ کون سی خوبی یا بہتری ہے جس نے آپ کو اس ویرانے میں تنہا ڈال رکھا ہے؟"

راہب نے کہا "نوجوان! جو کچھ تم میرے بارے میں سوچ رہے ہو اپنے بارے میں سوچنے لگو تو تمھاری مشکل دور ہو جائے گی اور دل و دماغ رہنمائی حاصل کر لیں گے۔"

سعید کی ایک نئی سمت میں رہنمائی ہونے لگی تھی۔ راہب نے اپنی بات کی وضاحت میں کہنا شروع کیا "بات صرف اتنی سی ہے کہ یہ دنیا دل لگانے کی جگہ نہیں ہے، یہاں ہر طرف ترغیب اور تحریص کا جال بچھا ہوا ہے۔ دنیا کی آسائشیں انسان کو اپنی طرف بلاتی ہیں اور یہ سادہ لوح بڑی آسانی سے ان کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔ انسان، انسان کو ہلاک کرتا ہے اگر اس سے پوچھا جائے کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے تو اس سوال کا اس کے پاس کوئی ایک جواب نہیں ہو گا اور ہر جواب فضول اور لایعنی ہو گا۔ انسان یہ کیوں نہیں سوچتا کہ دنیا میں اس کا قیام چند روزہ ہے، پھر اس چند روزہ قیام میں اتنا زیادہ دل کیوں لگایا جائے کہ جان دینے میں دشواری پیش آئے۔ آدمی اگر یہ سوچ لے کہ خواہشات کے اس صحرا میں سراب کے سوا کچھ بھی نہیں، تمنائیں کہیں بھی ختم نہیں ہوتیں، آرزوئیں کہیں بھی بس نہیں کرتیں، اس لیے ان کے پیچھے دوڑنے بھاگنے کے بجائے اگر ان سے یکسر کنارہ کشی اختیار کر لی جائے تو آرام ہی آرام ہے، اطمینان ہی اطمینان ہے۔"

سعید کو اپنے دل و دماغ کے اندھیرے میں روشنی سی محسوس ہونے لگی۔ اس نے لمحہ بھر کے لیے سوچا، کیا یہ درست ہے؟ کیا یہ صحیح ہے؟

راہب، سعید کی اندرونی کشمکش سے واقف تھا۔ کہنے لگا "سوچو مت، یہ سوچ ہی مسائل پیدا کرتی ہے۔ تامّل اور تذبذب ہی سے خرابیاں آتی ہیں۔"

سعید نے جواب دیا "لیکن اے مردِ آزاد و بے نیاز! اللہ نے عقل اس لیے دی ہے کہ انسان اچھے بُرے پر غور کرے اور کسی مناسب فیصلے پر پہنچے۔ آپ نے جو کچھ کہا، میں اس کو من و عن قبول کرنے سے رہا۔ میں اس پر غور کروں گا اور میری سوچ سے جو نتیجہ برآمد ہوگا اس پر عمل کروں گا۔"

راہب نے ایک اور نکتہ ذہن نشین کرانا چاہا "تم مسلمان ہو اس لیے تم میری باتیں آسانی سے نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن جب یہ سمجھ جاؤ گے تو اپنے دین پر قائم نہیں رہ سکو گے۔ تم سمجھ دار نوجوان ہو اس لیے میرا خیال ہے کہ تم ایک بار جو سمجھ لو گے اس پر اتنی ہی قوت اور تیزی سے عمل پیرا بھی ہو جاؤ گے۔ میری دعا ہے کہ یسوع مسیح تمھاری رہبری فرمائیں۔"

سعید کے دوست راہب کی باتوں پر مسکراتے رہے۔ جب یہ لوگ وہاں سے چلے آئے تو سعید نے ان سے کہا۔

"آج سے سیر و شکار بند۔ جب واقعی زندگی چند روزہ ہے تو اس سے دل کیوں لگایا جائے۔"

ایک دوست نے سعید کو سمجھایا "بھائی سعید! یہ تم کو ہو کیا گیا ہے، تم مسلمان ہو کیا تم نے رسولِ مقبول ؐ کی وہ حدیث نہیں سنی جس میں آپ ؐ نے رہبانیت کی ممانعت فرمائی ہے۔ لا رہبانیت فی الاسلام۔ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔"

اس ذرا سے، مگر عظیم فقرے نے سعید کے دل میں ہلچل مچا دی اور راہب کی مسحور کن باتوں کا اثر زائل ہو گیا۔

گھر واپس آ کے سعید نے دنیا، زندگی اور معاملاتِ زندگی پر غور کرنا شروع کر دیا۔ وہ جتنا سوچتے، ان افکار کے سرے ایک ہی نتیجے پر ختم ہو جاتے، زندگی چند روزہ ہے، اس میں اتنے بکھیڑے کیوں مول لیے جائیں۔

باپ نے دولت اور جاگیر چھوڑی تھی اس لیے معاشی کوئی فکر نہ تھی۔ سعید نے کچھ عرصہ تو تذبذب میں گزارا اس کے بعد ان کے دوستوں نے انھیں سابقہ روش پر لانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ سیر و شکار کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوا، جو دوست سعید کی تند مزاجی کی وجہ سے دور ہو گئے تھے، پھر قریب آ گئے۔

اس روز وہ شکار کی تلاش میں بہت دور نکل گئے تھے۔ شکار مل تو گیا مگر سعید اپنی منزل پر تنہا رہ گئے تھے، اس وقت ان کے ساتھ ان کا وفادار کتا بھی تھا۔ یہ کتا ان کے شکار میں بڑی مدد کیا کرتا تھا اور جب رات کو وہ اپنے خیمے میں بے خبر سو جاتے تو ان کا وفادار کتا ان کی اور ان کے سامان کی نگہبانی کرنے لگتا۔

حویلی میں کتوں کے لیے ایک حصّہ وقف کر دیا گیا تھا، یہ سارے شکاری کتے تھے۔ سعید ان پر بڑی توجّہ دیتے تھے، ان کے کھانے پینے اور آرام کا بڑا خیال رکھتے، نوکروں کی بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ یہ نوکر جو ماضی میں غلام کہلاتے تھے، سعید کے مختلف کاموں پر تعینات تھے، کوئی کھانے پکاتا، کوئی حویلی کے دوسرے کام انجام دیتا، کوئی باہر کے کام کرتا رہتا، یہ سب اُن کا بڑا خیال رکھتے اور کسی بات کی شکایت کا موقع نہ دیتے۔

شکار سے تھکے ہارے حویلی میں داخل ہوئے تو خدمت گاروں نے ان کا سامان سنبھالا، گھوڑے کو اصطبل پہنچا دیا گیا اور شکار کے دوسرے سامان کو ان کی جگہ پر پہنچا دیا گیا۔ کتے کو دوسرے کتوں میں پہنچا دیا گیا۔

جب وہ رات کو بستر پر لیٹے تو معلوم نہیں کیوں وہ خود بخود مشغلۂ سیر و حاصلِ شکار کے بارے میں سوچنے لگے، یہ شکار جس میں دن بھر گھوڑے دوڑانے پڑتے ہیں، جانوروں کو نشانہ بنانا پڑتا ہے، خطرات مول لینا پڑتے ہیں، آخر ان کا حاصل کیا ہے؟ راہب کی باتیں ایک بار پھر یاد آنے لگیں۔

غلام ایک پیالے میں گرم گرم دودھ بھر لایا اور عرض کیا "حضورِ والا! دودھ حاضر ہے، نوش فرمالیں۔"

سعید نے جواب دیا "اس کو سامنے تپائی پر رکھ دو۔ اور جا کر آرام کرو، میں پی لوں گا۔"

غلام نے جاتے جاتے کہا "دودھ گرم ہے، ٹھنڈا کر کے پیجیے گا اور ہاں، دودھ کھلا ہوا ہے، اس کو فوراً پی لیجیے گا ورنہ اس میں کچھ پڑ جائے گا۔"

آپ نے جواب دیا "تو کیوں فکر کرتا ہے۔ میں نے کہہ جو دیا کہ پی لوں گا۔"

غلام چلا گیا، انھوں نے دودھ کے پیالے پر ایک نظر ڈالی اور پھر اچانک انھیں جنگل والا راہب یاد آ گیا، اس کی نصیحتیں اور آدم بیزاری یاد آنے لگی۔ وہ سوچتے سوچتے سو گئے۔ کافی دیر بعد آنکھ کھلی تو دیکھا، دودھ کا پیالہ اسی طرح دودھ سے لبریز رکھا ہوا ہے اور ایک شکاری کتا دروازے کے پاس بیٹھا ان کی طرف دیکھ رہا ہے۔

آپ نے دودھ کا پیالہ اٹھایا تو کتا غرّانے لگا۔ آپ نے پوچھا "کیا بات ہے، تو غرّا کیوں رہا ہے؟"

اور دودھ کا پیالہ دوبارہ تپائی پر رکھ دیا۔ کتے کی نظریں دودھ پر جمی ہوئی تھیں۔

آپ نے پیالہ دوبارہ اٹھایا تو وہ پھر غرّایا۔ پیالہ دوبارہ رکھ دیا گیا اور آپ نے ایک بار پھر وہی سوال کیا "کیا بات ہے؟ تو کیوں غرّا رہا ہے؟"

پیالہ ایک بار پھر تپائی پر رکھ دیا گیا۔ آپ سوچنے لگے کہ آج خلافِ معمول یہ کتا کیوں غرّا رہا ہے؟

کتے کی نظریں دودھ پر جمی ہوئی تھیں۔ آپ نے پیالہ پھر اٹھایا تو کتے نے اس بار زیادہ غرّاہٹ سے کام لیا، آپ نے کہا "یہ کیا مذاق کر رکھا ہے تو نے؟"

کتے کی غرّاہٹ جاری تھی۔ اس بار آپ نے اس غرّاہٹ کی بالکل پروا نہ کی اور پیالے کو ہونٹوں سے لگانا چاہا، کتا غرّایا اور چھلانگ لگا کے آپ کے سینے پر سوار ہو گیا، آپ کو غصّہ تو بہت آیا لیکن پھر یہ سوچ کر برداشت کر گئے کہ شاید کتا بھوکا ہے اور بھوک میں یہ اضطراری حرکت سرزد ہو گئی ہے۔

آپ نے دودھ کا پیالہ تپائی پر رکھ دیا اور کتے کو حکم دیا "دودھ پی لے۔ میں نہیں پیوں گا لیکن آئندہ خبردار جو ایسی ویسی کوئی حرکت کی؟"

کتا اپنی اگلی دونوں ٹانگوں پر تپائی سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور چپ چپ کر کے سارا دودھ پی گیا۔

آپ مسکرائے اور آہستہ سے کہا "تو یہ بات تھی، تو بہت بھوکا تھا۔"

کتا دودھ پی کر اپنی جگہ پر چلا گیا، آپ نے پوچھا "بس یا اور کچھ؟"

کتے نے محبت بھری نظروں سے آپ کی طرف دیکھا اور پختہ فرش پر لیٹ گیا۔ آپ نے محسوس کیا کہ کتے کو نیند آ رہی ہے وہ سو جانا چاہتا ہے۔

کچھ دیر بعد کتا واقعی سو گیا۔ آپ نے اس کو آواز دی اور پوچھا "کیا بات ہے؟ یہ آج تو سو کیوں گیا؟ کیا پہرہ نہیں دے گا؟"

کتے کی طرف سے کوئی آواز نہیں آئی اور نہ ہی اس نے اپنی دُم کو حرکت دی۔

آپ کو فکر لاحق ہو گئی اور کتے کے پاس جا کے دریافت کیا "کیا بات ہے، یہ آج تو بے وقت کیوں سو رہا ہے؟"

کتے میں ذرا سی جنبش تک نہ ہوئی۔ آپ کو اس کی فکر لاحق ہو گئی اور اس کے پاس بیٹھ کے اس کو ہلایا "یہ آج تجھ کو ہو کیا گیا ہے؟ یہ تو بے سُدھ کیوں ہو رہا ہے؟ خیریت تو ہے؟"

کتے میں ذرا سی جنبش بھی نہ ہوئی وہ بدستور بے سُدھ پڑا رہا۔

اب تو آپ کو کچھ زیادہ ہی فکر ہو گئی اور اس کی سانسوں پر توجّہ دی۔ وہ سانس بھی نہیں لے رہا تھا۔

آپ کا دل دھک دھک کرنے لگا، کتا مر چکا تھا، یہ کیوں مر گیا؟ اس سوال نے ان کو ہلا کے رکھ دیا۔ دودھ والا پیالہ بالکل خالی ہو چکا تھا۔

رات کا وقت تھا۔ طاق میں روشن چراغ اتنی روشنی نہیں پھینک رہا تھا کہ اس سے پورے کمرے کا جائزہ لیا جاتا۔ آپ نے غلاموں کو آوازیں دے کر بلا لیا اور کتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ مر گیا، مگر کیوں مر گیا؟ سبب معلوم کیا جائے۔"

غلاموں نے بڑی بڑی مشعلیں روشن کیں اور کتے کا جائزہ لینے لگے۔

ایک غلام مشعل لیے ہوئے تپائی کے پاس گیا اور خالی پیالے کا جائزہ لینے لگا۔

آپ نے پوچھا "اس خالی پیالے میں کیا دیکھ رہا ہے؟"

غلام نے جواب دیا: "جنابِ والا! دودھ زہریلا تھا، اس زہر نے کتے کا کام تمام کر دیا۔"

سعید کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی، حیرت اور خوف کے ملے جلے جذبے سے پوچھا: "دودھ زہریلا تھا! کیا مطلب؟ دودھ میں زہر کس نے ملایا تھا؟"

غلام نے جواب دیا: "میں کیا کہہ سکتا ہوں، یہ دودھ کون لایا تھا؟"

اس غلام کو بھی بلوا لیا گیا جو دودھ کا پیالہ لایا تھا، جب اس کو یہ بتایا کہ دودھ زہریلا تھا اور اس دودھ نے کتے کا کام تمام کر دیا تو خوف کی وجہ سے اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اس نے کہا: "آقا! میں بالکل بے گناہ ہوں، میں نے دودھ میں زہر نہیں ملایا تھا۔"

آپ نے غلام کو تڑاتڑ کئی چھانپڑ رسید کر دیے اور کہا: "میں یہ فضول سا انکار نہیں سننا چاہتا ہوں، مجھ کو تو یہ بتا کہ تو نے ایسا کیوں کیا؟"

غلام زار و قطار رو رہا تھا: "میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں بالکل بے گناہ ہوں، ذرا سوچیے تو سہی کہ میں ایسا کیوں کروں گا؟"

آپ نے درشت لہجے میں کہا: "میں تیرا کوئی عذر نہیں سنوں گا اب تو بس یہ بتا کہ تو نے ایسا کیوں کیا؟ وہ کون سا لالچ تھا کہ تو اتنے خطرناک اور شرمناک فعل پر راضی ہو گیا؟"

غلام کی آنکھوں کے آنسو یہ بتا رہے تھے کہ غلام جھوٹ نہیں بول رہا۔

اچانک تپائی کے نیچے سے ایک سانپ نمودار ہوا اور باہر نکل گیا۔

اب زہر کا عقدہ حل ہو چکا تھا، دودھ کو زہر آلود سانپ نے کر دیا تھا اور شاید کتے نے سانپ کو دودھ پیتے دیکھ لیا تھا اور غالباً کتے نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ زہریلا دودھ اپنے مالک کو نہیں پینے دے گا اور وہ خود پی کر ہلاک ہو گیا۔

آپ کتے کے پاس گئے اور رقت زدہ لہجے میں کہا: "یہ تو نے کیا کر دیا؟ تو مجھ پر قربان ہو گیا، یہ تو نے کیا کر دیا۔"

اس رات آپ کو نیند تک نہیں آئی، کروٹیں بدل بدل کر رات گزار دی۔

صبح غلاموں کو اپنے آس پاس اکٹھا کیا اور ان سے پوچھا: "کیا تم جانتے ہو کہ اس وقت میں نے تم سب کو یہاں کیوں بلایا ہے؟"

کسی نے نفی میں گردن ہلا دی، ایک نے بہ آوازِ بلند جواب دیا: "ہم کہیں بھی رہیں، ہمیشہ آپ کو یاد کرتے رہیں گے، شاید آپ ہمیں غفلت کے جرم میں کوئی سزا دیں گے۔"

ایک نے کہا: "ہمیں بس اتنا معلوم ہے کہ رات دودھ میں زہر کی آمیزش سے ہمارا اعتبار جاتا رہا ہے۔ اس لیے اس وقت آپ جو کچھ کہیں، سنیں یا کریں گے وہ اس واقعے سے متعلق ہو گا۔"

آپ نے جواب دیا: "تیرا اندازہ درست ہے، دودھ میں زہر کس طرح شامل ہوا، یہ عقدہ بھی وا ہو چکا ہے، تم میں کوئی خطاکار نہیں، پھر تم میں سے کسی کو بھی کوئی سزا کیوں دی جائے۔ ہاں رات کے واقعے نے میرے اندر ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے، میرے وجود کو جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے، دنیا کی دلکشی اور زندگی کی کشش تو پہلے ہی کم ہو چکی تھی، اب رہی سہی کسر بھی پوری ہو چکی۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس حویلی کو خیر باد کہوں اور دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر کے سکون تلاش کروں۔"

اس اعلان نے غلاموں کو پریشان کر دیا۔ سب نے ایک ہی سوال کیا: "ہمارا کیا ہو گا؟ ہم کہاں جائیں گے؟"

آپ نے جواب دیا: "تم کہاں جاؤ گے، یہ فیصلہ تو تم خود کرو گے کیوں کہ تم سب میری طرف سے آزاد کر دیے گئے ہو، اب تم آزاد ہو۔"

اس اعلانِ آزادی سے غلاموں کو خوشی بھی ہوئی اور دکھ بھی ہوا، سعید ان سب کے لیے ایک رحم دل اور پرخلوص آقا تھے۔

ایک نے عرض کیا: "اس قیمت پر ہمیں آزادی نہیں چاہیے۔"

آپ نے جواب دیا: "لیکن میں اپنی اس حویلی اور جاگیر کو اپنے دوسرے رشتے داروں کے حوالے کر دوں گا، میں یہاں سے جا رہا ہوں۔"

ایک غلام نے پوچھا: "آپ کہاں جائیں گے؟"

آپ نے جواب دیا: "کچھ پتا نہیں، لیکن میں ترکِ آسائشات کے بعد اپنے آپ کو تلاش کروں گا اور یہ کوشش اس وقت تک جاری رہے گی جب تک کہ میں خود کو پا نہیں لوں گا۔"

غلام آزاد کر دیے گئے، حویلی اور جاگیر عزیزوں کے حوالے کر دی گئی۔

انھوں نے جنگل کی راہ لی اور وہیں عبادت و ریاضت میں مشغول ہو گئے، بار بار یہی خیال آتا کہ زندگی کا کچھ حاصل نہیں، لہو و لعب میں گزر جاتی ہے اور انسان گناہوں کا بوجھ لاد کر رخصت ہو جاتا ہے۔ آپ نے اپنے نفس کو زیادہ سے زیادہ تکلیف دینا اپنا شعار بنا لیا۔ جنگل سے ملحق پہاڑی سلسلہ تھا اور یہاں ایسے غار موجود تھے جن میں تارک الدنیا پناہ لیتے تھے اور خدا کی یاد میں مشغول ہو جاتے تھے۔ آپ نے بھی یہی کیا۔ کھانے کو یہاں کچھ بھی نہ تھا، جنگلی پھل تھے، گھاس تھی اور پتے تھے۔ درختوں کی جڑیں تھیں۔ یہی چیزیں آپ کی غذا بن گئیں، پینے کے لیے چشمے کا پانی تھا، رات کو ایسی نیند آتی کہ کسی بات کا ہوش ہی نہ رہتا۔ کچھ دنوں بعد آپ کو احساس ہوا کہ نیند بھی کوئی اچھی چیز نہیں۔ سونے سے نفس کو آرام ملتا ہے جو اچھی بات نہیں، اس لیے نیند سے بھی پیچھا چھڑانا چاہیے۔ لیکن کس طرح؟ یہ ضرور سوچنا تھا۔

کافی غور و فکر کے بعد نیند سے بچنے کی ترکیب بھی سوجھ گئی۔ آپ نے رات کو اپنے لیے ایک ایسے پتھر کا انتخاب کیا جو مختصر تھا اور پہاڑی کی چوٹی پر ٹکا ہوا تھا۔ آپ شام ہوتے ہی اس پتھر پر بیٹھ گئے۔ اس پتھر پر اونگھ جانے کا مطلب تھا کہ آدمی نیچے گر جائے۔ نشیب یہاں سے بہت زیادہ پستی میں تھا۔ پتھروں کی رگڑ اور ٹکراؤ ہی سے آدمی ریزہ ریزہ ہو جاتا۔ آپ جب پہلی بار اس پتھر پر بیٹھے تو بہت ڈر لگا لیکن یہ ڈر آہستہ آہستہ دل سے نکل گیا۔ اب آپ کے لیے شب بیداری بہت آسان اور اختیاری ہو گئی تھی۔ یہاں بیٹھ کر یادِ الٰہی میں ایسے مشغول ہو جاتے کہ پتھر، غار اور کسی اور خطرے کا احساس ہی باقی نہ رہتا۔

ایک بار پورے دن کی ریاضت اور محنت کے بعد جب آپ اس پتھر پر پہنچے تو تکان اتنی غالب آ چکی تھی کہ سو جانے کو جی چاہتا تھا۔ آپ پتھر پر بیٹھ کر غنودگی محسوس کرنے لگے۔ خطرے کا احساس اور نیند کا غلبہ آپس میں متصادم تھے۔

رات کے کسی حصے میں آپ کو نیند آ گئی، کچھ پتا نہ تھا لیکن جب ہوش آیا تو وہ یہ دیکھ کر پریشان ہو گئے کہ اب وہ اس پتھر پر نہیں تھے جس پر رات کو بیٹھے تھے اور ایک عرصے سے جس پر بیٹھتے چلے آ رہے تھے۔ یہ ایک دوسرا پتھر تھا، نسبتاً بہت کشادہ اور پہلے والے پتھر سے کئی سو ہاتھ نیچے۔ یہ یہاں لڑھک کر کس طرح آ گئے، کچھ پتا نہ تھا، جسم میں کہیں خراش تک نہیں آئی تھی۔ جیسے ان کو کسی نے گود میں لے کر اس پتھر پر بٹھا دیا ہو۔

اب تو آپ کے دل سے یہ خوف بھی نکل گیا۔

یہاں دوسرے تارک الدنیا درویشوں سے بھی ملاقاتیں ہوتی رہیں، یہ سب سے ملتے، ان سب سے باتیں کرتے اور کسی نتیجے پر پہنچنے کی سعی کرتے۔

ریاضت اور عبادت سے آپ کے دل میں نہ تو خوشی ہوئی اور نہ دکھ، اذیتوں کا احساس بھی برقرار رہا۔ آپ کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ ان کو یہاں کسی بات کا خیال تک نہیں۔

ایک دن ایک درویش نے آپ سے پوچھا" تو اس نوعمری میں یہاں کہاں آ گیا ؟"

آپ نے جواب دیا" کیا نوعمری اور کیا ادھیڑ عمری۔ میں اسی میں خوش ہوں۔ اس لیے آپ میری فکر نہ کریں"

درویش نے کہا" یہ عمر ترکِ دنیا کے لیے مناسب نہیں ہے۔ اس لیے اپنے گھر واپس جا"

آپ نے پوچھا" کون سے گھر ؟ کہاں ہے میرا گھر ؟"

درویش نے جواب دیا" وہ گھر جہاں تم پیدا ہوئے، وہ گھر جہاں تم پل بڑھ کے اتنے بڑے ہوئے۔"

آپ نے شکستہ دلی سے کہا" میرا کوئی گھر نہیں، میں تنہا ہوں، یہ دنیا رہنے کی جگہ نہیں"

درویش نے مشورہ دیا" درویشی میں نے بھی اختیار کی ہے اور میں نے بھی دنیا کو چھوڑ دیا لیکن میں جذباتی نہیں ہوں تمھاری طرح۔ تم نوجوان ہو اس لیے زیادہ جذباتی ہو لیکن جب یہ دور چلا جائے گا اور عمر اپنے انحطاطی دور میں داخل ہو جائے گی تو یہ جوش و خروش بھی سرد پڑ جائے گا۔ تم اس راستے پہ دوڑ کے مت چلو، ورنہ ٹھوکر لگے گی اور منہ کے بل ڈھیر ہو جاؤ گے"

آپ مایوس اور بد دل ہو رہے تھے، عاجزی سے پوچھا" پھر میں کیا کروں ؟ کہاں جاؤں ؟"

درویش نے جواب دیا" کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے، یہیں میرے ساتھ رہو اور یہ دیکھو کہ درویشی کس طرح کی جاتی ہے۔"

انھیں ایک سہارا مل گیا اور اس شخص کو اہم قیمتی سرمایہ سمجھ کے اس کے ساتھ رہنا شروع کر دیا۔

یہ درویش ان کا راہنما بن گیا۔

ان درویش کا نام حبیب مغربی تھا، یہیں دوسرے کئی درویشوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ ان میں ابوعمرو زجاج اور ابو یعقوب نہر جوری کے نام سرِ فہرست ہیں۔ ان کی رہنمائی میں کچھ وقت گزارا لیکن طبیعت کی بے قراری میں کوئی خاص فرق نہیں آیا۔

آپ نے اپنے سر پر آسمان کا سائبان دیکھا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ ابھی تک میں اپنے معبود کے زیرِ سایہ، امن و امان سے ہوں۔

آپ قدرت کی صناعی پر اس درجہ محوِ حیرت ہو جاتے کہ خود اپنا ہوش نہ رہتا۔ اسی حال میں آپ نے اپنے اندر ایک ایسی کیفیت محسوس کی جو پہلے کبھی نہیں پیدا ہوئی تھی۔ دل بھر آیا اور آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے، وہ اپنی سابقہ لہو و لعب کی زندگی پر غور کرتے اور سوچتے کہ میں نے زندگی کا کتنا بڑا حصہ فضول گنوا دیا۔

آپ کو بتایا گیا کہ سُکر کو تلاش کرو، مقاماتِ تصوف میں وہ مقام جو حیرت و دحشت، غایت بے خودی اور مدہوشیٔ عقل سے حاصل ہوتا ہے اور یہ چیزیں اس وقت حاصل ہوتی ہیں جب مشاہدۂ جمالِ معشوق کسی خاص نتیجے پر پہنچ جائے اور یہ کیفیت اور مقام اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک کہ انسان کو غیبت نہ حاصل ہو، غیبت ان معنی میں کہ دنیا نفس اور وہ خارج چیزیں جو اللہ اور انسان کے درمیان فتور اور دخل کا باعث بن رہی ہوں اور اس سلسلے میں آپ کو یہ اقرار کرنا پڑا کہ انھیں سکر حاصل نہ ہو سکا۔ وہ اس کوشش میں تیس سال تک جنگلوں اور پہاڑوں میں سرگرداں رہے پھر ایک دن ان کو اپنے دل کے کانوں میں ایک آواز سنائی دی۔

"اے سعید! یہ تو کہاں گم ہو گیا۔ راستہ دشوار اور لمبا ہے، یہ تو فروعات میں مستی کا متلاشی ہے۔ اور یہ بھی میرے اختیار میں ہے، جا، مخلوق سے ربط و ضبط قائم کر تجھ کو جو کچھ ملے گا وہیں ملے گا۔"

آپ نے پوچھا" میں کہاں جاؤں ؟"

جواب ملا" وہاں جہاں اللہ کا پہلا گھر ہے"

اسی وقت دل میں القا ہوا کہ یہ گھر مکۂ معظمہ میں ہے اور آپ اسی وقت مکۂ معظمہ روانہ ہو گئے۔ جنگلوں اور پہاڑوں کی سرگردانی نے آپ کی صحت برباد کر دی تھی۔ جسم کا گوشت گھل چکا تھا اور آنکھیں حلقوں میں چلی گئی تھیں۔ جب اس حال میں آپ مکۂ معظمہ میں داخل ہوئے تو وہاں اللہ کے نیک بندوں کو آپ کی آمد کا پہلے ہی علم ہو چکا تھا۔ آپ کو بھیانک شکل میں بھی پہچان لیا گیا اور مقامی مشائخین نے آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔

ایک صوفی نے پوچھا" شیخ! آپ نے جنگلوں اور پہاڑوں میں کتنا عرصہ گزار دیا ؟"

آپ نے جواب دیا" تقریباً تیس سال"

دوسرے صوفی نے حیرت سے پوچھا" یعنی تیس سال تک آپ نے کسی آبادی، کسی شہر کا منہ تک نہ دیکھا، آپ نے تو کمال کر دیا!"

کسی اور صوفی نے کہا" جناب! آپ سے پہلے تو کسی نے اتنی مشقت نہیں کی، آپ تو سب پر سبقت لے گئے۔"

ایک نے دریافت کیا" کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے اس سے حاصل کیا کیا ؟"

دوسرے نے کہا" اور یہ بھی کہ واپس کیوں آ گئے ؟"

انھوں نے ان سب کو ایک ہی جواب دیا" یہ سمجھ لیں کہ میں وہاں سُکر کی جستجو میں گیا تھا لیکن میں وہاں سُکر کی... مصیبت میں مبتلا ہو گیا اور مایوس اور عاجز ہو کر واپس چلا آیا۔ بس مختصراً یہ سمجھ لیں کہ میں جس حقیقت کی جستجو میں نکلا تھا اس کو کہیں بھی نہ پا سکا اور آخری دنوں میں میں نے یہ غیبی آواز سُنی کہ اے سعید! فروعات میں مستی کا تصور لاحاصل ہے، اس لیے میری مخلوق میں واپس جا اور میں اللہ کے بتائے ہوئے راستے پہ چل کہ اس کے خانۂ اوّل میں چلا آیا"

صوفیوں پر آپ کی باتوں کا بڑا اثر ہوا۔

آپ نے مکۂ معظمہ میں اقامت اختیار کی اور یہیں ذکر و فکر میں گزر بسر کرنے لگے۔

آپ کا رہن سہن بالکل فقیرانہ و عاجزانہ تھا، مکے کے اُمرا تمنا کرتے تھے کہ آپ ان سے ملیں، ان سے مدد لیں، ان کا کھائیں پئیں لیکن آپ نے ان سے نہ تو کوئی مدد مانگی نہ ان کی دعوت قبول کی اور نہ ان کو اپنے پاس ہی آنے دیتے۔

مکے کے ایک دولت مند نے آپ کو اپنے ہاں دعوت میں مدعو کیا۔ آپ نے اس کی دعوت کو مسترد کر دیا اور کہا" افسوس کہ میں کھانے پینے میں رزقِ حلال کو بڑی اہمیت دیتا ہوں"

دولت مند نے جواب دیا" میں خود بھی رزقِ حلال کا قائل ہوں۔ کیا آپ میری دولت کے بارے میں بدظنی کا شکار ہیں ؟"

آپ نے فرمایا" نہیں، دولت کے بارے میں میری ذاتی رائے یہ ہے کہ یہ عموماً اس وقت پیدا ہوتی ہے جب دوسروں کے حقوق غصب کیے گئے ہوں، خاص حالت کا میں ذکر نہیں کرتا"

دولت مند نے صفائی پیش کی" میری دیانت داری اور انصاف پروری سورج کی طرح ظاہر ہے۔"

آپ نے فرمایا" تب پھر یہ سمجھ لو کہ میں تمھاری دعوت اس لیے قبول نہیں کر رہا کہ میں خود نفسانی طور پر خواہش اور حرص کا شکار ہو گیا ہوں اور اس حالت میں کسی دولت مند کی دعوت قبول کر لینا خود میرے حق میں بہتر نہیں"

دولت مند مایوس ہو کر چلا گیا اور آپ نے حاضرین کو بطورِ خاص نصیحت کی" لوگو! جو شخص نفسانی خواہش اور حرص کی وجہ سے مالداروں کا کھانا کھاتا ہے اس کو نہ تو فلاح میسر آتی ہے اور نہ وہ اس سلسلے میں کوئی عُذر پیش کر سکتا ہے۔ ہاں مجبوری کی وجہ کا عُذر قبول کیا جا سکتا ہے۔ دوستو! یاد رکھو مخلوق کی طرف متوجہ ہو جانے والا اپنے احوال کو ضائع کر دیتا ہے"

ایک ارادت مند نے عرض کیا" حضرت! میں نے تو چند ایسے آدمی بھی دیکھے ہیں جو فقرا سے محبت منقطع کر چکے ہیں اور مال داروں سے محبت کرتے ہیں، ان کے بارے میں آپ کیا فرمائیں گے ؟"

آپ نے جواب دیا" ایسے لوگوں کے بارے میں میری یہ رائے ہے کہ ان کو اندھا کر دیا جاتا ہے"

ایک نے پوچھا" کیا کسی مرد کے مجاہدے سے قلب پاک ہو سکتا ہے ؟"

آپ نے جواب دیا" کیوں نہیں۔ بالکل پاک ہو سکتا ہے، اس کی مثال یوں سمجھ لو کہ کسی سے جیسے یہ کہا جائے کہ اس نالی درخت کو جڑ سے اکھاڑ پھینک جس کو یہ حکم دیا گیا ہے اس میں اتنی طاقت بھی ہے کہ وہ درخت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے لیکن اگر وہ اس خیال سے توقف کرتا ہے کہ جب مجھ میں قوت آ جائے گی، اس وقت میں اس کو اکھاڑ پھینکوں گا تو یہ

نزدیک یہ تصور ہی غلط ہے کیوں کہ وہ جس قدر توقف کرے گا خود کمزور ہوتا چلا جائے گا اور درخت قوی ہوتا چلا جائے گا۔"

آپ کی باتوں میں جو اثر تھا، اس نے سننے والوں کو آپ کا گرویدہ بنا دیا۔ ہر شخص کا یہی جی چاہتا کہ آپ بولتے رہیں اور وہ سنتا رہے۔

آپ نے مکہ معظمہ میں قیام کے دوران اُن کو بھی دیکھا جو اپنے دلوں میں دین اور دنیا کی یکساں محبت رکھتے تھے۔ آپ کو یہ لوگ اچھے نہیں لگے لیکن دل آزاری کے خیال سے ان کو ٹوکا بھی نہیں، لیکن آپ کا خاموش رہنا ہی مصیبت بن گیا۔ اور یہ خالص دنیا دار لوگ بڑھ چڑھ کے باتیں کرنے لگے۔

وہ آپ کے پاس بیٹھ کر بڑے بڑے دعوے کرتے رہتے، ایک شخص جو صوم وصلوٰۃ کا بہت پابند تھا مگر اس کے ساتھ ہی دنیا داری میں بھی اس کا کوئی جواب نہ تھا اس شخص نے آپ کے پاس بیٹھ کے اپنی تعریفیں شروع کر دیں "میرا کیا ہے میں تو اپنی آخرت اور عقبیٰ کی خاطر دنیا کو اس کی حد میں رکھتا ہوں خواہ کتنا ہی نقصان ہو جائے، میں اس وقت اس کی بالکل پروا نہیں کرتا جب نماز کا وقت آ چکا ہو، میں اس وقت تک کھانا نہیں کھاتا جب تک دس پانچ بھوکوں کا پیٹ نہ بھر دوں، میں اپنے ہمسائے کا کسی رشتہ دار عزیز کی طرح خیال رکھتا ہوں۔"

آپ نے اسے اپنی ستائش سے روکا "بس، اب بس بھی کر۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ تو یہ جو کچھ کہہ رہا ہے تیرے بارے میں دوسرے کہہ رہے ہوتے۔"

اس شخص کو غصہ آ گیا، بولا "اپنے بارے میں جتنا زیادہ میں جانتا ہوں دوسرے نہیں جانتے اس لیے مجھے خود بتانا پڑتا ہے کہ میں کیا ہوں۔"

آپ نے فرمایا "یہ بات غلط ہے، آئندہ کے لیے توبہ کر لے اور ان دعووں سے باز آ جا۔"

اس کو اور زیادہ غصہ آ گیا، بولا "میں کیوں باز آ جاؤں؟ میں نے کون سا گناہ کیا ہے جو اس سے باز آ جاؤں؟"

آپ نے جواب دیا "میری اس محفل میں ایسے لوگ بھی آتے ہیں کہ اپنے گناہگار ہونے کا برملا اظہار کرتے ہیں، میرے نزدیک وہ تجھ سے بہتر ہیں کیوں کہ گناہگار دعویٰ کرنے والے سے اس لیے بہتر ہوتا ہے کہ وہ اپنے گناہ کا اقرار کرتا ہے لیکن مدعی اپنے دعوے میں خود ہی اسیر رہتا ہے۔"

حاضرین کو آپ کی باتوں نے گرما دیا اور وہ دیر تک دل ہی دل میں لطف اندوز ہوتے رہے۔

آپ سے پوچھا گیا کہ "خدا تک رسائی کا کوئی راستہ ہے بھی یا نہیں؟"

آپ نے فوراً جواب دیا "صرف دو راستے ہیں، ایک تو یہ کہ آدمی نبی ہو، یعنی نبوت اور دوسری اتباعِ نبوت، لیکن نبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا، اتباعِ نبوت کا آج بھی موجود ہے اور قیامت تک موجود رہے گا۔ لوگو! یاد رکھو کہ اتباعِ نبوت طالبینِ حق کے لیے بہت ضروری ہے کیوں کہ اس کے بغیر واصل الی اللہ ہونا ممکن ہی نہیں۔"

آپ سے سوال کیا گیا "جو شخص خلوت اختیار کرنا چاہے اس کے لیے کیا ضروری ہے؟"

آپ نے جواب دیا "جو شخص خلوت اختیار کرنا چاہے اس کے لیے ضروری ہے کہ یادِ الٰہی کے لیے ہر شے کی یاد کو اپنے قلب سے خارج کر دے، اور رضائے الٰہی کا طالب ہو کر خواہشاتِ نفسانی کو ترک کر دے مگر جو ان چیزوں پر کاربند نہیں ہو سکتا اس کے لیے خلوت مصیبت بن جاتی ہے۔"

آپ کو اب کسی خادم کی ضرورت ہی نہیں پیش آتی تھی، ہر شخص آپ کی خدمت کرنا چاہتا۔ ایسا ہی ایک ارادت مند ہر وقت آپ کی خدمت میں موجود رہتا، آپ اس سے جب بھی یہ کہتے کہ تو یہاں کیوں رُکا ہوا ہے تو وہ آبدیدہ ہو جاتا اور کہتا، میں تو یہاں اپنی مرضی سے رہ رہا ہوں۔

آپ نے پوچھا "تجھ کو میرے پاس کس چیز نے روکا ہوا ہے؟"

اس نے جواب دیا "آپ کی ہر بات نے، آپ کا عمل، آپ کے قول، مجھے ان دونوں نے اپنا اسیر کر لیا ہے، میں ان کو چھوڑ کر اگر کہیں چلا بھی جاؤں گا تو بے چین اور بے قرار رہوں گا۔"

آپ نے پوچھا "تو میری باتیں بہت غور سے سنتا ہے؟"

اس نے جواب دیا "بالکل۔ کیا آپ مجھے آزمانا چاہتے ہیں؟"

آپ نے فرمایا "ہاں میں تجھ کو آزمانا چاہتا ہوں۔"

اس نے کہا "آپ ضرور آزمائیں، شوق سے آزمائیں۔"

آپ نے کہا "میری باتیں سُن کے تو خود بھی باتونی ہو گیا ہے؟"

اس نے جواب دیا "باتونی تو نہ کہیں آپ۔ البتہ باتیں اچھی کرنے لگا ہوں۔"

آپ نے فرمایا "میں تجھ سے ایک سوال کروں گا اور دیکھوں گا کہ تو نے کس حد تک میری صحبت سے فیض پایا ہے۔"

وہ بالکل تیار تھا، بولا "آپ کریں سوال۔ میں جواب دوں گا۔"

آپ نے پوچھا "بتا تیرا معبود کس حالت میں ہے؟"

اس نے جواب دیا "اس حالت میں جس حالت میں ازل میں تھا۔"

آپ نے پوچھا "وہ ازل میں کس حالت میں تھا؟"

خادم نے بلا جھجک جواب دیا "جیسا اب ہے۔"

آپ دم بخود رہ گئے۔ اور فرمایا "تیرا جواب درست ہے، میں اس جواب سے خوش ہوا اور میں تیرے مستقبل کو دیکھ رہا ہوں وہ بہت شاندار ہے۔"

خادم نے جواب دیا "میں ہمیشہ آپ کی دعاؤں کا متمنی رہتا ہوں۔"

آپ اس کو دعائیں دیتے رہے اور وہ خوشی سے آپ کے چہرے پر نظریں جمائے دیکھتا رہا۔

آپ سے پوچھا گیا "دوستی کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟"

آپ نے جواب دیا "یہ کہ دوستی یہ ہے کہ انسان جو چیز اپنے لیے پسند کرتا ہے وہی اپنے دوست کے لیے پسند کرے۔"

"اگر دوست مہمان بن کر آ جائے تو؟"

آپ نے فرمایا "تو کیا، کچھ بھی نہیں، دوست گھر آئے یا تم اس کے گھر جاؤ تو اپنے دوست کی کسی چیز کی طمع نہ کرنا۔ اس کا عذر قبول کرو، اس کی سختی برداشت کرو۔ خود اس کا انصاف کرو، مگر اس سے انصاف ہرگز نہ چاہو۔ خود تو اس کی

اطاعت کرو، مگر اس کی اطاعت نہ چاہو، اپنی نیکی بھلا دو، مگر اس کی نیکی یاد رکھو۔"

ایک شخص آپ کے پاس آیا اور کہا "حضرت! مشہور حدیث ہے کہ اکثر اہل الجنت بے عقل ہوتے ہیں، اس کا کیا مطلب ہے؟"

آپ نے جواب دیا "یہ جنت والے لوگ اپنی دنیا کے لیے بے وقوف اور اپنے دین کے بارے میں باخبر ہوتے ہیں۔"

وہ شخص آپ کی وضاحت سے بے حد خوش ہوا، کہنے لگا "اس حدیث نے مجھے عرصے سے پریشان کر رکھا تھا آج دل کو سکون ملا اور حدیث کا اصل مفہوم سمجھ میں آ گیا۔"

آپ نے مکۂ معظمہ میں کافی وقت گزارا اور یہاں سے بغداد چلے گئے، بغداد کا ماحول ہی کچھ اور تھا۔ یہاں دنیا بھر کے منتخب لوگ موجود تھے، ہر فن، ہر علم اور ہر شعبے کے منتخب حضرات۔ بغداد آنے سے پہلے آپ کا خدا کے بارے میں خیال تھا کہ اللہ ذات ہے اور جنت میں ہے لیکن بغداد کے اہلِ تصوّف نے آپ کے خیال کی نفی کر دی اور کہا "اللہ ان چیزوں سے ماورا ہے، وہ ان قیود میں نہیں لایا جا سکتا۔"

عقیدے اور خیال کی اس اصلاح نے آپ کی کایا ہی پلٹ دی اور اپنے کسی دوست کو خط میں لکھا:

"میں بغداد آیا، یہاں کے مشائخین سے ملاقاتیں اور باتیں کیں اور بہت سی باتوں میں میں نے اپنی اصلاح کر لی اور اس طرح گویا میں از سرِ نو مسلمان ہو گیا ہوں۔"

بغداد میں زیادہ وقت نہیں گزارا اور نیشاپور چلے گئے، نیشاپور کیوں گئے، کچھ پتا نہ چل سکا مگر نیشاپور ہی کو اپنا وطن قرار دے لیا۔

بہت کچھ جاننے اور اس پر عبور رکھنے کے باوجود آپ کو ایک استاد، ایک مرشد کی ضرورت محسوس ہوتی رہی، مشہور شیخِ طریقت ابوعلی کاتبی سے بھی یہیں ملاقات ہوئی۔ ان کی صحبت میں اٹھنا بیٹھنا شروع کر دیا اور ابوعلی کاتبی سے انھوں نے بہت کچھ حاصل کیا۔ شیخ ابوالحسین صائغ دینوری نے انھیں اپنے دامنِ مریدی میں لے لیا۔

شیخ ابویعقوب نہر جوری، شیخ ابوعمرو زجاج اور شیخ حبیب مغربی ان کو تلاش کرتے ہوئے نیشاپور پہنچ گئے اور ان کے پاس ہی رہنے لگے، اور انہی لوگوں نے آپ کو بالاتفاق سیّد الوقت اور فرید المشائخ قرار دیا۔

ابوعمرو زجاج، شیخ حبیب مغربی اور شیخ ابویعقوب نہر جوری انہی کے پاس رہتے تھے۔ آپ نے انھیں کئی بار سمجھایا کہ میرے پاس مت رہو اور جہاں چاہو جاؤ لیکن ان تینوں نے آپ کا ساتھ نہیں چھوڑا اور اصرار کر کے ساتھ ہی رہے۔

آپ نے تینوں سے پوچھا "تم لوگ اپنے اپنے طور پر مجھ سے الگ کیوں نہیں ہو جاتے؟"

ابوعمرو نے جواب دیا "میں آپ سے الگ نہیں رہ سکتا، کیوں کہ آپ ہمیں ایسی باتیں بتاتے ہیں جو ہم اپنے طور پر نہیں جان سکتے۔"

آپ نے کہا "پھر بھی اگر تم مجھ سے علیحدگی اختیار کر لو تو تمھارے حق میں بہتر ہی ہو گا۔"

لیکن وہ تینوں آپ سے جدا نہیں ہوئے، اس طرح برسوں گزر گئے۔

آپ نے شادی کر لی اور اس طرح رسول اللہؐ کی ایک سنّت کو پورا کیا۔ جب بیٹا پیدا ہوا تو اس کا نام عثمان رکھا گیا۔ اور آپ اس کی کنیت کی وجہ سے ابوعثمان کہلائے جانے لگے۔ آپ کے ارادت مندوں نے شادی کے بعد بھی آپ کے معمولات میں کوئی فرق نہیں محسوس کیا۔

ابوعمرو زجاج نے اپنے دونوں ساتھیوں سے پوچھا "کیا آپ دونوں بھی وہی محسوس کر رہے ہیں جو میں محسوس کر رہا ہوں؟"

شیخ حبیب مغربی نے پوچھا "آپ کیا محسوس کر رہے ہیں؟"

شیخ ابویعقوب نہر جوری نے کہا "میرا خیال ہے، میرے دوست زجاج کا یہ خیال ہے کہ شادی کے بعد ابوعثمان دو حصوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ انھیں شادی نہیں کرنا چاہیے تھی۔"

ابوعمرو زجاج نے تائید کی "ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔"

پھر تینوں نے اس سلسلے میں آپس میں مشورہ کیا "شاید اب ہمیں یہاں سے چلا جانا چاہیے۔"

ابوعمرو نے پوچھا "اگر ہم اس چوکھٹ کو چھوڑ دیں تو جائیں کہاں، یہ بھی تو معلوم ہونا چاہیے۔"

شیخ حبیب مغربی نے جواب دیا "کہیں بھی۔ یہاں سے نکل کے سوچ لیں گے۔"

ابھی یہ صلاح مشورے جاری ہی تھے کہ تینوں نے ایک ہی خواب دیکھا۔ خواب میں کوئی ان سے پوچھ رہا تھا۔ "تم لوگ ابوعثمان کی چوکھٹ سے کب تک وابستہ رہو گے؟"

ابوعمرو نے پوچھا "اگر ہم ایسا نہ کریں تو کیا کریں، کہاں جائیں؟"

جواب ملا "تم لوگ ٹانگوں سے معذور نہیں ہو اور دنیا مختصر نہیں ہے کہیں بھی جا سکتے ہو۔"

شیخ حبیب نے کہا "مگر ہمارے یہاں رہنے میں کیا نقصان ہے؟"

جواب ملا "یہ نقصان کیا کم ہے کہ تم ابوعثمان کے قرب کی وجہ سے اپنے اللہ سے دور ہوتے جا رہے ہو۔"

جب یہ تینوں جاگے تو حیرت سے ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے کہ ابوعمرو نے پوچھا "کیا آپ دونوں نے آج رات کوئی غیر معمولی خواب دیکھا ہے؟"

پھر ان تینوں نے اپنے اپنے خواب بیان کیے۔ اور آپ کے پاس پہنچ کے عرض کیا "حضرت! رات ہم تینوں نے ایک ہی خواب دیکھا۔ اگر اجازت ہو تو عرض کر دیں۔"

آپ نے جواب دیا "اور یہ درست بھی ہے کہ تم تینوں آخر کب تک میری چوکھٹ سے وابستہ رہو گے؟"

اب تو ان تینوں کا بُرا حال ہو گیا۔

آپ نے ان تینوں کو سمجھایا "تم تینوں نے اپنے خواب میں جو کچھ دیکھا ہے اس سے سبق حاصل کرو اور مجھ سے الگ ہو جاؤ، آخر آپ لوگوں نے اپنے بارے میں کوئی تجویز تو سوچی ہو گی؟"

ابوعمرو نے جواب دیا "ابھی تک تو نہیں سوچی، کسی دن اس پر بھی غور کر لیں گے۔"

اس وقت تو بات اتنی ہی ہو سکی لیکن کئی دن بعد آپ برہنہ پا باہر نکلے اور ان تینوں سے کہا "تم تینوں نے خود ہی سُن لیا اور اب میں بھی یہی کہتا ہوں کہ یہاں سے چلے جاؤ۔ تم سب بھی اللہ کے ہو جاؤ اور مجھے بھی اس کی یاد میں مشغول رہنے دو۔"

آخر تینوں نے آپ کے پاس سے علیحدگی اختیار کر لی اور کہیں اور چلے گئے۔

ایک ارادت مند ہشاش بشاش آپ کے پاس آیا اور عرض کیا "حضرت! اس وقت میں آپ کے پاس اس لیے آیا ہوں کہ آپ مجھ سے کسی خواہش کا اظہار کریں اور میں اسے پورا کروں۔"

آپ نے جواب دیا "شاید تو نہیں جانتا کہ میں اللہ کے سوا کسی سے کچھ نہیں مانگتا۔"

آپ عید کے موقع پر مشہور صوفی ابوالفوارس کے گھر تشریف لے گئے۔ وہاں معلوم ہوا کہ ابوالفوارس محوِ خواب ہیں، انھوں نے معلوم نہیں کیوں یہ سوچا کہ اگر اس وقت کہیں سے گھی دستیاب ہو جائے تو اپنے اور اپنے دوستوں کے لیے کھانے کی کوئی چیز تیار کروں۔

لیکن اسی لمحے ابوالفوارس نے سوتے ہی میں آپ سے کہا "نہیں، کیا سوچ رہے ہو، گھی کا خیال اپنے دل سے نکال دو۔"

ابوالفوارس نے یہ بات تین بار ادا کی۔ آپ نے زیرِ لب فرمایا "بے شک ولی اللہ سوتے میں بھی بیدار رہتے ہیں۔"

جب وہ بیدار ہو گئے تو آپ نے ان کو گھی والی بات بتائی۔ ابوالفوارس مسکرائے اور کہا "اے ابوعثمان! اس وقت میں ایک عظیم الشان محل میں تھا اور دیدارِ الٰہی کا منتظر تھا لیکن اسی لمحے میں نے تمھارے ہاتھ میں گھی دیکھا تو حکم دیا کہ گھی کو پھینک دو۔"

آپ کے کسی مرید نے آپ سے دریافت کیا "میں ہمیشہ یہ سوچ کے خوفزدہ ہو جاتا ہوں کہ جب آپ ہم میں موجود نہ ہوں گے تو ہم لوگ کیا کریں گے۔"

آپ نے فرمایا "وہی کرنا جو کرتے رہتے ہو۔"

مرید نے کہا "مگر ہمیں کس طرح معلوم ہوگا کہ آپ ہم سے رخصت ہونے والے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا "جب تم اپنے آس پاس ویرانی محسوس کرو اور ہر طرف گرد و غبار اڑتا دکھائی دے تو سمجھ لینا کہ یا تو میں اس دنیا سے رخصت ہو گیا یا رخصت ہونے والا ہوں۔"

ایک نے پوچھا "مگر ایسا کیوں ہوگا؟"

آپ نے جواب دیا "اس روز فرشتے بھی میرا سوگ منا رہے ہوں گے۔"

مرید نے یہ بات دوسرے مریدوں تک پہنچا دی۔

اور جب آپ مرض الموت میں گرفتار ہوئے تو طبیبوں کو آپ کے پاس لایا گیا۔ آپ نے طبیبوں سے علاج نہیں کرایا اور کہا "مشیتِ ایزدی کو پورا ہو جانے دو، اس میں خلل نہ ڈالو۔"

ایک طبیب نے جواب دیا "ہم آپ کا علاج کرنے آئے ہیں، ہم خلل کیوں ڈالنے لگے۔"

آپ نے فرمایا "برادرانِ یوسفؑ نے بھی یہی کہا تھا۔ اور میں تم کو ان سے کم نہیں سمجھتا۔"

طبیب ناراض ہو کر چلے گئے۔

آپ نے اپنے مریدوں سے کہا "جب میں اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں تو ابوبکر نورک کو بلا کے کہنا کہ وہ میری نمازِ جنازہ پڑھائیں۔"

مرید رونے لگے۔ آپ نے ان کو تسلی دی اور کہا "روتے کیوں ہو؟ یہ تو وہ منزل ہے جہاں ہم سب کو پہنچنا ہے۔"

لیکن اس سے بھی مریدوں کو تسلی نہیں ہوئی۔ وہ اب بھی رو رہے تھے۔

آپ نے انھیں مزید سمجھایا "جانتے ہو، مرد کیا ہوتا ہے؟"

ایک مرید نے جواب دیا "مرد، مرد ہوتا ہے۔"

آپ نے فرمایا "وہ تو ٹھیک ہے مگر مرد وہ ہے جو ہر چیز کو اپنی جگہ پر رکھے۔ خوف کی جگہ خوف اور رجا کی جگہ رجا۔ دیکھو، مشاہدے کے بعد اتباعِ اوامر کا نام عبودیت ہے۔ عیش و راحت میں موت کو یاد رکھنا شوق کی علامت ہے۔"

مریدوں کو سکون ملا کہ شاید اب آپ کی حالت بہتر ہے۔ انھیں سکون ہو گیا اور وہ اپنی جگہ مشغول اور مصروف ہو گئے۔

لیکن انھوں نے اچانک اپنے چاروں طرف ویرانی اور اداسی محسوس کی۔ پھر گرد و غبار کی کثرت نے ہر شے دھندلی کر دی، مریدوں کو یقین ہو گیا کہ اب آپ کا آخری وقت آن پہنچا۔ بھاگے بھاگے مرید آپ کے پاس پہنچے تو آپ کو آخری مہمان پایا۔

آپ پہ مدہوشی کا دورہ پڑا۔ جب ہوش آیا تو مریدوں سے سماع کی خواہش کی۔ سماع کی محفل سجائی گئی اور آپ کا اسی حال میں ۳۷۰ھ میں انتقال ہو گیا۔ نیشاپور ہی میں دوسرے مشہور صوفی اپنے ہم نام ابوعثمان حیری کے مزار سے متصل آپ کو دفن کیا گیا۔

مضمون کے مآخذ

انوار اصفیا	نفحات الانس	تذکرۃ الاولیا	الطبقات الکبریٰ
شیخ غلام علی اینڈ سنز	مولانا عبدالرحمٰن جامی	شیخ فریدالدین عطار	علامہ عبدالوہاب شعرانی

سلسلہ در سلسلہ

ہما اقبال

انتقام بڑا ہی موذی مرض ہے۔ یہ ایک بار جس کو لگ جائے، اس کی جان نہیں چھوڑتا۔ نسل در نسل اس کا سلسلہ دراز ہوتا ہی چلا جاتا ہے۔ یہ اس موروثی بیماری کی طرح ہے جو نسلیں برباد کر دیتی ہے۔

ایک انتقام کی مختصر دلچسپ اور چونکا دینے والی کہانی

انتقام شاید اس کی گھٹی میں پڑا تھا چنانچہ اس نے اپنے باپ کا انتقام لے لیا۔ اس نے دشمن کی بستی کے دو آدمی ہلاک کیے اور وہاں سے بھاگ نکلا لیکن بھاگتے بھاگتے بھی ایک گولی اس کے لگ ہی گئی۔ وہ گولی اس کی ٹانگ میں لگی تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے گرا لیکن اس نے سنبھلنے میں بھی دیر نہیں لگائی۔ زندگی کسے پیاری نہیں ہوتی؟ اس نے پھر بھاگنا شروع کیا لیکن اب تیز رفتاری اس کے لیے ممکن نہیں تھی۔ دشمن اس کے تعاقب میں لگے ہوئے تھے۔

وہ ایک طوفانی رات تھی۔ موسلا دھار بارش، بجلی کی چمک اور بادلوں کی گرج نے بڑا خوف ناک سماں باندھ رکھا تھا۔ اگر دن

کا وقت ہوتا تو دشمن اسے بہ آسانی مار لیتے لیکن اس موسم اور اندھیرے کے باعث وہ بس اندھا دھند گولیاں چلا رہے تھے۔

وہ حتی الامکان تیزی سے بھاگتا رہا لیکن بھاگنے کی وجہ سے ٹانگ کی تکلیف بڑھتی جا رہی تھی اور وہ جان بچانے کے لیے اس بڑھتی ہوئی تکلیف کو برداشت کرنے کے لیے مجبور تھا۔ ٹانگ کی تکلیف کے ساتھ ساتھ اسے چھوٹے موٹے زخم بھی کھانا پڑ رہے تھے۔ کیوں کہ وہ ایک مضافاتی علاقہ تھا اس لیے جگہ جگہ جھاڑیاں تھیں جن میں خار زار بھی تھیں اور انھی سے ٹکرا ٹکرا کے خراشیں بھی برداشت کرنا پڑ رہی تھیں۔

کئی میل دور، جنگلوں سے ڈھکا ہوا پہاڑی علاقہ تھا اگر وہ وہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا تو پھر اس کے دشمن اسے ہرگز نہ پکڑ پاتے لیکن زخمی ٹانگ کی وجہ سے وہ چند میل، اس کے لیے سیکڑوں میل کے برابر بن گئے تھے۔

رفتار کم ہو جانے کی وجہ سے اس کے دشمن قریب سے قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔ بادلوں کی گھن گرج کے باوجود اُسے کبھی کبھی اُن کا شور سنائی دے جاتا — اُن کی آوازیں اُن کے اشتعال کا اظہار کر رہی تھیں۔

ٹانگ کی بڑھتی ہوئی تکلیف کے باعث اس کی رفتار کم سے کم ہوتی جا رہی تھی۔ شور و غل اس کے خاصا قریب آ چکا تھا۔ اب وہ لوگ اُسے پکڑ ہی لیتے اور اس کی تِکّا بوٹی کر ڈالتے لہٰذا وہ اپنی جان بچانے کے لیے بے حد گھنی جھاڑی میں گھس گیا اور بالکل بے حس و حرکت ہو کر اطراف و جوانب کا جائزہ لینے لگا۔ وہ پوری پوری کوشش کر رہا تھا کہ اس کے حلق سے ذرا بھی آواز نہ نکلے حالانکہ ٹانگ کی تکلیف اُسے بے چین کیے دے رہی تھی۔

اندھیرے میں کچھ لوگ اس جھاڑی کے قریب سے گزر گئے۔ ان سایوں کو دیکھ کر اس کا اشتعال بڑھ گیا لیکن ٹانگ کے زخم کے باعث وہ حد درجہ بے بسی کا شکار ہو گیا تھا۔

بارش اس کی خوش قسمتی کی علامت بن کر رہ گئی تھی ورنہ خون کے دھبّے اس کے دشمن کو بہ آسانی اس تک پہنچا دیتے۔ بارش نے کچی زمین کو اس طرح دھو دیا تھا کہ خون کے دھبّے اور اس کے قدموں کے نشانات کا ملنا ناممکن ہو گیا تھا۔

آہستہ آہستہ بارش کا زور ٹوٹنے لگا۔ بادلوں کی گھن گرج بھی کم ہو گئی۔ بجلی بھی اب شاذ و نادر ہی چمک رہی تھی۔ صبح ہوتے ہوتے مطلع بالکل صاف ہو گیا۔ مشرق سے سورج کی کرنیں پھوٹنے لگیں۔

اب آس پاس کوئی دشمن نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ وہ لوگ شاید مایوس ہو کر لوٹ چکے تھے۔

رات بھر میں ٹانگ کی تکلیف اور بڑھ گئی تھی۔ اس نے کھڑے ہونے کی کوشش کی اور اس کے سارے جسم میں ٹیسیں دوڑ گئیں۔ اب بھاگنا اُس کے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ وہ بس لنگڑا لنگڑا کر چل ہی سکتا تھا۔ اُس نے بڑی حسرت سے پہاڑوں کی طرف دیکھا۔ اب وہاں تک پہنچنا آسان نہیں رہا تھا لیکن اس کی زندگی ان پہاڑوں تک پہنچ کر ہی بچ سکتی تھی۔ پہاڑوں پر رہنے والے ہی اس کی اونچ نیچ سے واقف ہوتے ہیں۔ بستی کے لوگوں کے لیے تو وہ ایک ناقابلِ تسخیر مہم ثابت ہوتی۔ ویسے اسے یہ احساس بھی تھا کہ وہ وہاں پہنچ کر اکیلا نہیں رہ جائے گا۔

سورج کچھ اوپر آ گیا تو وہ جھاڑی سے نکلا اور لنگڑاتا ہوا اپنی منزل کی طرف چل پڑا لیکن وہ اب بھی اپنے دشمن سے بے خبر نہیں تھا اس کی نظر برابر اطراف و جوانب کا جائزہ لے رہی تھی۔

دھوپ سر پر آ گئی لیکن وہ کسی نہ کسی طرح چلتا ہی رہا۔ اس کی ٹانگ کے زخم سے خون برابر بہہ رہا تھا جس کی وجہ سے اس پر نقاہت غالب آنے لگی تھی۔ صرف زندہ رہنے کا شدید جذبہ.... ہی اُسے آگے بڑھائے لیے چلا جا رہا تھا لیکن دوپہر کے بعد اس کی سکت جواب دے گئی۔ وہ ایک جگہ ڈھیر ہو گیا۔ بھوک اور پیاس نے بھی اُسے نڈھال کر رکھا تھا۔ اُس نے ایک مرتبہ احتیاطاً چاروں طرف نظر دوڑائی اور پھر آنکھیں موند لیں۔ غالباً اب وہ کچھ سستانے کے بعد ہی آگے بڑھنا چاہتا تھا لیکن یہ سستانا اُسے کچھ مہنگا ہی پڑا۔ اتنی دیر میں اس کے جسم میں خون کی مقدار کچھ اور کم ہو گئی۔ گویا نقاہت میں مزید اضافہ۔ آخر ہمت کر کے وہ پھر اُٹھا اور چل پڑا۔ اب پہاڑی علاقہ زیادہ دور نہیں رہ گیا تھا لیکن اس کی رفتار اب اتنی کم تھی کہ وہ اندھیرا پھیلنے سے پہلے وہاں تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ کبھی کبھی وہ تکلیف سے لڑکھڑا کر گرنے بھی لگتا تھا لیکن پھر سنبھالا لے لیتا تھا۔ زندہ رہنے کی لگن اسے کشاں کشاں آگے بڑھا رہی تھی۔

جس جھاڑی سے وہ روانہ ہوا تھا، وہاں سے یہاں تک اس کے خون کے دھبّے برابر پڑتے چلے گئے تھے۔ بارش کے سبب زمین گیلی ضرور تھی لیکن اب وہ دھبّے دُھل نہیں سکتے تھے۔ اس کے برخلاف سورج کی تمازت انھیں جما سکتی تھی۔

نقاہت کے ساتھ ہی ساتھ، آگ برساتا ہوا سورج بھی اس کے لیے بے حد تکلیف دہ ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ سے پیاس شدید سے شدید تر ہوتی چلی جا رہی تھی اور بھوک مٹانے کا تو کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

شام کا دھندلکا ہونے کو تھا جب وہ پہاڑوں کے قریب پہنچا۔ اس کی دھندلاتی ہوئی آنکھوں میں خفیف سی چمک عود کر آئی لیکن اس لمحے اس چمک نے دم توڑ دیا جب اُسے ایک جُبھتی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ اس کے دشمنوں ہی میں سے کوئی تھا۔ اس نے اُسے دیکھ لیا تھا اور اپنے ساتھیوں کی توجّہ اس کی طرف مبذول کرائی تھی۔ غالباً دشمن جانتا تھا کہ وہ اسی طرف لوٹے گا لہٰذا وہ اس سے پہلے ہی وہاں پہنچ گئے تھے۔

ایک فائر کی گونج دور تک پھیلتی چلی گئی۔

موت!

ایک بار پھر موت سر پر آ چکی تھی۔

وہ اس پل یہ بات بھُول ہی گیا کہ اُس کی ایک ٹانگ زخمی ہے۔ وہ بھوک اور پیاس سے بھی نڈھال تھا لیکن بے طرح دوڑ پڑا۔ موت کے خوف سے ٹانگ کی تکلیف زائل ہو گئی تھی یا اس حد تک کم ہو گئی تھی کہ وہ دوڑنے کے قابل ہو گیا تھا۔

دشمن نے اس کا پیچھا جاری رکھا لیکن اب اُسے بار بار کسی نہ کسی چٹان کی آڑ حاصل ہو رہی تھی اور دشمن کو اس پر گولی چلانے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ ان لوگوں نے اسے اردگرد سے گھیرنے کی بھی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ وہ ان پہاڑی بھُول بھلّیوں سے اتنا واقف نہیں تھے جتنا علم اُس کو تھا۔

پھر ایک دراڑ اُس کے سامنے آ گئی۔ دو چٹانوں کے بیچ میں وہ اتنی گہری کھائی تھی کہ اس میں گرنے والے کا مُرمّہ بن کر رہ جاتا۔ عام حالات میں وہ اس کھائی کو بہ آسانی پھلانگ جاتا لیکن اس وقت اس کی بہت بُری حالت تھی۔ سانس بُری طرح پھُولا ہوا تھا اور ٹانگ کی تکلیف بھی جست لگانے میں مانع تھی لیکن اس نے دشمن سے بچنے کے لیے چھلانگ لگا ہی دی۔

ایک گولی پھر چلی۔ وہ دراڑ کو پار کر چکا تھا لیکن گولی اپنا کام کر گئی تھی۔ اس نے اپنے کُولھے میں آگ بھرتی ہوئی محسوس کی مگر لڑھکتا ہوا ایک چٹان کی اوٹ میں ہو گیا۔ دوسری گولی چلی تو تھی مگر وہ اس سے بچ گیا تھا۔ اب اس میں چلنے کی بھی سکت نہیں رہ گئی تھی لیکن وہ گھسٹتا ہوا ایک طرف بڑھنے لگا۔

بڑھتا رہا . . .

بڑھتا رہا . . .

اور پھر اپنے بھٹ میں داخل ہو گیا۔ یہاں ایک شیرنی موجود تھی۔ اُس نے فائرنگ کی آوازیں سُن لی تھیں اور بہت چوکنّا کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے جواں سال بچّے کو بھٹ میں داخل ہوتے دیکھا تو چونک کر اس کی طرف بڑھی۔

وہ دو گولیوں کے زخم کھا چکا تھا۔ ہر چند، وہ زخم جسم کے نازک حصّوں پر نہیں لگے تھے مگر طویل وقت گزرنے کے باعث وہ اپنے خون کی بہت زیادہ مقدار سے ہاتھ دھو چکا تھا۔

بھٹ کے وسط میں پہنچ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور دم سادھ کر پڑ گیا۔ اس کی سانسیں اُکھڑی اُکھڑی سی چل رہی تھیں۔ شیرنی بڑی بے چینی سے اس کے زخموں کو چاٹنے لگی لیکن وہ کوئی معمولی زخم نہیں تھے جو چاٹنے سے ٹھیک ہو سکتے۔ وہ خطرناک رائفلوں سے نکلی ہوئی گولیوں کے زخم تھے۔

آخر اس نے دم توڑ دیا۔

شیرنی اُس کے زخم چاٹتے چاٹتے رک گئی۔ شاید جانوروں کی چھٹی حس بھی بتا دیتی ہے کہ زندگی کا کھیل کب ختم ہو گیا۔

شیرنی نے اس کے جسم کے گرد دو تین چکّر لگائے اور پھر بھٹ کے دہانے کی طرف دیکھنے لگی، اس کی آنکھیں بڑے خوف ناک انداز میں چمکنے لگی تھیں۔ اچانک اس کی درد میں ڈوبی ہوئی خوف ناک دہاڑ سے پہاڑ گویا لرز اُٹھے اور پھر وہ ایک طویل جست لگا کر بھٹ کے دہانے سے باہر نکل گئی۔ شاید اب وہ بستی کے 'درندوں' سے اپنے شوہر اور اپنے بیٹے کی موت کا انتقام لینے کے لیے روانہ ہو رہی تھی۔

✸

انسانی نفسیات کی بھول بھلیوں میں اَن گنت کہانیاں بکھری رہتی ہیں. یہ بھی چند ایسے ہی کرداروں کی کہانی ہے جن کی نفسیات میں پیچ وخم تھے. گرہیں تھیں اور نا تمام حسرتوں کے زخم تھے۔ یہ ایک نوجوان کا قصہ ہے جو کچھ الگ سی طبیعت لے کر پیدا ہوا تھا۔ ایک عجیب لڑکی کی کہانی ہے جو کچھ ایسی زیادہ عجیب بھی نہیں تھی مگر ان گنت پیچیدگیوں کا بوجھ اُٹھاتے اُٹھاتے جس کے دِل کی نازک رگیں ٹوٹنے لگی تھیں. نازک احساسات، انوکھے کرداروں اور آپ کے اپنے گلی کوچوں کی کہانیاں لکھنے والے محمود احمد مودی کی طرف سے اس ماہ کے لیے توشۂ خاص.

عجیب

محمود احمد مودی

میں نے پہلی مرتبہ جب وہ منظر دیکھا تو مجھے بہت ہی عجیب سا محسوس ہوا۔ میرے خیال میں ابا جی بہت بڑے گناہ کے مرتکب ہو رہے تھے۔ وہ اپنے چند کا رندوں اور مصاحب نما دوستوں کے ساتھ بیٹھے مُجرا دیکھ رہے تھے۔

دو نہایت کم عمر، طرح دار اور حسین طوائفیں بجلی کی طرح قالین پر تھرک رہی تھیں۔ سازندے مشینی انداز میں ساز بجا رہے تھے۔ نوٹ لٹائے جا رہے تھے اور اس کام میں ابا جی پیش پیش تھے۔ نائیکہ کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں اور وہ مستعدی سے نوٹ سمیٹنے میں مصروف تھی۔ جام بھی گردش میں تھا۔ دو تین بوتلیں کھلی ہوئی تھیں مختلف آوازے کسے جا رہے تھے اور کمسن طوائفیں نہایت گھاگ اور منجھی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ وہ آوازے سن رہی تھیں۔ اُن کی پیشانی پہ شِکن تک نہیں تھی بلکہ زیادہ نا رَوا آوازوں کے جواب میں وہ زیادہ شدت سے اداؤں کے تیر چلانے لگتی تھیں، اور جھومتے ہوئے کسی تماش بین کی کسی حرکت کے بعد گویا ان کے جسم کا لوچ بڑھ جاتا تھا۔ سارا ماحول ہی ایک عجیب سے خمار کی لپیٹ میں تھا۔ ابا جی نسبتاً پُرسکون تھے۔ ان کی موٹی موٹی خوب صورت آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں اور سُرخ سپید چہرہ تمتما رہا تھا۔ ان کے قریب ہی نئے نوٹوں کی گڈیاں رکھی ہوئی تھیں.

میری عمر اس وقت چودہ سال تھی۔ وجود میں آتش فشاں کروٹیں تو لینے لگے تھے مگر، انھیں ابھی کوئی راہ نہیں ملی تھی۔ بھر کتی ہوئی طوائفوں کی ناز و ادا، جسموں کے لہریوں اور زلفوں کے پیچ و خم میں میرے لیے بھی کشش تھی مگر ابھی فطرت میں کم سنی کا حجاب اور شرمیلاپن باقی تھا۔ اس لیے سب کچھ غور سے دیکھنے کے بعد مجھے اپنے کانوں کی لویں تپتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اباجی ان سب لوگوں میں گھرے یہ سب کچھ کرتے ہوئے مجھے اچھے معلوم نہیں ہوتے۔

وہ ہماری زمینوں کی حدود میں ہی واقع ایک طویل و عریض مکان تھا جس کے بڑے سے ہال میں یہ محفل جمی ہوئی تھی۔ اس مکان میں ہماری زمینوں کا منیجر اور دو تین دوسرے اہم کارندے رہتے تھے۔ زمینوں سے متعلق بیشتر معاملات یہیں نمٹائے جاتے تھے۔ اسے ہم ڈیرہ کہتے تھے اباجی تقریباً چوبیس گھنٹے یہیں رہتے تھے۔ حالانکہ یہاں حویلی جیسا آرام نہیں تھا۔ کم از کم میں یہی سمجھتا تھا کہ وہ زمینوں کے معاملات نمٹانے اور اسی سلسلے کی دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے یہاں رہتے ہیں اور وہ ان جھگڑوں کو اصل گھر سے دور ہی رکھنا چاہتے ہیں۔

ہمارا اصل مکان جو ایک چھوٹی موٹی حویلی سے ہی مشابہ تھا... یہاں سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر گاؤں کے نواح میں تھا۔ اس گاؤں میں زیادہ تر آبادی ہمارے ہی مزارعوں کی تھی۔ تھوڑے بہت ہی ایسے لوگوں کے گھر تھے جو دوسرے چھوٹے موٹے زمینداروں کی زمینوں پر کام کرتے تھے۔ نسبتاً خوش حال قسم کے دو چار گھر ایسے لوگوں کے بھی تھے جنھوں نے دوسروں کی تھوڑی بہت زمین ٹھیکے پر لی ہوئی تھی۔ ہمارا گاؤں بہت چھوٹا نہیں تھا بھوڑی بہت کوشش کی جاتی تو اسے قصبے کا درجہ مل سکتا تھا۔

ہماری حویلی گاؤں سے ذرا ہٹ کر تھی۔ شہر ہو یا گاؤں دولت والے لوگ غریبوں سے ذرا ہٹ کر ہی رہتے ہیں۔ شاید انھیں اپنے عالی شان گھروں کے بند کمروں میں بھی محنت کشوں کے پسینے کی بو تنگ کرتی ہے۔

گاؤں سے پرلی طرف تقریباً ڈیڑھ دو میل کا فاصلہ کچے میں طے کرنے کے بعد پکی سڑک آجاتی تھی جس پر اٹھارہ میل کا سفر طے کرکے لاہور پہنچا جا سکتا تھا۔ میں لاہور ہی کے ایک بہت اچھے اسکول میں پڑھ رہا تھا۔ ایک گاڑی اور ایک ڈرائیور روزانہ مجھے اسکول لے جانے اور لے آنے کے لیے مخصوص تھا۔

گھر میں گاڑیاں موجود ہوں تو لڑکے بہت چھوٹی عمر میں ہی ڈرائیونگ وغیرہ سیکھ جاتے ہیں۔ میں بھی فارغ وقت میں جیپ یا چھوٹی کار لے کر اپنی زمینوں کی طرف یا پھر آس پاس کے علاقے کی سیر کے لیے نکل جاتا تھا۔ کبھی کبھی اکیلا یا دوستوں کے ساتھ پیدل بھی میلوں چل لیتا تھا۔ گاڑی لے کر شہر کی طرف جانے کی ابھی مجھے اجازت نہیں تھی اور اس علاقے میں چونکہ رنگینیاں اور دلچسپیاں کم از کم میرے لیے کم تھیں اس لیے میں ادھر اُدھر بھٹکتا رہتا تھا۔ ہمارے اسکول میں پڑھائی کا معیار بہت بلند تھا۔ اچھے طالب علموں میں شمار ہونے کے لیے مجھے گھر پر بھی خاصا پڑھنا پڑتا تھا۔ اس کے باوجود خاصا وقت فالتو محسوس ہوتا تھا۔ ایسے ہی لمحوں میں، میں اس روز بھی سیر کے لیے نکلا تھا اور یوں ہی بلا ارادہ ڈیرے کی طرف نکل آیا تھا۔

ڈیرے کا صدر دروازہ کھلا ہی پڑا تھا۔ میں ٹہلتا ہوا اندر چلا گیا۔ دروازے کے قریب ہی طویل و عریض احاطے میں ایک لمبی چوڑی، بھاری بھر کم چارپائی پڑی رہتی تھی، جس پر خدا بخش مستقلاً نیم دراز رہتا تھا۔ کبھی کبھی دوسرے لوگ بھی اس کے ارد گرد آکر بیٹھ جاتے تھے۔ وہ ایک طرح سے ڈیرے کا غیر رسمی چوکیدار تھا۔ اس چارپائی پر نیم دراز وہ آنے جانے والوں کو دیکھتا رہتا تھا۔ حرکت میں صرف اس وقت آتا تھا، جب کسی کو روکنا مقصود ہوتا تھا۔ وہ اگر صرف آنکھ کے اشارے سے کسی کو اندر جانے سے منع کر دیتا تھا تو اس کو مزید ایک قدم بھی بڑھانے کی جرأت نہیں ہوتی تھی لیکن اس وقت خدا بخش کی چارپائی خالی پڑی تھی۔ شاید وہ خود بھی اندر گیا ہوا تھا۔ اندر سے طبلے سارنگی اور گھنگروؤں کی جھنکار سنائی دے رہی تھی۔

میں پہلے اندرونی دروازے کی طرف بڑھا لیکن پھر قدرے ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہوئے کھڑکی کی طرف چلا گیا۔ کھڑکی نیم وا تھی۔ میں نے نہایت احتیاط سے اس طرح اندر جھانکا کہ کوئی مجھے نہ دیکھ سکے اور تب مجھے وہ طوائفیں ناچتی نظر آئیں۔

چند لمحے تو میں مبہوت کھڑا یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ مجھے اپنے کانوں کی لویں تپتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ بالآخر میں خاموشی سے لوٹ آیا۔ میرا دماغ سنسنا رہا تھا۔ یہ انکشاف میرے لیے کچھ زیادہ ہی حیران کن تھا کہ ڈیرے پر زمینوں کے معاملات نمٹائے جانے کے ساتھ ساتھ اس قسم کی محفلیں بھی جمتی ہیں۔ میرے نزدیک یہ بہت سنگین معاملہ تھا۔

میں نے جیپ نہر کے قریب چھوڑی تھی۔ میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا نہر تک پہنچا، جیپ میں بیٹھا اور اپنے دوست اشرف بھٹی کے گھر کی طرف چل دیا۔ اشرف بھٹی عمر میں مجھ سے تقریباً دو سال بڑا تھا۔ اس کے والد چھوٹے موٹے زمیندار ہی تھے اور جب کبھی میرے والد سے ملتے تھے تو ان کے قدموں میں بچھ جاتے تھے... اشرف بھٹی سے میری خاصی گہری دوستی تھی۔ جب بھی مجھے کوئی سنگین مسئلہ درپیش ہوتا تھا اور میں مشورے کی ضرورت محسوس کرتا تھا یا یوں ہی کسی سلسلے میں مجھے دل کا غبار نکالنا ہوتا تھا تو میں دوڑا دوڑا اسی کی طرف جاتا تھا۔

اشرف بھٹی اس وقت اپنے گھر کے سامنے نیٹ لگائے اپنے کسی کزن کے ساتھ بیڈمنٹن کھیل رہا تھا۔ میں نے جیپ میں بیٹھے ہی بیٹھے اشارے سے اسے بلایا اور وہ ریکٹ ایک مزارعے کو تھما کر میرے ساتھ جیپ میں آن بیٹھا۔ وہ سفید اسپورٹس شرٹ، نیکر اور ٹینس شوز پہنے ہوئے تھا۔ اس کی پیشانی پر پسینہ چمک رہا تھا اور سانس پھولی ہوئی تھی۔ اس کم عمری میں ہی اس کا پیٹ خاصا باہر کو نکلا ہوا تھا۔ میں نے جیپ تھوڑا آگے بڑھا دی اور درختوں کے ایک جھنڈ کے پاس جا رکی۔

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی اشرف بھٹی بولا ”یار! تو اس وقت اس طرح پریشان نظر آ رہا ہے جیسے کسی نے نہانے کے لیے نہر میں چھلانگ لگا دی ہو اور کنارے پر سے کوئی اس کے کپڑے اٹھا کر بھاگ گیا ہو۔“ مثالیں ڈھونڈنے کے معاملے میں کبھی کبھی اس کا ذہن خوب کام کرتا تھا۔

”میں اس سے کچھ زیادہ ہی پریشان ہوں۔“ میں نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ ”کتنے افسوس کی بات ہے، کہ میرے اباجی ڈیرے پر بیٹھ کر مجرے دیکھتے ہیں، شرابیں پیتے ہیں۔“

”تمھیں کیسے پتا چلا؟“ اس نے مجھے گھورا۔

”میں ابھی اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آ رہا ہوں۔ ڈیرے پر دو طوائفیں ناچ رہی تھیں۔“ میں نے افسردگی سے بتایا۔

”اچھا....؟“ اشرف کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ پھر وہ میری طرف جھکتے ہوئے رازدارانہ سے لہجے میں بولا۔ ”کیسی تھیں لونڈیاں؟“

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا پھر قدرے بگڑ کر کہا۔ ”کمال ہے یار! میں تم سے مشورہ کرنے آیا ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور.... تم مجھ سے پوچھ رہے ہو، لونڈیاں کیسی تھیں؟“

”تمھیں کچھ بھی نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ تمھاری ابھی کچھ کرنے کی عمر نہیں ہے۔“ اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”ویسے بائی دا وے... تم اتنے پریشان کیوں ہو؟ تمھیں تو یوں تشویش ہو رہی ہے جیسے باپ در اصل تم ہو اور تم نے اپنے کم سن بیٹے کو تماش بینی کرتے دیکھ لیا ہے... ابے الو! وہ تمھارے والد ہیں اور کافی بڑے زمیندار ہیں۔ اگر وہ مجرا دیکھ رہے تھے تو یہ ایک معمولی بات ہے۔ تمھیں اس طرح آنکھیں پھیلا کر اور دہشت زدہ صورت لے کر ادھر اُدھر بھاگنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اسے میرے محسوسات کی ذرا بھی پروا نہیں تھی۔ پھر وہ گویا جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یار! ذرا بڑے ہو کر ہم بھی یوں ہی عیش کیا کریں گے۔ میرے لیے ایک سال کی اور تمھارے لیے دو سال کی بات ہے .... پھر ہم کالج میں پہنچ جائیں گے۔ پیسے بھی زیادہ ملنے لگیں گے، اور آزادی بھی زیادہ ہوگی۔ ہم بھی ہیرا منڈی جا کر مجرا دیکھا کریں گے۔ تم میرے ساتھ چلا کرنا... میں نے وہ جگہ دیکھی ہوئی ہے۔ میں نے تو ایک مرتبہ وہاں جا کر گانا بھی سنا تھا۔“

ایک لمحے کے لیے تو میں بس خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر میں نے تھوک نگل کر پوچھا۔ ”کب.... کیسے....؟ تم نے مجھے تو کبھی بتایا ہی نہیں۔“

”اس وقت شاید میری تم سے دوستی زیادہ گہری نہیں تھی۔“ وہ مربیانہ لہجے میں بولا۔ ”میرے پاس کافی پیسے آگئے تھے۔ میں نے ڈرائیور کو اپنے ساتھ شریک کر لیا تھا۔ اس رات ہم شہر ہی میں رکے تھے۔ بہانہ یہ کر کے گئے تھے کہ اسکول میں فنکشن ہے....“ بڑے اطمینان سے یہ بتانے کے بعد وہ ایک بار پھر مستقبل کے خوابوں میں کھو گیا۔ ”کالج پہنچ کر تو ہم ہوسٹل میں داخلہ لے لیں گے یا پھر اپنے والدین سے کہیں گے کہ وہاں ہمیں کوئی اچھا سا مکان دلوا دیں .... بس پھر تو اپنے عیش ہوں گے....“

معلوم نہیں اس کے ذہن میں عیش و عشرت کا کیا تصور تھا۔ لیکن یہ بات بہر حال طے تھی کہ میں اس کے قبیلے کا لڑکا نہیں تھا اس کے خیالات گویا پہلی بار صحیح طور پر میرے سامنے آئے تھے۔

”مجھے تمھاری باتیں سن کر بہت مایوسی ہوئی ہے اشرف!“ میں نے حقیقتاً بڑی مایوسی سے کہا۔

”دو چار برس اور ٹھہر جاؤ بچو!“ وہ میرا کندھا تھپتھپا کر بولا۔ ”پھر تمھیں میری یہ باتیں بہت اچھی لگنے لگیں گی۔ در اصل جوانی کی طرف تمھاری پیش قدمی ذرا سست ہے۔“

میں نے اسے جیپ سے اتارا اور وہ دوبارہ جوش و خروش سے ٹینس کھیلنے میں مصروف ہو گیا۔ میں گھر واپس آگیا۔ امی بڑے ہال میں نماز پڑھ رہی تھیں۔ میں کچھ دور آرام کرسی پر بیٹھ کر انھیں دیکھنے لگا۔ سیاہ دوپٹے کے حلقے میں گھرا ہوا ان کا چہرا چاند کی طرح روشن روشن لگ رہا تھا۔

وہ ایک دراز قد اور حسین عورت تھیں مگر ان کا حسن شاید کورے لٹھے کی طرح بے کیف تھا۔ وہ کبھی لپ اسٹک تک نہیں لگاتی تھیں۔ بہت چپ چپ رہتی تھیں۔ زیادہ تر وہ عبادت یا گھر کے چھوٹے موٹے کاموں میں مصروف رہتیں۔ گھر میں اتنے نوکر اور نوکرانیاں ہونے کے باوجود بہت سے کام وہ خود کرنے کی کوشش کرتیں۔ ان کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں ہر وقت ایک عجیب سی اداسی تیرتی رہتی تھی۔ وہ مسکراتی بھی تھیں تو ان کی مسکراہٹ آنسوؤں میں بھیگی ہوئی

محسوس ہوتی تھی۔

دُعا وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد ہی وہ میری طرف متوجّہ ہوئیں "تمھیں مجھ سے کچھ کہنا ہے بیٹے؟" اُن کے لہجے میں شفقت کے دریا موجزن ہوتے تھے۔ یوں تو غالباً ہر بچّے کو ہی اپنی ماں بہُت اچھی لگتی ہے، لیکن میرا خیال ہے، مجھے اپنی امّی کچھ زیادہ ہی اچھی لگتی تھیں۔ اُنھوں نے مجھے کبھی ڈانٹنا یا مارنا تو دُور کی بات ہے، کبھی کڑی نظر سے بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ مجھے آسمان سے اُتری ہُوئی کوئی مخلوق لگتی تھیں۔

"امّی! آپ کو شاید معلوم نہیں ہے کہ ابّا جی نے ڈیرے پر ناچ گانے کے لیے طوائفوں کو بُلانا شروع کر دیا ہے۔" میں نے اپنی دانست میں انھیں اس صدی کی سب سے خطرناک خبر فراہم کی۔

مجھے یہ دیکھ کر شدید حیرت بھی ہُوئی اور مایوسی بھی ـــــ کہ امّی اپنی جگہ سے اُچھلنا تو درکنار چونکی تک نہیں۔ وہی اُداسی کی دُھند میں لپٹی ہوئی مسکراہٹ اُن کے چہرے پر طلوع ہوئی اور وہ اپنے مخصوص دھیمے اور شکست خوردہ سے لہجے میں بولیں "بیٹا! شکر کرو، وہ طوائفوں کو گھر نہیں بُلاتے۔ اگر وہ یہاں مجرا کرانے لگیں تب بھی کوئی اُن کا کیا بگاڑ سکتا ہے؟"

مجھے اُن کے جواب سے بڑی مایوسی ہُوئی۔ شکوہ بھرے لہجے میں مَیں نے کہا "امّی! میں تو جب بالکل چھوٹا سا تھا، تب سے آپ مجھے نصیحت کرتی آ رہی ہیں کہ بُرے کام نہیں کرنے چاہئیں اور ہر وقت سمجھاتی رہتی ہیں کہ اچھّے کام کیا ہوتے ہیں اور بُرے کیا۔ لیکن ابّا جی کو آپ بالکل نہیں سمجھاتیں ـــــ اُنھیں آپ کچھ نہیں کہتیں۔"

"بیٹا! تمھیں اس لیے سمجھاتی رہی ہوں کہ تم پر زور چلتا ہے اور تم میرے اپنے ہو.... وہ اب میرے نہیں رہے.... اور اب وہ اُس منزل پر بھی نہیں رہے، جب سمجھانے بجھانے سے کسی میں کوئی تبدیلی آ سکتی ہے۔" وہ ایک پُروقار عورت تھیں، پُوری کوشش کر رہی تھیں کہ ان کے لہجے سے کوئی دُکھ نہ جھلکنے پائے۔

پھر اُن کے ہونٹوں پر وہی افسردگی کی شبنم میں بھیگی ہُوئی مسکراہٹ اُبھر آئی اور آواز کچھ اور دھیمی ہو گئی ـــــ "بیٹا! شاید میں اس طرح کی عورت بھی نہیں ہوں جیسی تمھارے ابّا کو ملنا چاہیے تھی.... جو انھیں قابو میں رکھ سکتی.... اُن سے بات منوا سکتی.... اور اب تو بالکل ہی میرے پَر کٹ چکے ہیں۔ تمھارے نانا کا ایک عرصہ ہوا انتقال ہو چکا ہے۔ بھائی بہن میرے کوئی ہیں نہیں ـــــ جو زمین مجھے ورثے میں ملی تھی، وہ بھی مَیں نے سادہ لوحی میں تمھارے ابّا جی کے حوالے کر دی، اُن کے نام لکھ دی۔ اُس وقت تک وہ اتنے بگڑے بھی نہیں تھے۔ مجھے ان کی اصلاح کی امید تھی۔ لیکن اب میں نا امید ہو چکی ہوں بیٹا!"

وہ میرے مقابل ایک کرسی پر بیٹھ گئیں۔ میرے ہاتھ انھوں نے اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔ ان کے وجود سے ایک عجیب سی خوشبو پھُوٹتی تھی۔ شاید یہ پاکیزگی کی خوشبو تھی اور ان کے ہاتھوں کا لمس محسوس کر کے میرے دل کو قرار سا آ جاتا تھا۔ اگر میں گھبرایا ہوا ہوتا تھا تو میری گھبراہٹ دُور ہو جاتی تھی اور اگر مجھے کوئی خوف محسوس ہو رہا ہوتا تھا تو وہ دُور ہو جاتا تھا۔ اُن کی ذات میرے لیے تقویت، مضبوطی اور روشنی کی علامت تھی۔

وہ میرا ایک ہاتھ چُومنے کے بعد بولیں "تم نے فرعون کا قصّہ پڑھا ہے نا بیٹے.... اور میں نے تمھیں زبانی بھی ساری باتیں بتائی ہیں۔ تو بیٹا.... فرعون آج بھی اس دُنیا میں کسی نہ کسی رُوپ میں ہر جگہ موجود ہیں.... کوئی چھوٹا فرعون ہے کوئی بڑا.... ان میں سے ایک چھوٹے سے فرعون تمھارے ابّا جی بھی ہیں۔ اِس چھوٹے سے علاقے میں چونکہ ان کا زور چلتا ہے۔ وہ یہاں سیاہ و سفید کے مالک ہیں۔ جو اُن کا دل چاہتا ہے وہی کرتے ہیں اور اس سلسلے میں وہ اب کسی قسم کی حدود و قیود کے پابند نہیں رہے۔"

"کیا ہم ان کو کسی طرح روک نہیں سکتے امّی؟" میں نے آہستگی سے پُوچھا۔

"جہاں تک اور جب تک میرا بس چلا، میں نے انھیں باز رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن اب میں بے بس ہو گئی ہوں بیٹا!" میرے ہاتھوں پر اُن کے ہاتھوں کا مشفقانہ دباؤ بڑھ گیا۔ وہ گھُٹی گھُٹی سی آواز میں بولیں "اب میری امیدوں کا مرکز تم اور صرف تم ہو۔ میں تمھیں تمھارے باپ سے بالکل الٹ دیکھنا چاہتی ہوں ـــــ اور شاید تم پیدائشی طور پر ہی کافی مختلف ہو ـــــ سچّی بات تو یہ ہے کہ میں نے صرف تمھیں دیکھ دیکھ کر ہی جینا سیکھ لیا ہے۔ بہت سی امیدیں تم سے وابستہ ہیں.... اس کے علاوہ میں یہ بھی شکر کرتی ہوں کہ تمھارے ابّا کا رویّہ کم از کم تم سے اور مجھ سے تو اچھا ہی ہے۔ وہ ہمیں تو کچھ نہیں کہتے، ہمیں کوئی تکلیف نہیں پہنچاتے۔"

"لیکن یہ تو خود غرضی ہے امّی!" میں نے تاسف سے کہا "کہ ہم صرف اس لیے چُپ ہیں کہ ہمیں کوئی تکلیف نہیں پہنچتی۔ اگر کچھ دُوسرے لوگوں کو اُن کی ذات سے تکلیف پہنچتی ہے تو وہ بھی تو انسان ہی ہوں گے؟"

"ہاں بیٹا....! میں نے یہ معاملہ خُدا پر چھوڑ دیا ہے۔" وہ نہایت شکست خوردہ سے لہجے میں بولیں "میں ان کی بیوی ہوں اور تم اُن کی اولاد ـــــ ہم پر اُن کی اطاعت فرض ہے، وہ ہم کر رہے ہیں اور دُوسروں کے لیے لڑنے اور اپنا گھر اُجاڑنے کی مجھ میں شاید اس لیے ہمت نہیں رہی کہ میں کمزور درجے کی مومن ہوں۔"

پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولیں "ایک بات یاد رکھنا بیٹا! جن بستیوں میں کُفر کا راج ہو، وہ تو پھر بھی قائم رہ سکتی ہیں۔ لیکن جن بستیوں میں ظلم حد سے بڑھ جائے، وہ آخر کار کبھی نہ کبھی اُجڑ جاتی ہیں۔ اس لیے جب یہ چھوٹا سا علاقہ تمھارے تصرف میں آ جائے، یہاں تمھارا حکم چلنے لگے تو سب سے پہلا انتظام یہ کرنا کہ تمھاری عملداری میں کہیں کسی کے ساتھ کوئی ظلم، کوئی ناانصافی نہ ہونے پائے۔ جہاں تمھارا اختیار چلتا ہو گا، وہاں ہر فرد کے سلسلے میں جواب دِہ بھی تم ہو گے۔ خدا کے حضور تم صرف یہ کہہ کر نہیں بچ سکو گے کہ خود تم نے کوئی ظلم نہیں کیا اور تمھارے اپنے ہاتھ یا تمھاری اپنی ذات سے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ یہ عُذر خدا کے ہاں قابلِ قبول نہیں ہو گا۔"

"انسان دُوسروں پر ظلم کیوں کرتا ہے امّی؟" میں نے سخت اُلجھن زدہ لہجے میں پُوچھا۔

"یہ بات شاید ابھی صحیح طور پر تمھاری سمجھ میں نہ آ سکے۔" امّی میرے ہاتھ چھوڑتے ہُوئے گہری سانس لے کر بولیں "دراصل ہر انسان کے اندر ایک درندہ چھُپا ہوتا ہے جسے ہم تہذیب، مذہب اور اچھی تربیت کے ذریعے دبائے رکھتے ہیں۔ ایسے معاشرے میں یہ درندہ انسان پر غالب آ جاتا ہے، جہاں صرف طاقت کو سلام کیا جاتا ہو۔ جب ایک بار کسی کو احساس ہو جائے کہ وہ بہُت طاقت ور ہے اور ظلم کر کے بچ سکتا ہے تو پھر اسے ظلم کی چاٹ لگ جاتی ہے، جس طرح درندے کے مُنہ کو خُون لگ جاتا ہے۔ وہ کمزوروں کو اپنے سامنے تڑپتے، سسکتے اور رحم کی بھیک مانگتے دیکھ کر لاشعوری طور پر لذّت محسوس کرتا ہے ـــــ اور جو لوگ طاقت اور اختیار رکھتے ہُوئے بھی اس قسم کے واقعات دیکھ کر انجان بن جاتے ہیں، منہ پھیر لیتے ہیں اور صرف اس وجہ سے مطمئن رہتے ہیں کہ یہ واقعہ خود اُن کے ساتھ پیش نہیں آ رہا، وہ بھی کمزور قسم کے درندے ہی ہوتے ہیں۔ وہ بے حِس ہوتے ہیں اور بے حسی بھی درندوں ہی کی ایک صفت ہے یا کم از کم حیوانوں کی صفت ضرور ہے۔ انسان اور حیوان میں بُنیادی فرق یہی ہے نا کہ انسان ہر بات کو محسوس کرتا ہے، دل پہ لیتا ہے، جبکہ حیوان اپنے آپ میں مگن رہتا ہے۔"

"امّی! ویسے مجھے صحیح طور پر نہیں معلوم کہ ابّا جی کیا کچھ کرتے ہیں...." میں نے دھیمے لہجے میں کہا "لیکن مجھے یقین ہے کہ لوگ ان سے نفرت کرتے ہیں..... اور یہ نفرت شاید ہمارے حصّے میں بھی آ رہی ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ لوگ مجھ سے بھی نفرت کرتے ہیں۔ بظاہر تو وہ صرف خوف زدہ رہتے ہیں۔ مجھے دیکھ کر راستہ چھوڑ کر ایک طرف ہٹ جاتے ہیں اور کن انکھیوں سے میری طرف دیکھتے ہیں۔ میرا دل کہتا ہے کہ ان کے دلوں میں میرے لیے نفرت ہوتی ہے۔ میں اپنی عمر کے کسی لڑکے سے بات کرنا چاہتا ہوں تو وہ خوف زدہ سا ہو کر کسی اور طرف کو چلا جاتا ہے۔ میری دوستی یا واقفیت صرف زمینداروں ہی کے لڑکوں سے ہے۔"

"ہمارے مختصر سے خاندان کی اتنے بہُت سے لوگوں پر گرفت صرف طاقت، ملکیت اور کرائے کے آدمیوں کے زور پر ہے۔ جس دن بھی یہ چیزیں ہمارا ساتھ چھوڑ گئیں، لوگ ہمارا حشر کر دیں گے۔" امّی جھُرجھُری سی لے کر بولیں۔ "ناکردہ گناہوں کی سزا بھی ہمیں بھگتنا پڑے گی ـــــ زیادتیاں اکیلے تمھارے ابّا جی کی ہوں گی لیکن خمیازہ ہم سب کو بھُگتنا پڑے گا۔ میں ایسے ہی کسی وقت کے تصوّر سے ڈرتی رہتی ہوں۔ میرے اعصاب کمزور ہو گئے ہیں۔ میں عبادت میں پناہ ڈھونڈتی ہوں۔"

میں امّی کو بہت پسند کرتا تھا۔ شاید اسی لیے ان کی ہر بات مجھ پر بہت گہرا اثر کرتی تھی۔ دراصل بچپن ہی سے میرے ذہن کے کسی گوشے میں ایک بے عنوان سا احساسِ تنہائی موجود تھا۔ میں گویا دُنیا کے سمندر میں ایک الگ تھلگ جزیرے پر رہتا تھا۔ کوئی ایسا خاص دوست، ہم دم اور ہم زبان نظر نہیں آتا تھا۔ بہن بھائی کوئی تھا نہیں۔ ایک امّی کی ذات ہی نمایاں نظر آتی تھی۔ وہ ہر وقت قریب رہتی تھیں اور مجھے دُنیا میں سب سے اچھی لگتی تھیں۔ اِس لیے میری ذات پر انھی کا سب سے زیادہ اثر تھا۔ میرے دوست وغیرہ تو ہائی اسکول کے زمانے میں بننے شروع ہوئے تھے اور تب سے ہی میں نے دوسری شخصیتوں کی طرف بھی متوجّہ ہونا شروع کیا تھا۔

ابّا جی کو میں نے کبھی اپنی طرف زیادہ متوجّہ نہیں پایا تھا۔ شاید ان کی دُوسری دلچسپیاں ہی اتنی تھیں کہ انھیں میری اور امّی کی طرف زیادہ توجّہ دینے کی فرصت نہیں تھی۔ تاہم اتنا ضرور تھا کہ ہمیں کبھی کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔ ہمارے ایک اشارے پر ہر چیز مہیّا ہوتی تھی۔

مجھے صحیح طور پر معلوم نہیں تھا کہ ابّا جی لوگوں پر کیا ظلم و ستم کرتے تھے۔ تاہم یہ اندازہ ضرور تھا کہ ان کے بارے میں لوگوں کی رائے اچھّی نہیں تھی۔ میری موجودگی میں لوگ اُن کے بارے میں باتیں کرتے کرتے خاموش ہو جاتے تھے۔

اس روز امّی سے ان کے بارے میں دیر تک باتیں کرنے کے بعد میرا دل کچھ بوجھل سا ہو گیا۔ کچھ عجیب سی کیفیت تھی۔ ایک بے بسی آمیز غصّہ بھی تھا۔ ایک بے عنوان سا شکوہ بھی تھا۔ جیسا عموماً ان لوگوں سے ہوتا ہے جنھیں آپ اپنا سمجھتے ہیں مگر وہ آپ کی توقعات پر پُورا نہیں اترتے۔ ایک عجیب سی جھنجلاہٹ بھی تھی جیسی آپ اس وقت محسوس کرتے ہیں جب آپ کے سامنے آپ کی فطرت کے خلاف کام ہوتے ہیں۔

اس شام اتفاقاً کھانے کی میز پر ہم یک جا ہوئے۔ ابّا جی کبھی

کبھار ہی گھر میں ہمارے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ امّی کھانے کے دوران منتظر سی نظروں سے اُن کی طرف دیکھتی رہتی تھیں کہ شاید وہ کچھ بولیں مگر وہ گویا گرد و پیش سے بے خبر سر جھکائے کھانا کھاتے رہتے تھے۔ اگر کبھی امّی ہی کوئی بات چھیڑتی بھی تھیں تو وہ ہوں ہاں میں جواب دیتے تھے۔ بالآخر امّی گویا شرمندہ سی ہو کر اٹھ کر چلی جاتی تھیں۔

ایسے موقعوں پر میرا بہُت کچھ کہنے کو دل چاہتا تھا لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیسے اپنے محسوسات کو لفظوں کا رُوپ دوں اور کس طرح میں ایک 'بچّہ' ہوتے ہوئے بڑوں کے اس معاملے میں دخل دوں۔ لیکن اس روز جب امّی اُٹھ کر چلی گئیں تو میں بولے بغیر نہ رہ سکا۔ "آپ امّی سے کچھ اچّھا سلوک نہیں کرتے .... یہ دیکھ کر مجھے افسوس ہوتا ہے۔"

انھوں نے بُری طرح چونک کر میری طرف دیکھا اور زندگی میں پہلی مرتبہ انھوں نے بڑے غور سے میرا سَر تا پا جائزہ لیا پھر عجیب سے انداز میں مسکرائے۔ "تم تو کافی بڑے ہو گئے خُرّم! مجھے پتا ہی نہیں چلا۔"

"یہ میری بات کا جواب نہیں ہے ابّا جی!" میں نے شاید اپنی عمر سے زیادہ سنجیدگی سے کہا۔

نیپکن سے منہ صاف کر کے انھوں نے ایک سگار سُلگایا اور ایک کش لے کر قدرے ہچکچاتے ہوئے بولے۔ "تمھاری بات کا جواب یہ ہے بیٹے کہ میں اپنی دانست میں تمھاری امّی سے بہُت اچھا سلوک کرتا ہوں، ورنہ شاید برسوں پہلے ہمارے درمیان علیحدگی ہو چکی ہوتی۔"

میرے دل پر گھونسا سا لگا۔ شاید میرے تاثرات بدلے تھے جنھیں محسوس کرتے ہوئے ابّا جی ملائمت سے بولے۔ "مانا کہ تم کافی بڑے ہو گئے ہو لیکن پھر بھی ایک باپ کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اولاد کے سامنے ایسی بات کرے لیکن بات چونکہ تم نے ہی چھیڑی ہے، اِس لیے میں سچّا جواب دینے پر مجبور ہوں۔"

میں بھی آج اپنی عمر سے بڑی باتیں کہنے پر تُلا ہُوا تھا۔ میں نے اُن کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "اگر آپ کو امّی اتنی ہی ناپسند تھیں تو آپ کو ان سے شادی نہیں کرنا چاہیے تھی۔"

"یہ شادی ہم نے نہیں، ہمارے بزرگوں نے کی تھی۔" انھوں نے گویا صفائی پیش کی۔ "اس کے بعد شاید تمھاری امّی نے بھی کوشش کی ہو لیکن اس کا مجھے اندازہ نہیں..... تاہم میں نے بڑی کوشش کی کہ ان سے میری انڈر اسٹینڈنگ ہو جائے لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہو سکا۔"

پھر وہ ایک طویل کش لے کر بولے۔ "بہر حال یہ کوئی ایسا سنگین مسئلہ نہیں ہے۔ اس دُنیا میں شاید اسّی فی صد شادی شدہ جوڑوں میں انڈر اسٹینڈنگ نہیں ہے لیکن گاڑی تو بہر حال چلتی ہی رہتی ہے۔" وہ کھُل کھُلے سے انداز میں ہنسے۔ "اور اہم بات یہی ہے کہ کسی نہ کسی طرح گاڑی چلتی رہے ۔۔۔ گزارا ہوتا رہے۔"

میرے ذہن میں بہُت سے خیالات کا سیلاب امڈا۔ بہُت سی باتیں جو افسانوں کہانیوں میں پڑھی تھیں، فلموں اور ٹی وی ڈراموں میں سنی تھیں، یا خود بہ خود ذہن میں آئی تھیں ۔۔۔ مگر میں کچھ بھی نہ کہہ سکا کیوں کہ ایک تو خیالات میرے ذہن میں گڈ مڈ ہو کر رہ گئے۔ دوسرے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں اپنے اور امّی کے لیے رحم کی بھیک مانگنے کی کوشش کر رہا ہوں ۔۔۔ اور یہ احساس قدرے اہانت آمیز سا تھا چنانچہ میں خاموش رہا لیکن ایک لمحے بعد گویا غیر ارادی سے انداز میں میرے منہ سے نکلا۔ "وہ ناچنے گانے والی گندی سی عورتیں آپ کو اچھی لگتی ہیں؟"

انھوں نے مجھ سے یہ نہیں پُوچھا کہ مجھے یہ کیوں کر معلوم ہوا کہ وہ ناچنے گانے والی عورتوں میں دل چسپی لیتے ہیں، بلکہ ملائمت سے بولے۔ "ابھی تم اتنے بڑے نہیں ہوئے کہ ہم اس موضوع پر کوئی گفتگو کر سکیں۔"

پھر ایک لمحے کے توقّف کے بعد وہ بولے۔ "مجھے افسوس ہے خُرّم! کہ تم پر تمھاری ماں کی شخصیت کا اثر ضرورت سے زیادہ ہوتا جا رہا ہے۔ ایک عجیب سادھیا پن ہے تمھارے اندر ۔۔۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تم بہت ٹھنڈے میٹھے قسم کے آدمی نکلو گے ۔۔۔ جب کہ میں تمھیں بہُت تُند خو، سرکش اور شعلہ جوالا قسم کا مَرد دیکھنا چاہتا تھا ۔۔۔ طوفانوں کی طرح بپھرتا ہوا اور زلزلے کی طرح لوگوں کو دہلاتا ہُوا۔ کہ جو کہیں سے بھی گزرے، لوگ دم بہ خود رہ جائیں، سہم جائیں، مبہوت ہو جائیں ۔۔۔ یقین کرو، زندگی صرف ایسے ہی لوگ گزارتے ہیں۔ کیچوے کی طرح بے ضرر سے انداز میں زندگی گزارنا بھی کوئی زندگی ہے؟ میں چاہتا ہوں تم مردانہ قسم کے مشاغل میں دل چسپی لو۔ گھڑ سواری سیکھو، بندوق چلانا سیکھو..... سومنگ سیکھو ۔۔۔ کافی عرصہ پہلے میں نے اُستاد خادم علی کو ہدایت بھی کی تھی کہ وہ تمھیں اس قسم کے کام سکھایا کرے۔"

"اس کے بعد آپ نے خبر نہیں لی۔" میں نے کہا۔ "ورنہ آپ کو معلوم ہوتا کہ مجھے گھڑ سواری بھی آتی ہے، سومنگ بھی اور بندوق چلانا بھی۔ میں کئی مرتبہ شکار پر بھی گیا ہوں۔ اپنی عمر کے حساب سے لڑ بھڑ بھی لیتا ہوں ۔۔۔ لیکن آپ کی طرح میں اُن لوگوں کو ٹھڈے نہیں مار سکتا، جو میرے سامنے سر جھکائے کھڑے ہوں۔"

"وہ بھی ضروری ہوتا ہے برخوردار!" وہ مربیانہ لہجے میں بولے اور غیر ارادی طور پر اپنی گھنی مونچھوں کو بَل دینے لگے۔ "کہنے کو نظام چاہے کچھ بھی ہو لیکن اِس علاقے کے اصل حاکم ہم ہی ہیں۔ اور جب تک ہماری اس علاقے میں دہشت نہیں ہو گی، ہمارا گزارہ مشکل ہو گا۔ تمھیں اندازہ نہیں کہ زمانہ کس ڈگر پر جا رہا ہے۔ اگر ہم تمھاری ماں کی طرح ٹھنڈے میٹھے انسان بن گئے تو لوگ ہمیں بیچ کر کھا جائیں گے۔"

میں انھیں بتانا چاہتا تھا کہ میں بُزدل یا ڈرپوک نہیں ہوں، بات صرف اِتنی سی ہے کہ میں اپنے سے کمزور کو نہیں مار سکتا، کسی ایسے انسان پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا، جو پہلے ہی ہاتھ باندھے کھڑا ہو، ایسے کسی آدمی کو ٹھوکر نہیں مار سکتا، جو پہلے ہی زمین پر گرا پڑا ہو ۔۔۔ لیکن مجھے فوری طور پر اپنے اِن خیالات کو بیان کرنے کا سلیقہ نہ آیا اور میں ایک بار پھر خاموش رہ گیا۔

ابّا جی اٹھ کھڑے ہوئے اور جاتے جاتے میرا کندھا تھپتھپا کر بولے۔ "بیٹا! تمھاری نظر میں یا تمھاری امّی کی رائے میں مَیں کوئی اچھا آدمی نہ سہی، لیکن مجھ میں کم از کم ایک بات بہت اچھی ہے کہ میں اپنے آپ میں مگن رہتا ہوں۔ میں اپنے بچّے ..... حتّٰی کہ اپنی بیوی کی زندگی میں بھی دخل دینے یا اُن پر مسلّط ہونے کی کوشش نہیں کرتا۔ چنانچہ بیٹا .....! تم مزے سے اپنی زندگی گزارو اور مجھے میری زندگی گزارنے دو ۔۔۔ ہو سکے تو کبھی کبھار شکر کیا کرو کہ تمھیں زندگی کی ہر آسائش میسّر ہے۔ ورنہ تم جیسے ٹھنڈے ٹھار لوگوں سے تو لوگ منہ کا نوالہ بھی چھین کر لے جاتے ہیں۔"

وہ چلے گئے اور میں بوجھل سا دِل لیے وہیں بیٹھا رہا۔ امّی اپنے بیڈ رُوم میں تھیں اور شاید عبادت میں مصروف ہو گئی تھیں۔ ابّا جی گھر سے باہر چلے گئے تھے۔ طویل و عریض کمرے میں مَیں تنہا بیٹھا تھا۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا تھا، تنہائی کا یہی احساس دُھند کی طرح میرے حواس پر چھایا ہوا تھا۔ میں بڑا بے خوف سا لڑکا تھا لیکن کبھی کبھی صرف اسی احساسِ تنہائی کی وجہ سے میں اپنے آپ کو بے حد سہما سہما سا محسوس کرتا۔ جیسے میں ایک تنہا پنچھی ہوں۔ نیچے لا متناہی صحرا ہے اور اوپر بیکراں آسمان .... اور میں اُن کے درمیان فضائے بسیط میں تنہا پرواز کر رہا ہوں۔ ننّھا سا دل میرے سینے میں بے طرح دھڑک رہا ہے، کانپ رہا ہے۔

میں، ابّا جی اور امّی ۔۔۔ ایک عجیب مثلّث کی طرح تھے جس کی ہر لکیر دُوسری سے مختلف تھی۔ کبھی کبھی میں گھر میں اپنے آپ کو بالکل اجنبی محسوس کرتا۔ میری سمجھ میں نہ آتا کہ مَیں کون ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں اور مجھے کہاں جانا ہے؟ اپنے آپ سے اور اپنے گرد و پیش سے گھبرا کر میں گاڑی لے کر ویرانوں کی خاک چھاننے نکل جاتا۔ بے مقصد اِدھر اُدھر پھرتا رہتا، کبھی نہر کے کنارے جا بیٹھتا اور گھاس کی پتّیاں توڑ توڑ کر نہر میں پھینکتا رہتا۔

اسی احساسِ تنہائی کے سائے میں مَیں جوان ہوا۔ کالج میں بھی پہنچ گیا لیکن زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ سینے میں جو ایک خلا سا تھا وہ جوں کا توں رہا۔ اشرف بھٹی اور اس جیسے کئی دوسرے دوستوں نے میری زندگی میں کئی رنگینیوں کو متعارف کرانے کی کوشش کی لیکن میں کوئی بہت زیادہ پارسا تو ثابت نہیں ہوا۔ میں نے ہر چیز کو تھوڑا بہُت قریب جا کر ضرور دیکھا مگر کسی میں بھی مجھے کوئی ایسی تسکین محسوس نہیں ہوئی کہ میں اسی کا ہو کر رہ جاتا۔ میں چند ایک مرتبہ گانا سُننے گیا لیکن ان عورتوں کی مشینی اداؤں، سانچے میں ڈھلے ہوئے جسموں اور مشّاقانہ پینتروں میں مجھے کوئی کشش محسوس نہیں ہوئی۔ ان کے لفظ جذبوں سے خالی، ان کی مسکراہٹ رُوح سے محروم، ان کے چہرے پتھر سے تراشے ہوئے اور ان کی نظریں تصنّع سے بھر پور محسوس ہوئیں۔ ان کے پاس بیٹھنا اور ان کی باتوں پر یقین کرنا بڑا بے وقوفانہ سا عمل محسوس ہوا۔ مجھے کوئی لطف نہ آیا۔ میں نے جلد ہی یہ شغلہ ترک کر دیا۔

میں نے پی کر بھی دیکھی۔ پینے کے بعد بہُت سے لوگ زیادہ بولنے لگتے ہیں۔ مجھے پینے کے بعد چُپ لگ جاتی۔ اندر ہی اندر میں اور بھی زیادہ تنہا ہو جاتا۔ دل کے ویرانے میں ایک عجیب، ہولناک سی صدائے بازگشت گونجنے لگتی۔ نہ جانے کن باتوں، کن راتوں کی آہٹ سُنائی دینے لگتی۔ اور میں پچھتانے لگتا کہ میں نے پینے کی حماقت ہی کیوں کی۔ یہ شوق بھی میں نے جلد ہی ترک کر دیا۔ لوگ جن رنگینیوں کے لیے ترستے تھے، مجھے اُن میں کوئی کشش محسوس نہ ہوتی۔ یہ خوشیاں بہُت ہی کھوکھلی سی تھیں۔

لڑکیوں سے بھی ملاقاتیں ہوتیں۔ جب وہ میری چم چم کرتی لمبی سی کار کو دیکھتیں اور انھیں معلوم ہوتا کہ میں ایک بڑے زمیندار کا اکلوتا بیٹا ہوں تو اُن کی آنکھوں میں چمک آ جاتی اور اسی لمحے میرا اُن پر سے اعتبار اُٹھ جاتا۔ بظاہر وہ بے نیاز سی رہتیں مگر اس بے نیازی میں آئے دن ملاقات ہونے لگتی۔ ان کے والدین پر اچانک انکشاف ہوتا کہ میں تو انھیں بالکل گھر کا فرد ہی محسوس ہوتا ہوں۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا جیسے میں نایاب قسم کا سنہری عقاب ہوں، جس کے مارکیٹ میں بڑے زبردست دام لگ سکتے ہیں۔ اسی لیے میرے چاروں طرف شکاری گھات لگائے بیٹھے ہیں۔ مصنوعی باتوں اور بے رُوح لفظوں سے اُکتا کر میں جلد ہی کسی اور سمت میں پرواز کر جاتا۔

وہ جو ایک لافانی سا جذبہ ہوتا ہے کہ خود بہ خود ہی دل کی سنگلاخ زمین سے کسی سرکش چشمے کی طرح پھُوٹتا ہے، وہ جو ایک غیر مرئی سی ڈور ہوتی ہے کہ دو رُوحوں کو ایک بے عنوان سے بندھن میں باندھ دیتی ہے، وہ جو اٹوٹ رشتے ہوتے ہیں کہ بلا ارادہ ہی استوار ہو جاتے ہیں ۔۔۔ وہ سب کچھ میرے لیے ایک خواب ہی رہا۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا کہ یہ سَب باتیں قصّوں، کتابوں، افسانوں اور کہانیوں میں ہی زندہ رہ گئی ہیں، جذبے صرف لفظوں میں مقیّد رہ گئے ہیں، دلوں میں ان کا قیام ختم ہو چکا ہے۔ دُنیا صرف نفع نقصان کے حساب کتاب

کی اسٹاک مارکیٹ ہے۔ موقع محل کے اعتبار سے انسان کے شیئرز کی قیمت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ حسن کے اثاثے زیادہ ہوتے ہیں اُس کے شیئرز ہاتھوں ہاتھ بکنے لگتے ہیں، اور مفلس کے لیے ہمیشہ مندی کا رُجحان رہتا ہے۔

مجھے اپنے دل کی سُنسان رہگزر پر گویا ہمیشہ کسی کا اِنتظار رہتا۔ یوں لگتا جیسے کسی کو آنا ضرور ہے مگر اُس کی آمد میں بے سبب تاخیر ہوئے جا رہی ہے۔

اباجی کی فرعونیت کا وہی عالم تھا اور ان کی یہی عادات و اطوار مجھے ان سے مزید دُور لے گئی تھیں۔

ایک بار میں اپنی آوارہ گردی کے دَوران ڈیرے کے قریب سے گزرا تو گھٹی گھٹی چیخوں کی آواز سن کر ایک محفوظ گوشے سے بیرونی دیوار پھلانگ کر اندر پہنچا۔ اندرُونی عمارت کی کھڑکیاں بھی اُس روز بند تھیں تاہم ایک کھڑکی میں اِتنی دَرز موجود تھی کہ اندر کا منظر دیکھا جا سکتا تھا۔

بڑے سے ہال میں بہت سے لوگ موجود تھے۔ ایک سرے پر اباجی آرام کرسی پر نیم دَراز تھے۔ اس وقت سگار کے بجائے حُقّے کی نَے اُن کے ہونٹوں میں دبی ہوئی تھی اور وہ بڑے آسُودہ انداز میں دھیرے دھیرے حقہ گڑگڑا رہے تھے، گویا اس وقت نہایت مدھر موسیقی سنتے ہوئے سستا رہے ہوں۔ جبکہ ان کے سامنے ایک شخص چھت سے اُلٹا لٹکا ہوا تھا۔

چھت میں موجود آہنی ہُک سے ایک رسّی گزاری گئی تھی جس کا ایک سرا ایک کھڑکی کی سلاخوں سے بندھا ہوا تھا۔ دوسرے سرے پر وہ بدنصیب اس طرح اُلٹا لٹکا ہوا تھا کہ اس کی بوسیدہ سی دھوتی اور میلی سی واسکٹ اس کے تن کی عُریانی کو چھپانے سے قاصر تھی۔

ایک موٹا سا سیاہ فام جلّاد نما آدمی جسے میں شکورے کے نام سے جانتا تھا، ایک مضبوط اور لمبا سا بَید ہاتھ میں لیے پُوری قوت سے گھما گھما کر اس کے جسم پر رسید کر رہا تھا۔ یہ دیکھے بغیر کہ بَید کہاں لگ رہا ہے۔ ہر ضرب پر وہ شخص دلدوز انداز میں چیخ رہا تھا جبکہ حاضرین میں سے کئی مسکرا رہے تھے۔ اس شخص کے ہاتھ بھی بندھے ہوئے تھے۔ اور نیچے کو جھُول رہے تھے۔

اسی دَوران میں ایک صاحب بولے۔ "یہ تو بہت ہی زیادہ گلا پھاڑ رہا ہے.... شکورے! اس کے حلق میں کچھ ٹھونس دے۔"

شکورے نے اُس کے مُنہ میں کپڑا ٹھونسا، اوپر بھی کس کر کپڑا باندھا اور پھر موٹا بید شاں شاں کی آواز کے ساتھ اس پر برسانا شروع کر دیا۔ اب اس شخص کی آواز تو معدوم ہو چکی تھی مگر ہر ضرب پر اُس کا جسم جس طرح جھٹکے لیتا تھا، وہ منظر بڑا اذیّت ناک تھا۔

صرف وہی نہیں، تقریبًا اسی سے ملتے جلتے حُلیے کے دو اور آدمیوں کو ہمارے آدمی مضبوطی سے پکڑے کھڑے تھے۔ اُن کے ہاتھ اُن کی پُشت پر بندھے ہوئے تھے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے تیسرے شخص کی سفّاکانہ انداز میں پٹائی ہوتے دیکھ رہے تھے اور تھر تھر کانپ رہے تھے۔ اُن کے بال بکھرے ہوئے تھے اور شیو بڑھی ہوئی تھی۔ وہ ہمارے گاؤں کے معلوم نہیں ہوتے تھے لیکن تھے غالبًا مزارعے ہی۔

بالآخر مار کھانے والے کی آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ بے جان سے انداز میں اِدھر اُدھر جھُولنے لگا۔ وہ یقینًا بے ہوش ہو گیا تھا۔

اباجی نے حقّے کی نَے ہونٹوں سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ "بس کرو شکورے! اسے تو معلوم ہو گیا ہو گا کہ ہمارے خلاف گواہیاں کیسے دی جاتی ہیں اور مُخبریاں کیسے کی جاتی ہیں۔ اب ذرا اِن دونوں کو بھی بتاؤ۔"

وہ دونوں رونے، گڑگڑانے اور مُعافیاں مانگنے لگے۔ اُن کی آہ وزاری مجھ جیسے اِنسان کا دِل ہلا دینے کے لیے کافی تھی مگر اباجی اسی طرح اِطمینان سے نیم دراز، حقّہ گڑگڑا رہے تھے۔

میری کنپٹیاں تپنے لگیں۔ ایک لمحے کے لیے میرا جی چاہا کہ اندر گھُس پڑوں لیکن پھر مجھے اندازہ ہوا کہ میں شاید اس سفّاکانہ ڈرامے کو رُکوا نہیں سکوں گا اور وہاں موجود لوگوں کے سامنے بات کچی ہو گی۔ میں بزدلوں کی طرح ڈیرے سے باہر آ گیا۔

دو دن بعد گھر میں میرا اباجی سے سامنا ہوا۔ میں نے بظاہر سرسری سے لہجے میں کہا۔ "پرسوں میں ڈیرے کے قریب سے گزرا تو مجھے کربناک چیخیں سُنائی دیں۔ میں نے سنا ہے مظلوموں کی چیخیں آسمان ہلا دیتی ہیں۔ لیکن آج کل شاید کوئی شیطانی طاقت ان چیخوں کو آسمان تک پہنچنے نہیں دیتی.... راستے ہی میں روک لیتی ہے۔"

اباجی نے کڑی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "بعض لوگ اتنے مظلوم ہوتے نہیں جتنے نظر آتے ہیں۔"

"ہر ظالم کا مظلوم کے بارے میں یہی خیال ہوتا ہے۔" میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"خُرّم!" وہ قدرے درشت لہجے میں بولے۔ "میں بہت آزاد خیال آدمی ہوں، لیکن کچھ حدود ایسی ہیں، جن میں دخل اندازی میں قطعًا برداشت نہیں کرتا۔"

"افسوس تو یہی ہے کہ دخل اندازی کرنے کی میں اپنے اندر طاقت محسوس نہیں کرتا۔" میں نے افسردہ سی نظروں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ان کی موٹی موٹی آنکھوں میں ایک ہی لمحے میں سُرخی اُتر آئی تھی اور اوپر کو اُٹھی ہوئی گھنی مُونچھیں لرز کر رہ گئی تھیں میرا قد چھ فٹ تھا لیکن وہ قد میں مجھ سے بھی نکلتے ہوئے تھے اور انھیں دیکھ کر کوئی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ایک لمبے تڑنگے جوان بیٹے کے باپ ہیں۔ جن نظروں سے وہ میری طرف دیکھ رہے تھے ان سے میں نے ایک لمحے کے لیے خوف سا محسوس کیا۔ وہ ایک باپ کی نظریں ہرگز نہیں تھیں۔

"میں تھیں مشورہ دُوں گا کہ چہل قدمی یا آوارہ گردی کے دَوران اپنا رُخ ڈیرے کی طرف نہ رکھا کرو تو اچھا ہے۔" وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولے۔ "مجھے اچھا معلوم نہیں ہو گا کہ میں اپنے آدمیوں کو یہ خیال رکھنے کا حکم دوں کہ تم ڈیرے کی طرف نہ آنے پاؤ۔ تم خود ہی اس سلسلے میں احتیاط کرو تو اچھا ہے۔"

ایک اسی واقعے کی بات نہیں تھی، اس سے ملتے جلتے نہ جانے کتنے مناظر میں ڈیرے پر دیکھ چکا تھا اور اس دن کی گفتگو کے بعد خود میں نے بھی محسوس کیا کہ میرے حق میں یہی بہتر تھا کہ ڈیرے کی طرف نہ جاؤں۔ یہ اداس ذہن کو مزید کچھ کے لگانے کا راستہ تھا۔ میں نے وہ راستہ چھوڑ دیا۔

لیکن کبھی کبھی راستے آپ کو نہیں چھوڑتے۔

ایک روز میں جیپ میں نہر کے کنارے کنارے پُشتے پر جا رہا تھا کہ نشیب میں کافی فاصلے پر میں نے اپنی فصلوں کے درمیان سے ایک لڑکی کو نکلتے دیکھا۔ وہ حواس باختگی کے عالم میں دوڑ رہی تھی۔ اتنی دُور سے بھی میں دیکھ سکتا تھا کہ اس کے لباس کی حالت اچھی نہیں تھی۔ تین آدمی اس کے تعاقب میں تھے اور ان میں سے ایک کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ میں نے جیپ اسی طرف موڑ لی۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ لڑکی نے جیپ کو اپنی طرف آتے دیکھ کر اپنا رُخ بدل لیا اور گرتی پڑتی ایک اور سمت میں بھاگنے لگی۔ لیکن میں نے رُخ تھوڑا سا بدل کر جیپ اس کے قریب جا روکی اور تب ہی میں نے اُسے پہچانا۔

وہ نوجوانی میں بیوہ ہو جانے والی ایک حسین لڑکی بلقیس تھی۔ گاؤں کے ایک دُور افتادہ سرے پر وہ غالبًا اپنے بوڑھے باپ کے ساتھ رہتی تھی۔

مجھے اندیشہ تھا کہ وہ ڈیرے ہی کی طرف سے دوڑی آ رہی تھی اور اُس کے تعاقب میں آنے والے ہمارے ہی آدمی تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ کچھ دُور ہی رُک گئے۔ میں جیپ سے اتر آیا۔ بلقیس بری طرح ہانپ رہی تھی لیکن اس کی حالت صرف دوڑنے کی وجہ سے ہی غیر نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر خراشوں وغیرہ کے نشان بھی تھے

ایک لمحے کے لیے تذبذب کے عالم میں رکنے کے بعد اُس نے پھر بھاگنے کی کوشش کی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے بھی خوف زدہ تھی۔ میں نے اس کی کلائی پکڑ لی اور اسے بھاگنے سے باز رکھتے ہوئے کہا۔ "مجھ سے کیوں ڈر رہی ہو؟"

اس کے منہ سے گویا غیر اِرادی طور پر نکلا۔ "ظاہر ہے، بیٹا باپ سے مختلف تو نہیں ہو گا۔"

اس لمحے مجھے اپنے آپ سے شرم آئی۔ اپنی ندامت سے فرار چاہتے ہوئے میں نے ان تینوں آدمیوں کی طرف دیکھا۔ ان میں سے صرف ایک کا نام مجھے معلوم تھا۔

"کیا قِصّہ ہے امیرالدین؟" میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

"کچھ نہیں ملک صاحب!" امیرالدین نے بندوق سے کھیلتے ہُوئے قدرے بے رُخی سے کہا۔ "بس بڑے ملک صاحب نے اسے بلایا ہے۔ یہ کوئی چکّر بازی کر کے بھاگی ہے۔"

"قِصّہ ان سے کیا پُوچھتے ہو۔ مجھ سے پوچھو۔" بلقیس ٹوٹتے ہوئے لہجے میں بولی۔ "بہت لوگوں سے سُن رکھا تھا کہ کبھی ڈیرے کے قریب سے نہ گزرنا۔ آج کسی مجبوری سے اُدھر سے گزرنا پڑ گیا۔ بڑے ملک صاحب نے اٹھوا لیا۔ خود تو انھوں نے جو کیا سو کیا....."

اس کی آواز پھُولی پھُولی سانسوں اور اُمنڈتے آنسوؤں میں گھُٹ کر رہ گئی۔ بمشکل وہ دوبارہ بولی۔ "اس کے بعد مجھے یوں دُوسروں کے سامنے پھینک دیا جس طرح سیر ہونے کے بعد لوگ ہڈیاں بھوکے کتّوں کے سامنے پھینک دیتے ہیں۔ میں کسی طرح بھوکے کتّوں کے نرغے سے نکل بھاگی.... لیکن قسمت تو میری پیدائشی طور پر ہی خراب ہے نا.... آگے تم مل گئے.... معلوم نہیں میرا حشر کیا ہو گا؟"

میں نے اس کی کلائی چھوڑ دی۔ وہ یک دم زمین پر بیٹھ گئی جیسے اس کی ہمت ٹوٹ گئی ہو اور مزید بھاگنا اس کے بس کی بات نہ رہی ہو۔ وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

امیرالدین بڑے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔ "اس کی باتوں میں نہ آنا ملک صاحب! بڑی فتنہ چیز ہے۔ اس وقت پارسا بن رہی ہے۔ گاؤں کا کون سا نوجوان ہے جو اس سے بچا ہو۔ اس کا سارا مسئلہ پیسے کا ہوتا ہے۔ ہم سے بھی بات پیسے پر بگڑی ہے..."

بلقیس نے گویا تڑپ کر اس کی طرف دیکھا مگر پھر جیسے کسی انجانی دہشت کے باعث کچھ نہ کہہ سکی تاہم کمزور انسان بددُعا تو دیتا ہی ہے۔ چند لمحے ہچکیاں لینے کے بعد وہ شکست خوردہ لہجے میں بولی۔ "میں نے اپنے بزرگوں سے سُنا تھا کہ ملک صاحب کے بڑے بُوڑھے سب اس علاقے میں عزّتوں کے رکھوالے تھے.... کمزوروں کے مددگار تھے.... لیکن شاید ہم سے ہی کوئی ایسا گناہ سرزد ہوا ہے، جو ہمارے سروں پر عذاب مسلّط ہوا ہے..." وہ ایک بار پھر گھٹنوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ مجھے یہ جان کر دُکھ ہوا کہ میرے بارے میں شاید کوئی نہیں جانتا تھا کہ میں اپنے باپ سے بہت مختلف اِنسان ہوں۔

تاہم میں نے صفائی پیش کرنا ضروری نہیں سمجھا اور سخت لہجے میں امیرالدین کو مخاطب کیا۔ "تم لوگ واپس جاؤ۔ یہ لڑکی اپنے گھر جائے گی۔"

"دیکھ لیں جی.... بڑے ملک صاحب ناراض ہوں گے۔" امیرالدین

بندوق کندھے پر لٹکاتے ہوئے بولا۔" وہ ایک بار آپ کا ذکر کرتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ وہ اپنے معاملات میں آپ کی مداخلت بھی پسند نہیں کرتے۔"

"مداخلت کا بچہ....." میں یک لخت ہی چلّا اٹھا۔"میں کہہ رہا ہوں دفع ہوجاؤ یہاں سے..... ملک صاحب جو کچھ کہیں گے وہ میں خود دیکھ لوں گا۔"

وہ خاموش تو رہا لیکن گستاخانہ انداز میں میری طرف دیکھتا رہا تب میں نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پہ ایک گھونسا رسید کیا۔ وہ الٹ کر دُور جا گرا۔ اس کی بندوق ایک طرف جا گری۔ دوسرے دو جو نہتّے تھے، خود ہی مزید کچھ پیچھے ہٹ گئے۔ امیرالدین مُنہ سے خُون پونچھتا ہوا اٹھا اور خاموشی سے اپنی بندوق اٹھا کر واپسی کے لیے مڑ گیا۔ باقی دونوں آدمیوں نے بھی اس کی تقلید کی۔ اب امیرالدین نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا بھی نہیں۔ شاید وہ یہی زبان بہتر طور پر سمجھتا تھا جو میں نے آخر میں استعمال کی تھی۔

بلقیس اب سر اٹھائے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ آنسوؤں سے بھیگی اس کی وحشی آنکھوں میں حیرت تھی۔

"چلو..... میں تمھیں تمھارے گھر چھوڑ آؤں۔" میں نے اسے جیپ میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

قدرے ہچکچاہٹ کے بعد وہ بولی "بس مجھے اتنی دُور چھوڑ آؤ کہ میں دوبارہ بھوکے کتّوں کے نرغے میں نہ پھنس سکوں۔ گھر تک میں تمھارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔"

"کیوں؟" میں نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"لڑکی کی شکل ذرا اچھی ہو اور جوانی میں بیوہ ہو جائے تو وہ سہاگ کے ساتھ ساتھ اس معاشرے میں شاید اعتبار بھی کھو دیتی ہے۔ اکیلی جاؤں گی تو ان خراشوں کا، ان نشانات کا کوئی لنگڑا لُولا جواز گھڑ لوں گی.... تمھارے ساتھ جا کر تو ماتھے پر لگی ہوئی کالک کبھی دھو ہی نہیں سکوں گی۔"

"اپنے باپ کو جا کر اپنے حُلیے کے بارے میں کیا بتاؤ گی؟" میں نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے پوچھا۔

"باپ کی تو خیر ہے..... اس کی نظر بہت کمزور ہے۔ تقریباً نابینا ہی ہے۔ مجھے اُس کی فکر نہیں۔ اصل فکر تو یہ ہے کہ کسی اور نے دیکھ لیا تو کیا کہوں گی؟ لوگوں کو تو مجھ میں وہ چیزیں بھی نظر آجاتی ہیں جو ہوتی نہیں ہیں۔" اس کی آواز میں بلا کا زہر تھا۔ آستین سے چہرہ پونچھتے ہوئے بولی "جو کچھ میں نے اب تک سُنا ہے..... اور جو کچھ آج میرے ساتھ ہوا ہے، اس کے بعد تو میں سوچ رہی ہوں کہ میں طوائف ہی بن جاتی تو اچھا تھا۔ بڑا گھاٹے کا سودا ہے کہ عورت کو ذلتیں تو طوائف سے زیادہ برداشت کرنا پڑیں اور بھوکی بھی مرتی رہے..... عزت دار کہلانے کی آرزو میں ہر رات اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا گھونٹ کر سوتی رہے۔"

میں نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے بال جو تھوڑی سی دیکھ بھال سے کسی شاعر کی تشبیہات سے زیادہ حسین نظر آسکتے تھے، اس وقت مٹی میں لتھڑے ہوئے تھے اور ان میں تنکے پھنسے ہوئے تھے۔ اس کے رسیلے ہونٹ، جن کی ایک جنبش سے جانے کون کون ہمہ تن گوش ہو سکتا تھا، اس وقت زخمی تھے۔ اُن سے لہو رِس رہا تھا۔ ڈوبتے سورج کی کُندنی کرنوں میں اس کی شکستہ حالی اردگرد کے سارے خوب صُورت منظر پر کوڑھ کے داغ کی طرح چمک رہی تھی۔

اس کے لہجے کا زہر میری رگ و پے میں اُتر گیا تھا۔ میں اس سے شرمندہ تھا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر اس سے مُعافی مانگنا چاہتا تھا مگر مجھ میں جیسے سکت ہی نہیں رہ گئی تھی۔ نہ جانے کس طرح بس میں ڈرائیونگ کرتا جا رہا تھا۔ پھر معلوم نہیں کیوں اور کیا سوچ کر میں نے ایک لمحے کے لیے جیپ روک کر پرس نکالا اور پانچ سو روپے نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "یہ رکھ لو..... کسی کام آجائیں گے۔"

اس نے عجیب سے انداز میں میری طرف دیکھا اور میں اس سے نظر ملانے کی ہمت نہیں کر سکا۔ میٹھی میٹھی سی آواز میں وہ بولی "کیا تم لوگوں کے خیال میں پیسے سے ہر نقصان کی تلافی ہو جاتی ہے؟ تمھارے باپ نے بھی مجھے رقم دینے کی کوشش کی تھی اور جب میں نے رقم پر تھوک دیا تو رقم کے بغیر ہی....."

اس نے جیپ سے باہر تھوک دیا اور پہلے سے کمزور آواز میں بولی "شاید اس سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ طاقت ور کی سودے بازی کو ٹھکرانا نہیں چاہیے، دُہرا نقصان ہوتا ہے....." پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی "تم کس لیے یہ رقم دے رہے ہو؟"

میں کوئی صحیح جواب نہ دے سکا۔ مبہم سے لہجے میں میں نے کہا "بس یُوں ہی....." پھر میں نے جیپ آگے بڑھا دی۔ نوٹ اس نے تھامے نہیں تھے۔ اس کی گود میں پڑے تھے۔ جیپ چلی تو اُس کا شکستہ دامن ہوا سے پھڑ پھڑایا اور نوٹ ہوا میں اڑ گئے۔ وہ عجیب سے انداز میں ہنس دی۔ اس کی ہنسی کسی کھنڈر میں ابھرنے والی آوارہ رُوح کی کراہ سے مشابہ تھی۔ معلوم نہیں وہ کیوں ہنسی تھی؟ یا پھر شاید وہ روئی تھی۔

میں تاریخ کے وَرق الٹ کر اپنی یادداشت کے نہاں خانوں میں دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ جب کوئی گوشۂ زمین وہاں کے باسیوں پر تنگ ہو جاتا ہے تو اس کا انجام کیا ہوتا ہے؟

گاؤں کے نواح میں ہی وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے بولی "بس..... بس مجھے یہیں اتار دو۔"

جیپ رکنے پر وہ اتر کر آنکھیں سکیڑتے ہوئے میری طرف دیکھ کر بولی "مجھے اب بھی یقین نہیں آرہا کہ تم اسی باپ کے بیٹے ہو۔"

پھر وہ مڑی اور تیز تیز..... مگر غیر متوازن قدموں سے گاؤں کی طرف چل دی۔

اسی شام میں نے سُنا کہ اباجی شہر چلے گئے ہیں۔ دو دن گزر گئے۔ میں آنسوؤں کا غبار سینے میں لیے پھرتا تھا۔ اور جب میرا ان سے سامنا ہوا تو موقع مناسب پا کر میں نے کہا "کبھی کبھی مجھے اس بات پر شرم آتی ہے کہ میں آپ کا بیٹا ہوں۔"

"مجھے بھی اس بات پر شرم آتی ہے۔" وہ اطمینان سے بولے اور شال کندھوں پر ڈال کر دروازے کے قریب جا کر انھوں نے جملہ مکمل کیا "..... کہ میں تم جیسے بیٹے کا باپ ہوں۔" وہ بڑے بارعُب انداز میں قدم اٹھاتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

..... اور ان دنوں میں بی اے کے رزلٹ کا انتظار کر رہا تھا جب اباجی نے ایک اور عجیب قدم اٹھایا جس نے میرے ذہن میں پلتے ہوئے آتش فشاں کی بھڑلنا کی کچھ اور بڑھا دی۔

میں اور امّی اس روز برآمدے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ اباجی کی گاڑی ڈرائیو وے میں داخل ہوئی اور وہ ایک نہایت حسین اور نوخیز لڑکی کا ہاتھ تھامے کار سے اترے۔ لڑکی خوب بنی سنوری ہوئی تھی اور بڑے ناز و ادا سے قدم اٹھا رہی تھی۔ لباس وغیرہ سے وہ حتی الامکان معزز نظر آرہی تھی لیکن یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ اس کا تعلق عورتوں کے ایک مخصوص طبقے سے تھا۔ کسی نہ کسی حوالے سے وہ طوائف تھی یا طوائف زادی۔

میں اور امّی دم بخود کھڑے انھیں آگے آتے دیکھ رہے تھے۔ اباجی کی دیدہ دلیری میں کوئی کلام نہیں تھا۔ وہ ذرا بھی ہچکچاہٹ یا تذبذب کا مظاہرہ کیے بغیر اپنے مخصوص بارعُب انداز میں گردن اٹھائے، اس لڑکی کا ہاتھ تھامے برآمدے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

برآمدے میں پہنچ کر انھوں نے کچھ دُور کھڑی ہوئی ملازمہ کو آواز دے کر بلایا "ریشماں! اوپر جو گیلری والا بیڈروم ہے نا..... بی بی جی کو وہاں چھوڑ کر آ..... اور گاڑی سے ان کا سامان بھی اتار کر وہیں پہنچا دے۔ اور اب خود بھی وہیں اوپر ہی رہنا۔ بی بی جی کو جس چیز کی بھی ضرورت ہو، فوراً حاضر کرنا۔"

اندر جانے سے پہلے اس لڑکی نے محض اچٹتی سی نظروں سے ہماری طرف دیکھا پھر گرد و پیش پہ ایک نظر ڈالی اور اس ایک سرسری سی نظر میں اس نے گویا سب کچھ دیکھ لیا، سب کو سمجھ لیا اور ہر چیز کی گہرائی کو پہنچ گئی۔ وہ کوئی معمولی چیز نہیں تھی۔

اباجی اپنی تمام تر بے پروائی، عیش پرستی اور فرعونیت کے باوجود آج تک کبھی کسی عورت کو گھر نہیں لائے تھے۔ اب اگر ایک زمانے کے بعد، اس عمر میں ایک گرگِ باراں دیدہ اس مرحلے تک آن ہی پہنچا تھا تو اس کے پیچھے یقیناً کسی عام سی عورت کا ہاتھ نہیں ہو سکتا تھا۔

وہ لڑکی ریشماں کی رہنمائی میں نہایت نپے تُلے انداز میں ہال میں داخل ہو رہی تھی جہاں سے سیڑھیاں اوپر کی منزل پر جا رہی تھیں۔ میں نے امّی کی طرف دیکھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے لڑکی کو جاتے دیکھ رہی تھیں۔ ان کا چہرہ یک دم پیلا پڑ گیا تھا۔ اتنی پیلاہٹ میں نے ان کے چہرے پر زندگی میں کبھی نہیں دیکھی تھی۔

اباجی سامنے ہی کھڑے تھے اور گویا منتظر تھے کہ اُن سے کچھ پوچھا جائے اور بالآخر امّی نے سرسراتی ہوئی آواز میں پُوچھ ہی لیا "کون تھی یہ.....؟"

"اس کا نام گلشن آرا ہے۔" اباجی نے گویا تہذیب و اخلاق کے تقاضے پُورے کرتے ہوئے تعارف کرایا "اور میں اس سے شادی کرنے والا ہوں۔ بہتر تو یہی تھا کہ میں شادی کرنے کے بعد ہی اسے اس گھر میں لاتا لیکن حالات کچھ ایسے ہو گئے کہ مجھے فوری طور پر لانا پڑا۔ مہینہ ڈیڑھ مہینہ یہ ایک مہمان کی طرح یہاں رہے گی۔ اس کے بعد میں باقاعدہ اس سے شادی کر لوں گا۔ امید ہے تم اس سلسلے میں رکاوٹ بننے کی کوشش نہیں کرو گی۔ میں نے زندگی میں کبھی تمھیں کوئی تکلیف نہیں دی اور آئندہ بھی نہیں دوں گا۔ تمھیں میری اس شادی سے یا گلشن آرا کی ذات سے خوف زدہ ہونے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔"

"میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی شہریار ملک!" امّی نے سرگوشی نما لہجے میں کہا۔ ان کے جسم پہ ہلکی سی لرزش طاری تھی اور آنکھیں بہت عجیب انداز میں پھیلی ہوئی تھیں۔ چہرے کی پیلاہٹ ایک خطرناک قسم کی سفیدی میں تبدیل ہو رہی تھی، جیسے ان کے کسی نادیدہ گھاؤ سے بہت تیزی سے خون بہہ رہا ہو اور لحظہ بہ لحظہ ان کی شریانیں لہو سے خالی ہوتی جا رہی ہوں۔

"کیوں.....؟ آخر تمھیں اس پر اعتراض کیا ہے؟" اباجی کی پیشانی پر نخوت کی شکنیں اُبھر آئیں "تمھیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تم اسی طرح اس گھر پہ راج کرتی رہو گی۔ ہر آسائش..... ہر سہولت تمھیں حاصل رہے گی۔ گلشن تمھاری کسی بات میں، کسی کام میں دخل نہیں دے گی..... تمھیں اور کیا چاہیے؟"

"میں نے کہا نا کہ میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی..... نہیں ہونے دوں گی۔" امّی نے گُھٹی گُھٹی سی آواز میں کہا۔ اندر ہی اندر اُن کی حالت گویا مجنونانہ سی ہوتی جا رہی تھی۔

"تمھارے اندر سب سے بڑی خرابی یہی رہی ہے کہ شوہر کی خوشیاں تمھیں کبھی عزیز نہیں رہیں۔" اباجی نے بدمزگی سے کہا۔

"یہ طریقہ ہوتا ہے شوہر کی خوشیاں پُوری کرنے کا؟" امّی نے زخمی نظروں سے ان کی طرف دیکھا "زندگی بھر تم نے جو چاہا کیا

لیکن میں ایک عضوِ معطّل کی طرح اِس گھر میں پڑی رہی اور دیواروں سے باتیں کرتے کرتے بوڑھی ہوگئی۔ صرف اس بچّے کی خاطر میں نے سب کچھ برداشت کیا.....؟" انھوں نے کانپتے ہاتھ سے میری طرف اشارہ کیا۔ "لیکن اب عمر کے اس دَور میں مَیں یہ ذلّت برداشت نہیں کروں گی کہ کسی سوکن کو بھی میرے سَر پہ لا بٹھایا جائے۔ جہاں تم نے اور نہ جانے کس کس طرح خاک پھانکی ہے، وہاں اس عورت کو بھی صرف داشتہ رکھ لو..... وہ میں برداشت کرلوں گی لیکن اس سے تمھاری شادی میں نہیں ہونے دوں گی۔"

"اس طرح وہ رہنے کے لیے تیار نہیں ہے۔" بے ساختہ ابّا جی کے مُنہ سے نکلا۔ "تم عورتوں کی عقل بھی الٹی ہوتی ہے۔ ناک سیدھی طرح نہیں پکڑنے دیتیں، گھُما کر پکڑ لی جائے تو کوئی بات نہیں۔" پھر اُن کے لہجے میں اُن کی مخصوص کرختگی اور تحکّم عود کر آیا۔ "مجھے وہ راستہ اِختیار کرنے پہ مجبور مت کرو، جس سے میں بچنا چاہتا ہوں۔"

"کون سا راستہ؟" امّی نے پلک جھپکائے بغیر ان کی طرف دیکھا۔

"میں تمھیں طلاق بھی دے سکتا ہوں۔" ابّا جی نے بلا تامّل کہا۔

میری رگ رگ میں دھیرے دھیرے چنگاریاں سُلگ رہی تھیں۔ میں نے ایک ٹک ابّا جی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور اگر میں اس شادی کو رکنے کی کوشش کروں؟" مجھے خود یہ محسوس کرکے بڑی حیرت ہوئی کہ میرا لہجہ بالکل ہموار تھا۔ امّی کے وجود میں تو اندر ہی اندر کوئی خوفناک ہیجان، آتش فشاں کی طرح بل کھا رہا تھا لیکن میں اندر سے بالکل برف ہوگیا تھا۔ بس اس برف میں کہیں کہیں چنگاریاں سُلگ رہی تھیں۔

"تو میں تمھیں عاق کردوں گا۔" انھوں نے دوٹوک لہجے میں جواب دیا۔ وہ لڑکی، جس کا نام گلشن آرا تھا، یقیناً بڑی جادوگر تھی اس کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔

"شہریار.....!" امّی دانت پیس کر بولیں لیکن اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکیں۔ اُن کے دانت سختی سے بھنچ گئے اور پھر یک دم وہ سینہ تھام کر اس طرح برآمدے کے فرش پہ گریں کہ میں بھی انھیں تھام نہ سکا۔

میں یک دم گھبرا کر اُن پر جھکا اور انھیں سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔ اُن کے چہرے پہ پسینے کی بوندیں اُبھر آئی تھیں۔ ابّا جی بھی پاس بیٹھ گئے۔ نوکر چاکر بھی دوڑے آئے۔ کوئی پانی لا رہا تھا۔ کوئی پنکھا جھلنے کی کوشش کررہا تھا۔

میں نے اُن کی نبض ٹٹولی۔ نبض دھیرے دھیرے معدوم ہورہی تھی دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کی۔ وہ بھی دھیرے دھیرے تھم رہی تھی۔

"امّی.....؟" میں بے اِختیار رو دینے کے سے انداز میں چلّا اٹھا انھیں یقیناً فوری طور پہ اسپتال لے جانا ضروری تھا۔ میں نے انھیں اٹھا کر ابّا جی کی مدد سے گاڑی میں ڈالا۔ ابّا جی آگے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے اور ہم آندھی طوفان کی طرح لاہور کی طرف روانہ ہوگئے۔

لیکن یہ ایک رائیگاں سفر تھا۔

پکّی سڑک پر پہنچنے کے بعد ہم نے بمشکل ایک میل سفر کیا ہوگا۔ جب میں نے امّی کی نبض دیکھی اور دھڑکن محسوس کرنے کی کوشش کی — اُن کی ذات کے کھنڈر میں گہرا سنّاٹا چھا چکا تھا۔

بہر حال ہم نے لاہور کا سفر ملتوی نہیں کیا۔ راستے بھر میں اندر ہی اندر چُپکے چُپکے روتا رہا۔ میو اسپتال پہنچ کر تصدیق ہوگئی کہ وہ اس دُنیا سے رخصت ہوچکی تھیں۔ دل کا دَورہ انھیں اِس ہرجائی دُنیا سے بہت دُور لے گیا تھا۔ کبھی واپس نہ آنے کے لیے بالآخر ان کا قدم اُٹھ ہی گیا تھا۔

جب ہم امّی کی نعش گاڑی میں لیے رات گئے واپس آرہے تھے تو بظاہر ابّا جی بھی مغموم نظر آرہے تھے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ راستے کی دیوار گر جانے پر دل میں وہ کیا محسوس کررہے تھے۔

راستے میں وہ قدرے پشیمان اور دھیمے لہجے میں بولے۔ "مجھے نہیں معلوم تھا ثریا اس بات کو اس حد تک دل پہ لے گی..... یہ کوئی ایسی انہونی..... انوکھی بات تو نہیں تھی..... ہم جیسے لوگ چار چار شادیاں کرلیتے ہیں.....۔"

وہ بدستور اپنے اُوپر سے احساسِ جُرم کا بوجھ کم کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ میں خاموش رہا۔ میرا کچھ بولنے کو، اُن سے کچھ کہنے کو، ان کی طرف دیکھنے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا۔ بس میں امّی کا سر زانو پہ رکھے راستے بھر ایک ٹک اُن کا چہرہ دیکھتا آیا جس میں ذرّہ بھر بھی تبدیلی نہیں آئی تھی — بس یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی کٹھن راستے پر چلتے چلتے تھک کر سوگئی ہیں۔

بچپن سے وہ جو ایک بے عنوان احساسِ تنہائی سانپ بن کر ڈستا تھا لیکن صرف امّی کے وجود کی بدولت جس کی اذیّت مجھے زیادہ محسوس نہیں ہوتی تھی، اب وہی احساسِ تنہائی ایک عفریت بن کر سامنے کھڑا تھا۔ زندگی بے اماں، بے سائباں ہوکر رہ گئی تھی۔ چاروں طرف بس ایک جلتا ہوا صحرا تھا۔ اور کچھ بھی نہیں — وہ شبنمی چہرہ جس کے دم سے دلِ جاں کو ٹھنڈک میسّر تھی، اب خاک میں پنہاں ہونے کے لیے عازمِ سفر تھا۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ امّی جیسی ہستی یوں اچانک بھی میرا ساتھ چھوڑ کر جاسکتی ہے۔

دسویں تک تو گھر پہ سوگواری و افسردگی کا راج رہا۔ اس کے بعد میرے محسوسات کے سوا باقی ہر چیز گویا معمول پہ آگئی۔ ابّا جی کے چہرے پر وہ جو حزن و ملال اور افسردگی کا ایک موسم آیا تھا، وہ گزر گیا۔ تاہم مرنے والی کا احترام انھوں نے اس حد تک ضرور رکھا کہ وہ اوپر گلشن کے پاس کم ہی جاتے تھے۔ زیادہ تر وہ ڈیرے پر ہی رہتے ملازمائیں وغیرہ گلشن کی ہر ضرورت کا خیال رکھتیں۔ معلوم نہیں وہ اوپر اپنے روز و شب کس طرح اور کس مصروفیت میں گزارتی تھی۔ وہ کبھی نیچے نہیں آئی اور میں بھی کبھی اُوپر نہیں گیا۔ سوئم کے بعد میں نے اس کی شکل نہیں دیکھی۔ اسی روز اس کے اوپر جانے کے بعد ابّا جی گویا مجھے سُنانے کے لیے گھر کے ایک خاص نوکر فیض بخش سے کہہ گئے تھے — "فیضو! تم اس بات کا خیال رکھو گے کہ نوکرانیوں کے علاوہ کوئی اوپر گلشن کے پاس نہ جانے پائے۔"

مَیں ہرگز پسند نہیں کرسکتا تھا کہ کوئی نوکر میرا راستہ رُکنے کی کوشش کرے۔ اور اگر مجھے اُوپر جانا زیادہ ہی ضروری محسوس ہوتا تو کوئی مجھے روک بھی نہیں سکتا تھا۔ لیکن میں نے کبھی اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی — اس عورت کا قدم گھر میں پڑتے ہی میں اس ماں سے محروم ہوگیا تھا جو میرا سب کچھ تھی لیکن اس عورت سے کچھ کہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا بلکہ اب تو کسی بھی بات کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ جو روٹھ کر چلی گئی تھی، وہ تو اب واپس نہیں آسکتی تھی۔

گلشن آرا کا تو کوئی قصور بھی نہیں تھا۔ ان کی تو تربیت اور زندگی کا ڈھب یہی تھا۔ اِس قبیلے کی عورتوں کو کہیں نہ کہیں تو اونچا ہاتھ مارنا ہی ہوتا ہے۔ قصور تو اس کا تھا جو اسے گھر میں لایا تھا۔

میں سارا دن اپنے کمرے میں پڑا رہتا۔ کچھ کرنے کو، کسی سے ملنے کو، کسی کی صُورت دیکھنے کو جی نہ چاہتا۔ بالآخر مجھے اندیشہ محسوس ہونے لگا کہ یُوں تنہا اپنے کمرے میں مقیّد رہ کر اور اندر ہی اندر کُڑھ کُڑھ کر میں کہیں ذہنی توازن نہ کھو بیٹھوں۔ چنانچہ کبھی کبھار میں لاہور جانے لگا... وہاں دوستوں کے ساتھ وقت اچھا گزر جاتا۔ وہ بھی میری کیفیت کو کسی حد تک محسوس کرتے ہوئے میرے خیالات بٹانے کے لیے مجھے اِدھر اُدھر لیے پھرتے۔ مجھے کچھ تفریحات کی طرف بھی متوجّہ کرنے کی کوشش کرتے۔

امّی کے انتقال کو دو مہینے گزر گئے تو ابّا جی اور گلشن آرا کی شادی کے انتظامات ہوتے نظر آنے لگے۔ گھر میں نیا فرنیچر آنے لگا۔ ملبوسات کے پیکٹ اور جانے کیا کچھ آتا دکھائی دینے لگا۔ لیکن سب کچھ نہایت خاموشی سے ہورہا تھا۔ نوکر چاکر بھی جیسے ابّا جی کے رازدار تھے۔ ہر بات بڑے گول مول سے انداز میں کرتے تھے۔ ہر کام بڑے سلیقے، قرینے اور خاموشی سے کرتے تھے۔

ایک روز شام ڈھلے میں لاہور سے واپس آرہا تھا۔ گاڑی کچے میں اتارنے کے بعد میں نے تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ دُور سے میں نے ایک خشک اور متروک کنویں کی منڈیر پہ ایک شخص کو اکڑوں بیٹھے دیکھا وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے ہوئے تھا اور مجھے یوں لگا جیسے وہ ہچکیاں لے کر رو رہا ہے۔

دفعتاً اس نے سر اٹھا کر گاڑی کی طرف دیکھا۔ پھر شاید مجھے پہچان کر وہ منڈیر سے اُترا اور گرتا پڑتا گاڑی کے آگے آگیا اور بے تابی سے دونوں ہاتھ ہلا ہلا کر گاڑی رکنے کا اشارہ کرنے لگا۔ وہ ادھیڑ عمر کا ایک دُبلا پتلا اور قدرے مفلوک الحال سا آدمی تھا۔ اس کا چہرہ واقعی آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ وہ میرے لیے اجنبی تھا۔

"کیا بات ہے بابا؟" میں نے کھڑکی سے سر نکال کر پوچھا۔

"حضور!" وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے گڑگڑایا۔ "میں تو آپ ملک صاحب کے ہی صاحب زادے لیکن میں نے سُنا ہے آپ طبیعت کے بہت نیک ہیں..... غریبوں اور کمزوروں پہ رحم کھاتے ہیں۔ اس لیے میں آپ سے فریاد کرنے کے لیے آپ کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔"

"بات بتاؤ بابا!" میرا ماتھا ٹھنکا۔

"بیلدار فضل خان نے میری سولہ سال کی بیٹی کو رستے سے اٹھا لیا ہے... اسے بچائیں چھوٹے سرکار! ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے، میری خوش قسمتی ہے کہ آپ جلدی شہر سے واپس آگئے — میرا دل کہہ رہا تھا کہ آپ میری مدد کے لیے ضرور بروقت پہنچ جائیں گے۔"

اس کی بات سن کر ایک لمحے کے لیے تو میری کنپٹیوں میں انگارے سے دہک اٹھے۔ ابّا جی تو جو کچھ تھے سو تھے یہاں تو ہر شخص ہی راسپوتین ثانی بننے پر تلا ہوا تھا۔ بیلدار فضل خان ایک سیاہ فام جسیم شحیم آدمی تھا اور اس کی عمر پچاس سال سے کم نہیں تھی۔ وہ ایک طرح سے فصلوں وغیرہ کا محافظ تھا چند کارندے اس کے ماتحت تھے اور ان کا کام یہی تھا کہ اس بات کا خیال رکھیں کہ کوئی ہماری فصلوں کو کاٹنے، ان میں آگ لگانے یا ہمارا پانی کاٹنے کی کوشش نہ کرے۔ گویا فصلوں کی حفاظت کے لیے تو ہمارے ہاں آدمی موجود تھے لیکن عزّتوں کی حفاظت کرنے والا شاید کوئی نہیں تھا۔

"تم کسی اور کے پاس نہیں گئے؟" میں نے ادھیڑ عمر شخص سے پوچھا۔

"میں..... جی..... کیا بتاؤں.....۔" اس کے آنسو ایک بار پھر امنڈ آئے۔ وہ سر پر لپیٹے ہوئے صافے کے پلّو سے آنکھیں پونچھتے ہوئے بولا۔ "میں دوڑا دوڑا ڈیرے کی طرف گیا تھا کیونکہ میرا خیال یہی تھا کہ وہ بچّی کو ڈیرے پر لے جائیں گے لیکن وہ وہاں نہیں پہنچا تھا۔ بڑے ملک صاحب موجود تھے۔ انھیں جب بات کا پتا چلا تو وہ اُلٹا ہنسنے اور خوش ہونے لگے کہ بیلدار نے بڑے دنوں بعد کچھ سرگرمی دکھائی ہے۔ پھر وہ مجھ سے کہنے لگے، جا آرام سے جاکر سو جا۔ کل تیری لڑکی تیرے گھر پہنچ جائے گی۔ ذرا ہمیں بھی تو دیکھنے دے وہ کیا چیز ہے جس پہ بیلدار کا دل آیا... یہ جواب ملا جی مجھے وہاں سے —" وہ ایک بار پھر ہچکیاں سی لینے لگا۔

"مجھے یقین نہیں آرہا کہ ہمارے کارندے بھی اس حد تک کھُل کھیل رہے ہیں۔" میں نے حلق میں پھیلتی ہوئی کڑواہٹ کو نگلتے ہوئے کہا۔ وہ بوڑھے کو گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"جب دُوپہ والے ہی اندھیر مچائے ہوئے ہوں تو نیچے والوں

کے بھی حوصلے کھل جاتے ہیں نا ملک صاحب!" وہ میرے برابر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "علاقے میں اندھیر مچا ہوا ہے صاحب جی! لوگ اب بڑے ملک صاحب کے بہت خلاف ہوتے جا رہے ہیں..... یا تو لوگ چپکے چپکے علاقہ چھوڑنا شروع کر دیں گے اور کسی طرح گوندل برادری سے جا ملیں گے..... یا پھر وہ متحد ہو کر اب ضرور کچھ کریں گے..... ظلم کی بھی کوئی حد ہوتی ہے جی..... اور تو ہر طرح کا ظلم لوگ سہہ لیتے ہیں مگر یہ جو معصوم بچیوں کا معاملہ ہے نا..... لوگ اپنی عزت کی خاطر زبان بند رکھتے ہیں۔ لٹ جاتے ہیں مگر ہونٹوں کو تالا لگائے رکھتے ہیں..... لیکن کب تک؟ یہ آگ اندر ہی اندر پھیلتی ہے..... ہم کمزور ہیں..... مجبور ہیں..... لیکن پاؤں تلے آ کر تو چیونٹی بھی کاٹ لیتی ہے جی..... اب یہ اندھیر بند ہونا چاہیے ملک صاحب۔"

"آج بند ہو جائے گا چاچا! آج یہ اندھیر بند ہو جائے گا۔" میں نے بہت دھیمے لہجے میں کہا مگر اس لہجے کی تہ میں برسوں کی اذیت بول رہی تھی۔ یہ شخص میرے لیے اجنبی تھا مگر آج اچانک ہی اس نے مجھے ایک بڑے فیصلے پر پہنچانے میں مدد دے دی تھی۔ ابا جی بہت زندگیاں اجاڑ چکے تھے۔ اب ان کا حساب کتاب ہو جانا چاہیے تھا..... اور اُن کا حساب میرے سوا کوئی نہیں چکا سکتا تھا۔ ساری بُرائیوں کی جڑ وہی تھے۔

لڑکپن تک میں یہی سمجھتا رہا تھا کہ اِس قسم کے جاگیردار صرف فلموں میں ہوتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ خود میں نے ایک ایسے ہی جاگیردار کے ہاں جنم لیا ہے..... اور یہاں کوئی ہیرو بھی اب تک مجھے نظر نہیں آیا تھا جو ہاتھ میں لاٹھی یا بندوق لیے للکارتا ہوا آتا۔ "اوئے جگیردارا..... !" اور پھر وہ جاگیردار اور اس کے ظالم لڑکے کو خاک و خون میں نہلا دیتا، مٹی میں ملا دیتا۔

میں نے گلو کمپارٹمنٹ سے ریوالور نکال لیا۔ ریوالور لوڈڈ تھا۔ میں نے اُسے ڈیش بورڈ پر رکھ دیا۔

"آپ کیا کرنے جا رہے ہیں جی؟" اس شخص نے خوف زدہ سے لہجے میں پوچھا۔ وہ جو ایک لمحے پہلے متحد ہونے اور ظالموں کے اندھیر کھاتے کے خلاف سینہ سپر ہونے کی بات کر رہا تھا، اس کے لہجے میں خوف جھلک آیا تھا۔

"کچھ نہیں..... تمھیں تمھاری بچی مل جائے گی..... خدا کرے وہ خیر و عافیت سے ہو..... اور آج کے بعد اس علاقے میں کسی کی لڑکی نہیں اٹھائی جائے گی..... کسی کی عزت پر حملہ نہیں کیا جائے گا..... یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔" میں نے بڑے وثوق سے کہا۔ میں اسے فی الحال یہ بتانا نہیں چاہتا تھا کہ میں نے ابا جی کو گولی مارنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور..... میرے خیال میں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا..... اور اس فیصلے پر پہنچ کر میں بہت مطمئن تھا۔ اپنے آپ کو بالکل پُرسکون محسوس کر رہا تھا۔ ابا جی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ میں اندر سے کتنا مضبوط آدمی تھا۔

"تمھارے خیال میں بیل دار تمھاری بچی کو کہاں لے گیا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"معلوم نہیں جی..... اس کے ساتھ تین بندوق بردار اور بھی تھے۔ وہ کہیں بھی گئے ہوں جی..... ان کا پتا تو ڈیرے سے ہی چلے گا۔ وہاں ہر بات کی خبر ہوتی ہے جی۔" وہ بولا۔

میرا بھی یہی خیال تھا اِس لیے میں نے پہلے ہی گاڑی کا رُخ ڈیرے کی طرف موڑ دیا تھا۔

"جب اس قسم کی کوئی بات ہوتی ہے تو تم لوگ پولیس کے پاس کیوں نہیں جاتے؟" میں نے پوچھا۔

"پولیس کے پاس؟" اس نے یوں پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھا، گویا میں نے کوئی بہت ہی ڈراؤنی یا پھر بہت ہی بے وقوفی کی بات کر دی ہو۔ پھر وہ پھنسی پھنسی سی آواز میں بولا۔ "آپ چاہتے ہیں کہ ایک عذاب تو ہمارے سروں پر مسلط ہی ہے ہم دُوسرے کئی عذاب بھی مول لے لیں؟ اپنے آپ کو اور اپنی بچیوں کو مزید ذلیل کرائیں؟ آپ کو شاید علم نہیں کہ آپ کے والد کی مرضی کے بغیر تو اس علاقے کے تھانے میں پولیس اہلکاروں کی تقرریاں بھی نہیں ہو سکتیں ——— وہ تو آپ ہی لوگوں کے محافظ ہیں جی..... میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم لوگ کہاں جائیں؟"

"آج کے بعد تمھیں کہیں نہیں جانا پڑے گا۔" میں نے اُسے تسلّی دی۔

اس وقت ہم ڈیرے سے تقریباً آدھ میل کے فاصلے پر تھے، جب کہیں بہت دُور سے فائرنگ کی آوازیں سُنائی دینے لگیں۔ فائرنگ کی آوازیں سُنائی دینا ہمارے علاقے میں کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں تھی تاہم اس وقت فائرنگ خاصی شدید تھی..... لیکن میں نے ڈیرے کی سمت میں ہی سفر جاری رکھا۔ فائرنگ کی آوازیں کسی اور سمت سے سُنائی دے رہی تھیں۔

جب ہم ڈیرے پر پہنچے تو وہاں ویرانی کا راج تھا۔ دروازے چوپٹ کھلے تھے۔ اندر کوئی نہیں تھا۔ ایک دیوار کے قریب صرف ایک ہونق سا آدمی کھڑا تھا۔

"یہ سب لوگ کہاں گئے؟" میں نے پُوچھا۔

"وہی جو دس ایکڑ والا ٹکڑا ہے نا..... جس کی وجہ سے کئی مرتبہ گوندلوں سے لڑائی ہو چکی ہے..... وہاں کچھ لوگوں نے ہمارے آدمیوں پر حملہ کر دیا تھا۔ یہاں خبر پہنچی تو بیل دار اپنے آدمیوں کو لے کر روانہ ہو گیا۔" اس شخص نے بتایا۔

"اس کا مطلب ہے بیل دار یہیں تھا؟" میں نے پُوچھا۔

"وہ جی حملے کی خبر آنے سے دو چار منٹ پہلے ہی یہاں پہنچا تھا۔" اس نے بتایا۔

"اُس کے ساتھ کوئی لڑکی بھی تھی؟" میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔

وہ کچھ ہچکچایا پھر تھوک نگل کر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "وہ..... تھی تو..... لیکن افراتفری میں وہ یہاں سے نکل کر بھاگ گئی۔"

میں نے سکون کی سانس لی اور اپنے ساتھ آنے والے شخص کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی آنسو تھے لیکن شاید یہ تشکر کے آنسو تھے۔

"اور ملک صاحب کہاں گئے؟" میں نے ہونق سے آدمی سے پوچھا۔

"وہ بھی بیل دار صاحب کے ساتھ موقع پر گئے ہیں سرکار! اُن کو آج سخت غصہ آ گیا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے، آج میں خود جا کر دیکھتا ہوں..... اور آج میں اُن گوندلوں کا قصہ ہی مُکا دوں گا۔" اس نے بتایا۔

میں نے اپنے ساتھ آنے والے شخص سے کہا۔ "چاچا! اب تم آرام سے گھر جاؤ۔ تمھاری بچی گھر پہنچ چکی ہو گی۔"

وہ وہاں سے چلتا ہوا نہیں، دوڑتا ہوا رخصت ہوا۔ اس کی ناتواں ٹانگوں میں گویا بجلی بھر گئی تھی۔ میں گاڑی میں بیٹھ کر اُدھر روانہ ہو گیا جدھر سے فائرنگ کی آواز کچھ دیر پہلے تک آ رہی تھی لیکن اب معدوم ہو چکی تھی۔

ہمارے علاقے میں دُوسرے بڑے زمیندار، گوندل برادری کے لوگ تھے۔ ہماری صرف دس ایکڑ زمین معلوم نہیں کس طرح اُن کی زمینوں میں پھنسی ہوئی تھی۔ شروع میں انھوں نے ابا جی کو پیشکش کی کہ وہ زمین انھیں ہی بیچ دی جائے کیوں کہ اس کی وجہ سے انھیں کچھ دقتیں ہوتی ہیں۔ ابا جی غالباً اپنی مصروفیات کی وجہ سے انھیں کوئی جواب نہ دے سکے اور اس دوران گوندلوں نے شاید کچھ بے صبرے ہو کر پٹواری سے مل ملا کر کوئی ہیرا پھیری کر کے وہ ٹکڑا اپنے نام کرانے کی کوشش کی جس کا فوراً ابا جی کو علم ہو گیا اور اس کے بعد وہ بُری طرح چڑ گئے۔ انھوں نے قسم کھالی کہ وہ کسی قیمت پر یہ ٹکڑا گوندلوں کے ہاتھ نہیں بیچیں گے۔

اس دن کے بعد سے عین اسی مقام پر چھوٹے موٹے جھگڑے ہوتے آئے تھے۔ کچھ عرصے سے ان جھگڑوں میں سنگینی بھی آ گئی تھی اور دونوں طرف کے دو تین آدمی مر چکے تھے۔ مقدمے چل رہے تھے اور آئے دن فائرنگ کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ مجھے کچھ صحیح طور پر علم نہیں تھا کہ تازہ ترین صورت حال کیا تھی۔

تاہم میرا اِرادہ اب بھی نہیں بدلا تھا۔ بھرا ہوا ریوالور اب کوٹ کی جیب میں ڈال لیا تھا۔ تنگ اور ناہموار پگڈنڈی پر

گاڑی مجھے بہت آہستہ چلانا پڑ رہی تھی۔ خاصی دیر بعد میں اس مقام پر پہنچا، جہاں میرے اندازے کے مطابق فائرنگ ہو رہی تھی۔ وہاں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ تاہم آثار بتا رہے تھے کہ میرا اندازہ ٹھیک ہی تھا۔ وہاں کچھ دیر پہلے یقیناً افراتفری رہی تھی اور گولیاں بھی چلی تھیں۔

میں گاڑی سے اُتر کر پیدل آگے بڑھا۔ چاروں طرف عجیب پُراسرار سا سناٹا تھا۔ ایسا سناٹا جس سے خوف آنے لگتا ہے، جلد کے اندر پھریریاں سی محسوس ہونے لگتی ہیں۔ اِردگرد کارتوسوں کے خالی خول بھی بکھرے ہوئے تھے۔ ایک جگہ مجھے سیون ایم جی کی ایک گولی بھی پڑی نظر آئی۔ ہمارے ہاں چھوٹے موٹے جھگڑوں میں سیون ایم جی کی گن استعمال نہیں ہوتی تھی۔

اِردگرد کوئی نظر نہیں آ رہا تھا لیکن فضا میں جیسے لہو کی بُو رچی ہوئی تھی۔ میں کھڑی فصلوں میں اِردگرد دیکھتے ہوئے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ پھر ایک جگہ مجھے ابا جی کی جیپ کھڑی نظر آئی۔ اس کی ونڈ اسکرین وغیرہ چکنا چُور تھی۔

میں ذرا آگے بڑھا تو یک لخت جیسے میرے سر پر کسی نے ہتھوڑا رسید کر دیا۔ ایک لمحے کے لیے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا، لیکن پھر میں نے سنبھل کر سامنے دیکھا۔ کچلی ہوئی فصل کے درمیان ابا جی چت پڑے تھے۔ بائیں کان سے اوپر ان کی کھوپڑی کا خاصا حصّہ اُڑ چکا تھا۔ ایک گولی گردن سے بھی پار ہو چکی تھی۔ اُن کی شکل مسخ سی ہو کر رہ گئی تھی۔ قیمتی لباس خاک و خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ اِدھر اُدھر پھیلا ہوا خون جمنا شروع ہو چکا تھا اور لاش پر ابھی سے مکھیاں بھنبھنانے لگی تھیں۔

یہ ایک ایسے شخص کی لاش تھی جسے دُور سے گزرتے دیکھ کر لوگوں کی رگوں میں لہو خشک ہونے لگتا تھا۔

جیب میں پڑے ہوئے ریوالور کے دستے پر میری گرفت ڈھیلی ہو گئی اور میں نے ہاتھ جیب سے نکال لیا۔ آہستگی سے میں اُن کے قریب بیٹھ گیا اور اُن کا ہاتھ تھام لیا۔ ان کا بے جان ہاتھ برف کی طرح سرد اور پتھر کی طرح سخت تھا۔ میری آنکھوں سے دو آنسو نکلے اور ابا جی کے چہرے پر گرے لیکن یہ دو آنسو اُن کے چہرے پر نظر آنے والی خاک اور خون اور اُن کے اعمال کی نظر نہ آنے والی سیاہی کو نہیں دھو سکتے تھے۔

"ابا جی..... ! شاید اب آپ کو معلوم ہو گیا ہو کہ حکم دے کر لٹوانے اور خود آگے بڑھ کر لڑنے میں کیا فرق ہے..... اور کاش آپ دیکھ سکتے کہ آپ یہاں پڑے ہوئے کتنے بے وقعت اور حقیر لگ رہے ہیں..... اور آپ کی لاش پر مکھیاں.....!" اپنے آپ سے باتیں کرتے کرتے میں یک لخت ہی خاموش ہو گیا۔ مجھے

میں نے سخت لہجے میں پوچھا

شبہ ہوا تھا کہ شاید ایک آدھ لمحے کے لیے میرا ذہنی توازن خراب ہو چلا تھا۔

اسی لمحے کسی کے کراہنے کی آواز نے مجھے اپنی طرف متوجّہ کر لیا۔ میں فصل سے نکلا اور آواز کی سمت میں بڑھا۔ آگے پانی کا وہ چھوٹا سا نالا تھا جسے کھال کہا جاتا ہے۔ کھال کے قریب ایک لاش اِس طرح اوندھی پڑی تھی کہ اس کا سَر پانی میں تھا اور اس کی پگڑی کھُل کر اِدھر اُدھر پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی رائفل کچھ دُور پڑی ہوئی تھی۔ اس سے ذرا آگے نشیب میں بیل دار فضل خان چاروں خانے چت پڑا تھا۔ اس کی شکل زندگی میں بھی کچھ کم بھیانک نہیں تھی۔ لیکن زندگی سے محروم ہونے کے بعد تو وہ اور بھی بھیانک لگ رہا تھا۔ اس کا بڑا سا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا، گویا مرتے وقت اُسے یقین نہ آیا ہو کہ موت اس کی شہ رَگ تک بھی پہنچ سکتی ہے۔ وہ کسی بھینسے کی طرح مضبوط آدمی تھا لیکن چند تولہ سیسے کی صرف ایک گولی اس کے جسم کے مضبوط قلعے سے رُوح کا پنچھی نکال کر لے گئی تھی۔

کراہ دراصل اس آدمی کی تھی جس کا سَر پانی میں تھا۔ مَیں نے اُسے کھینچ کر اس کا سَر پانی سے نکالا۔ پانی اس کے ناک منہ میں نہیں گیا تھا۔ اس نے بمشکل آنکھیں تھوڑی سی کھولیں۔ ان آنکھوں میں موت کی دُھندلاہٹ قدم جما رہی تھی تاہم اُس نے مجھے پہچان لیا۔

"ملک صاحب .....!" وہ سرگوشی نما لہجے میں بولا۔ "آپ گھر..... چلے جائیں..... کہیں آپ کو بھی..... کوئی....." بات بات پر رائفل لے کر نکل کھڑا ہونے والا وہ شخص موت کی عمل داری میں داخل ہونے کے بعد سخت دہشت زدہ تھا۔

"تم میری فکر چھوڑو..... یہ بتاؤ، یہاں کیا ہوا تھا؟" مَیں نے ملائمت سے کہا۔

"وہ شاید گوندلوں ہی کے آدمی تھے....." وہ بدستور اٹک اٹک کر بولا۔ "لیکن اُن کے چہروں پر..... ڈھاٹے..... بندھے ہُوئے تھے۔ وہ..... بھاگ گئے ہیں..... ہمارے آدمی..... اُن کے پیچھے..... گئے ہیں۔" سرگوشی میں بولتے وقت بھی اس کے منہ سے بھل بھل خون بہہ رہا تھا۔ اس کے سینے میں گولیاں لگی تھیں۔ اُس نے گویا تھک کر آنکھیں بند کر لیں اور پھر نہیں کھولیں۔ میں نے اُسے ہلایا جُلایا مگر اس کے جسم میں اب زندگی کی کوئی رمق نہیں رہی تھی۔

میں تھکے تھکے سے انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھ پر واقعی یک دم ہی بے پناہ تھکن نے غلبہ پا لیا تھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا اور پرندے قطار در قطار اپنے آشیانوں کی طرف واپس آ رہے تھے۔ میرا بھی بڑی شدّت سے گھر واپس جانے کو جی چاہ رہا تھا مگر مجھے یوں لگ رہا تھا، جیسے میرا کوئی گھر ہی نہیں ہے..... اور پھر سب سے پہلے تو مجھے تھانے جانا تھا۔

★

حملہ آوروں میں سے دو آدمیوں کو ہمارے آدمیوں نے پکڑ لیا تھا اور دو آدمیوں کو بعد میں پولیس نے ڈھونڈ نکالا تھا۔ وہ تھے تو گوندلوں ہی کے آدمی، اور حملہ بھی یقیناً اُن ہی نے کرایا تھا مگر اس بات کو جاننے اور ثابت کرنے میں بڑا فرق تھا۔ پولیس نے مار مار کر اُن کی چمڑی اُدھیڑ دی مگر وہ اس بات پر قائم رہے کہ وہ تو صرف پانی کے مسئلے پر بات کرنے گئے تھے۔ جھگڑا اچانک ہی اور فوری اِشتعال کے تحت شروع ہو گیا تھا۔

انھوں نے اقرار کر لیا تھا کہ مرنے والے انھی کی فائرنگ سے مَرے تھے۔ اِس کے بعد ظاہر ہے تفتیش ختم ہو جاتی تھی۔ تھانے دار کا رویّہ معذرت خواہانہ تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر میں کچھ سَرگرمی دکھاؤں تو اصل لوگوں پر بھی ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی جا سکتی ہے لیکن میں "سَرگرمی" دکھا نہیں رہا تھا۔ مجھے دراصل اَب ان معاملات سے کوئی دل چسپی ہی نہیں رہی تھی۔ سب کچھ شاید مکافاتِ عمل کے تحت ہو رہا تھا..... اور اب گویا کہانی ہی ختم ہو گئی تھی۔ میرا دل ہر چیز سے اُچاٹ ہو گیا تھا۔ پولیس نے چار آدمیوں کو مزید پکڑا لیکن ایک ایک کر کے انھیں چھوڑ دیا۔

چالان عدالت میں پیش ہو چکا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ اقرارِ جُرم کرنے والوں کو پانچ پانچ، سات سات سال کی سزا ضرور ہو جائے گی۔ اس دَوران اُن کے بیوی بچے عیش و عشرت سے رہتے رہیں گے، دنیا کی ہر آسائش ان کو میسّر ہو گی اور شاید خاصی بڑی بڑی رقمیں بھی ان کے گھروں میں رکھے ہوئے ٹرنکوں، صَندوقوں کے کونے کھدروں میں پہنچ چکی ہوں۔

جب روز و شب میں ذرا ٹھہراؤ آیا تو ایک روز میں اُوپر کی منزل پر گلشن آرا کے پاس پہنچا۔ ابّاجی کی موت پر اُسے سکتہ سا ہو گیا تھا۔ اس کے بعد گزرنے والے دو مہینوں میں مَیں نے اسے صرف دو مرتبہ ہی دیکھا اور دونوں مرتبہ ہی ہمارے درمیان کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ وہ خاموشی سے اُوپر کی منزل پر رہے جا رہی تھی، جیسے گھر کی ایک فرد ہی ہو اور شروع سے یہیں رہتی آئی ہو۔

اس روز میں اُوپر پہنچا تو وہ سیاہ ماتمی لباس میں ایک بھاری بھر کم کرسی پر کشادہ بالکونی میں بیٹھی تھی۔ اس کے انداز و اطوار میں اب وہ ڈھکا چھُپا سا بازاری پن نہیں رہا تھا بلکہ بڑی متانت اور ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ ابّاجی کے انتقال کے بعد سے شاید وہ مستقل طور پر سیاہ لباس پہن رہی تھی۔

ایک خادمہ اس کے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی اور بڑے سلیقے سے بالوں کو سنبھالے ہوئے تھی ورنہ شاید اس کے بال اتنی لمبی تھی

سے بھی فرش پر پھیلے ہوئے ہوتے۔ وہ بلاشبہ بے پناہ حسین عورت تھی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں نہایت آہستگی سے میری طرف اٹھیں اور اس کی نظر میرے چہرے پر جم کر رہ گئی۔

پھر میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی اس نے خادمہ کو اشارہ کیا اور وہ اس کے بالوں کا عارضی سا جُوڑا بنا کر نیچے چلی گئی۔ گلشن کا سپید، نازک اور مرمریں ہاتھ حرکت میں آیا۔ کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ مترنّم مگر نہایت دھیمی آواز میں بولی "بیٹھو خرم!"

"میں بیٹھنے نہیں..... مختصر سی بات کرنے آیا ہوں۔" میں نے سَرد اور سپاٹ لہجے میں کہا۔ اس کی بھووں میں خم گہرا ہو گیا۔ وہ نہایت پُر تمکنت انداز میں میری طرف متوجّہ تھی۔

میں نے بالکونی کی دیوار کا سہارا لیتے ہوئے کہا "گلشن آرا بیگم! تمھاری آمد اس گھر کے لیے نحوست کا باعث بھی رہی ہے اور بہت مُبارک بھی ـــــ نحوست کا باعث اس طرح کہ یہ گھر اُجڑ کر رہ گیا لیکن مُبارک اس وجہ سے کہ اب بہت سے گھر سکون سے بسے رہ سکیں گے لیکن..... اب تمھیں اس گھر سے جانا ہو گا۔ اس حسن و شباب کا کوئی اور قدر دان تلاش کرنا ہو گا۔"

"تمھیں مجھ سے اس لہجے میں بات نہیں کرنا چاہیے۔ میرا تمھارے مرحوم باپ سے کچھ نہ کچھ ناتا رہا ہے۔" وہ پُرسکون لہجے میں بولی۔ "میں اِسی گھر میں رہنا چاہتی ہوں۔ میں اُن کی یاد کے سہارے زندگی گزار دوں گی۔"

"یہ افسانوی مکالمے بولنے کی ضرورت نہیں ـــ تمھارے مکالموں پر جان دینے والا اس دُنیا سے جا چکا ہے....." میں نے رکھائی کے ساتھ کہا۔

"لیکن تم مجھے یوں دُودھ کی مکھّی کی طرح نکال کر نہیں پھینک سکتے۔ تمھارا باپ مجھ سے شادی کرنے والا تھا۔" وہ بالآخر چلّا اٹھی۔ اس کی متانت، صبر و ضبط اور ٹھہراؤ جواب دے گیا تھا۔ میں مُسکرا دیا۔

"شادی کرنے والا تھا..... شادی کی نہیں تھی۔" میں نے گویا اس کی کوئی غلط فہمی دُور کی۔

چند لمحے وہ خاموشی سے ایک ٹک میری طرف دیکھتی رہی۔ اس کی نظریں مَردوں کی شخصیت میں دراڑیں ڈال دینے والی تھیں۔ اس کا ذہن یقیناً بہت تیزی سے کام کرتا تھا۔ میرے چہرے پر پھیلی ہوئی سَرد مہری کو محسوس کرتے ہوئے وہ اٹھ کر میرے قریب آئی، اتنی قریب کہ میں اس کے وُجود کی مہک محسوس کر سکتا تھا۔ یہ مہک کسی کلون، کسی سینٹ کی رہینِ مِنّت نہیں تھی۔

"آخر میں کیوں اس گھر میں نہیں رہ سکتی؟" اس نے سرگوشی نما لہجے میں پُوچھا۔ یک دم ہی وہ چیخنا بھُول گئی تھی۔

"میں نے یہ گھر..... زمینیں..... دیگر جائیداد..... سب کچھ بیچنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" میں نے سیدھی سچّی بات اسے بتا دی۔ "میں یہاں رہنا نہیں چاہتا۔ میں لاہور منتقل ہو رہا ہوں۔ میں زمینداری نہیں کر سکتا اور نہ ہی ان زمینوں کا مالک کہلانا چاہتا ہوں۔ میں شاید کچھ اور کروں..... اور شاید کچھ بھی نہ کروں۔"

"کیا میں تمھاری کنیز بن کر تمھارے ساتھ نہیں رہ سکتی؟" اس نے خوابناک سے لہجے میں سرگوشی کی۔ ایک لمحے کے لیے تو میں اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ میری رگ و پے میں سنسنی سی دَوڑ گئی۔

لیکن دوسرے ہی لمحے سنبھل کر میں نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔ "مجھے کسی کنیز کی ضرورت نہیں۔ خصوصاً ایسی کنیز کی، جو میرے باپ کی بھی کنیز رہ چکی ہو۔"

اس کی آنکھوں میں ساری خوابناکی دم توڑ گئی۔ وہ واپس کرسی پر جا بیٹھی۔ "تم بہت مختلف آدمی ہو۔"

"شاید ـــ میں نے کبھی اِس پر غور نہیں کیا۔ تمھارا واسطہ جن لوگوں سے پڑتا رہا ہو گا، شاید میں ان سے مختلف ہوں۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

وہ ایک لمحہ خاموش رہی، بالآخر اپنی حقیقی سطح پر آتے ہوئے بولی۔ "تمھارے باپ نے ایک بہت بڑی رقم میرے اکاؤنٹ میں منتقل کرنے کا وعدہ کیا تھا اور اس وعدے کی تکمیل شادی سے دو چار دن پہلے ہی ہونا تھی ـــ میں وہ رقم لیے بغیر نہیں جاؤں گی۔ میں بہت پھڈّا ڈال سکتی ہوں..... تمھارے لیے مسئلہ کھڑا کر سکتی ہوں۔"

"مثلاً؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سرد لہجے میں پُوچھا۔

"تم پر کیس بن سکتا ہے کہ تم نے میری عزّت پر حملہ کیا تھا۔" اس نے شاید زیادہ غور کیے بغیر کہا۔

"مدّتوں سے میں ہنسا نہیں ہوں لیکن لفظوں کی اس ستم ظریفی پر میرا ہنسنے کو جی چاہ رہا ہے۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "عزّت..... حملہ..... کیس..... میں..... اور تم..... بڑی مضحکہ خیز سی تصویر بنا رہے ہیں یہ الفاظ ـــ مجھے تمھارے منہ سے ایسی بچکانہ بات سُننے کی توقع نہیں تھی۔" پھر میں نے دیوار کی طرف گھومتے ہوئے کہا۔ "ذرا یہاں آؤ۔"

وہ متذبذب انداز میں اٹھ کر میرے قریب آ کھڑی ہوئی۔ اِس بالکونی سے بہت دُور تک کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ چٹیل میدان اور کہیں کہیں درختوں کے جھنڈ..... آتے جاتے اِکّا دُکّا مزارعے..... ٹیوب ویل کا سُرخ چوکور کمرہ..... دُور تک لہلہاتی ہوئی فصلیں..... اور مویشی.....

میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "یہ دُور تک پھیلی ہوئی زمین

دیکھ رہی ہو؟ یہاں تم جیسی عورت کو قتل کر کے دفن کر دیا جائے تو شاید کبھی اس کی لاش بھی دریافت نہ ہو سکے۔ میں بہت رحم دل انسان ہوں لیکن صرف ان کے ساتھ، جو رحم کے مستحق ہوتے ہیں۔" میرا لہجہ غیر ارادی طور پر انتہائی سرد تھا۔

میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی سرخ و سپید رنگت ایک لمحے کے لیے پھیکی پڑ گئی تھی۔ میں نے بدستور سرد لہجے میں کہا۔ "میں تمھیں رقم ضرور دے دیتا بشرطیکہ تم ضرورت مند ہوتیں... میں پیسے کے پیچھے جان دینے والا آدمی نہیں ہوں۔ لیکن میں نے دیکھا ہے کہ تمھارے پاس ڈائمنڈز کی بہت سی جیولری ہے۔ بیش قیمت ملبوسات سے تمھارے صندوق بھرے پڑے ہیں.... اور بھی بہت کچھ ہو گا، جو میرے علم میں نہیں ہے.... اور یہ سب کچھ یقیناً ابا جی نے ہی دیا ہو گا۔ بس.... اب میں مزید کوئی بات کرنا اور سننا نہیں چاہتا۔"

پھر میں نے وہیں کھڑے کھڑے پکارا "شیدے.... مقصود.... شریفن.... زینب...."

چند لمحے بعد وہ چاروں، سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گئے — شیدا اور مقصود چھ چھ فٹ لمبے جوان تھے اور دونوں ہی کو لمبی لمبی اور گھنی مونچھیں رکھنے کا بڑا شوق تھا۔ صورت سے وہ ڈاکو لگتے تھے۔

میں نے شریفن اور زینب کو مخاطب کیا "گلشن بی بی کا سامان پیک کرو.... بہت احتیاط سے.... کوئی چیز ٹوٹنے اور خراب ہونے نہ پائے.... اور کسی چیز پر اعتراض نہ کرنا، خواہ یہ کچھ بھی لے جانا چاہیں۔"

پھر میں نے شیدے اور مقصود کی طرف مڑتے ہوئے کہا "گاڑی ڈرائیور چلائے گا اور تم دونوں بی بی جی کے ساتھ جاؤ گے تاکہ راستے میں انھیں کوئی تکلیف نہ ہو۔ جہاں یہ کہیں، وہاں تم انھیں چھوڑ کر آؤ گے.... سمجھے!"

"بہت بہتر سرکار!" شیدا سر جھکا کر بولا "ہم نیچے جا کر گاڑی کے پاس کھڑے ہوتے ہیں.... بی بی جی تیار ہو جائیں گی تو شریفن اور زینب ہمیں اطلاع دے دیں گی۔ ہم آ کر سامان اٹھا کر نیچے لے جائیں گے۔"

وہ دونوں نیچے چلے گئے اور دونوں ملازمائیں اندر جا کر سامان جمع کرنے لگیں.... گلشن اپنی جگہ گویا دم بخود کھڑی تھی لیکن شاید وہ آخری سانس تک لڑنے کی قائل معلوم ہوتی تھی، سنبھل کر بولی "اتنے عرصے تک اگر کوئی مجھے یہاں ملنے نہیں آیا تو یہ مت سمجھو کہ میں کوئی لاوارث یا بے وسیلہ عورت ہوں.... یہ میری ہی ہدایت تھی کہ جب تک میں کسی کو طلب نہ کروں، کوئی یہاں نہ آئے۔ ہمارے آدمی تم سے بدلہ لینے ضرور آئیں گے۔ تم نے مجھے بے عزت کیا ہے۔ میں تمھیں معاف نہیں کروں گی۔"

"اگر تم براہِ کرم مجھے اپنا ایڈریس وغیرہ دے جاؤ، تو میں تمھیں مطلع کرتا رہوں گا، کہ میں کن دنوں کہاں پایا جا رہا ہوں تاکہ تمھیں اپنے آدمیوں کو بھیجنے میں آسانی رہے اور وہ مجھ سے خاطر خواہ انتقام لے سکیں۔" میں نے ملائمت سے کہا۔

وہ کچھ نہ بولی۔ خونخوار نظروں سے مجھے دیکھتی ہوئی اندر چلی گئی۔ میں نیچے آ گیا۔

ایک گھنٹے بعد گلشن آرا دونوں آدمیوں کی معیت میں نہایت خاموشی سے رخصت ہو گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں دیر تک بے مقصد سے انداز میں پورے گھر میں پھرتا رہا۔ کیسا بدنصیب گھر تھا یہ بھی.... اتنی بڑی حویلی اور رہنے والا صرف میں.... یا پھر چند نوکر۔

یہ درست تھا کہ میں نے یہ حویلی اور زمین وغیرہ فروخت کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مجھے یہ سب جگہیں آسیب زدہ سی لگتی تھیں۔ زمین سے مجھے لہو کی بو آتی تھی اور حویلی اور ڈیرے وغیرہ کے در و دیوار سے مجھے نظر نہ آنے والے انسانوں کی چیخیں اور سسکیاں سنائی دیتی تھیں۔ میرے دل نے فیصلہ دے دیا تھا کہ یہ میرے رہنے کی جگہ نہیں تھی حالانکہ گاؤں والے بہت خوش تھے، کہ اب یہاں کا مالک و مختار میں تھا۔ بلکہ میں نے سنا تھا کہ ابا جی کے چہلم کے بعد انھوں نے باقاعدہ کوئی جشن سا بھی منایا تھا۔ مٹھائی وغیرہ بھی بانٹی گئی تھی، مگر چپکے چپکے۔

لیکن مجھے یہاں رہنا بہر حال اپنے بس کی بات نہیں لگتی تھی اب مسئلہ صرف اتنی بڑی جائیداد کے لیے موزوں گاہک ڈھونڈنے کا تھا اور میں نے اس کا بھی حل تلاش کر لیا تھا۔

دوسری صبح میں جیپ میں بیٹھ کر گوندلوں کے علاقے کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب میں اس جگہ پہنچا جہاں سے گوندلوں کی زمینیں شروع ہوتی تھیں تو ایک کاشت کار نے مجھے قریب سے دیکھ لیا اور یک دم ہی اس کی آنکھیں یوں پھیل گئیں، جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو، پھر وہ خوف زدہ سے انداز میں فصلوں کے درمیان ایک طرف کو دوڑتا چلا گیا۔

میں نے کھلے راستے پر سفر جاری رکھا۔ مجھے صحیح طور پر یاد نہیں تھا کہ گوندلوں کا ڈیرا کس طرف تھا۔ مدتوں پہلے میں صرف ایک بار وہاں گیا تھا جب ان کی اور ہماری دشمنی شروع نہیں ہوئی تھی.... بہر حال میں اندازے سے چلا جا رہا تھا۔

راستے میں کئی مزارعے وغیرہ نظر آئے۔ میں تو کسی کو نہیں پہچانتا تھا لیکن وہ لوگ یقیناً مجھے پہچانتے تھے اور پہچان کر حیرت سے ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی تھیں۔ شاید انھوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ شہر یار ملک کا لڑکا یوں تنہا گوندلوں کی زمین پر بھی نظر آ سکتا ہے۔

میں کچھ اور آگے پہنچا تو سامنے سے ایک کھلی جیپ آتی دکھائی دی۔ ڈرائیور کے علاوہ اُس میں چار آدمی تھے اور چاروں کے پاس رائفلیں تھیں۔ وہ جیپ ترچھی ہو کر یوں رک گئی کہ مجھے بھی جیپ روکنا پڑی۔ میں اطمینان سے اسٹیئرنگ وہیل پر کہنیاں ٹکائے بیٹھا رہا۔

ان میں سے ایک رائفل بردار اتر کر میرے قریب آیا جب کہ باقی تین رائفلیں سنبھالے یوں الرٹ بیٹھے رہے، جیسے میری ذرا سی بھی حرکت پر گولیاں برسانا شروع کر دیں گے لیکن مجھے اطمینان تھا کہ کسی "حرکت" سے پہلے وہ بہر حال گولی نہیں چلائیں گے۔

"کدھر جا رہے ہیں ملک صاحب؟" رائفل بردار نے اپنے کھردرے لہجے کو ملائم بنانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

"امیر گوندل سے ملنے۔" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

گوندل پانچ بھائی تھے اور زمینیں غالباً سب کی مشترکہ تھیں — مجھے معلوم تھا کہ امیر گوندل ان میں سب سے بڑا بھائی ہے اور زمینوں کا انتظام فی الحال اسی کے ہاتھ میں تھا اور اس علاقے میں حکم بھی اسی کا چلتا تھا۔

سوال کرنے والا گویا کچھ الجھن سی میں پڑ گیا اور بالآخر پوچھے بغیر نہیں رہ سکا "کیوں ملنے آئے ہیں؟"

"کچھ ضروری باتیں کرنے۔" میں نے سرسری سے لہجے میں جواب دیا۔ جیپ میں بیٹھے ہوئے لوگ بھی میری آواز سن رہے تھے۔ جیپ میرے راستے سے ہٹ گئی۔

رائفل بردار اپنی جیپ کی طرف جانے سے پہلے بولا "احتیاط آپ کے حق میں اچھی ہو گی، ملک صاحب!"

میں نے کڑی نظروں سے اُسے گھورا اور لہجہ بدلتے ہوئے کہا۔ "مجھے سبق پڑھانے کی ضرورت نہیں۔ جب ایک زمیندار دوسرے زمیندار سے بات کرنے جا رہا ہو تو کارندے بیچ میں مشورے نہیں دیا کرتے۔"

وہ کچھ نہ بولا۔ خاموشی سے اپنی جیپ میں جا بیٹھا۔ میں نے جیپ آگے بڑھا دی تاہم وہ جیپ بھی یوٹرن لے کر میرے پیچھے پیچھے آنے لگی۔ میں نے عقب نما آئینے میں دیکھ لیا تھا کہ رائفل بردار اب بھی الرٹ بیٹھے تھے۔

میں جب گوندلوں کے ڈیرے پر پہنچا تو وہاں باہر ہی کئی آدمی کھڑے تھے۔ ان میں سے بھی چند کے پاس رائفلیں وغیرہ تھیں۔ وہ سب حیرت سے مجھے دیکھ رہے تھے، تاہم انھوں نے خاموشی سے میرے لیے لکڑی کا بھاری بھرکم گیٹ کھول دیا۔ چار رائفل بردار بہر حال مستعدی سے میرے پیچھے آ رہے تھے۔

احاطہ عبور کر کے میں بڑے ہال میں پہنچا۔ وہاں روایتی پنچایت کا سا منظر تھا۔ بہت سے لوگ دو طرفہ قطاروں میں کرسیوں پر بیٹھے تھے اور سامنے سرے پر ایک خاصی اونچی، منقش، رنگین اور مخملیں گدّوں والی کرسی پر امیر گوندل بیٹھا تھا۔ وہ عمر میں مجھ سے کافی بڑا اور درمیانے قد و قامت کا ایک عام سا آدمی تھا مگر دولت اور جاگیرداری انسان کی شخصیت میں جو نکھار اور دبدبہ سا پیدا کر دیتی ہے اُس کی بنا پر وہ اس بھیڑ میں سب سے الگ تھلگ اور نمایاں نظر آ رہا تھا۔

"خوش آمدید خرم ملک!" اس نے اپنی جگہ سے حرکت کیے بغیر ایک ٹک میری طرف دیکھتے ہوئے گونجیلی آواز میں کہا۔

"شکریہ۔" میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا اور اپنے آس پاس کھڑے ہوئے مستعد رائفل برداروں کی طرف اشارہ کیا "کیا تمھارے ہاں مہمانوں کو اسی طرح خوش آمدید کہا جاتا ہے؟"

"دراصل ہمیں معلوم نہیں ہے کہ آنے والا واقعی مہمان ہے یا نہیں۔" امیر گوندل سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بولا "اور یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کے دل میں کیا ہے.... وہ کس ارادے سے آیا ہے؟"

میں اس وقت شلوار قمیص اور واسکٹ میں تھا۔ میں نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا "اپنے کسی آدمی سے کہو کہ میری تلاشی لے کر اطمینان کر لے۔ میں بالکل نہتا ہوں۔ نیل کٹر تک نہیں ہے میرے پاس۔ ظاہر ہے، ایک نہتا آدمی اتنے ہجوم میں، تمھارے اپنے ڈیرے پر زیادہ سے زیادہ کوئی بات کرنے ہی آ سکتا ہے۔"

"تلاشی کی ضرورت نہیں۔ تم نے کہا اور ہم نے یقین کر لیا۔" امیر گوندل بولا اور اٹھ کھڑا ہوا "بات کرنے آئے ہو تو یہاں آؤ.... میرے پاس بیٹھو۔"

میں اس کے قریب پہنچا تو اس نے مضبوطی اور گرم جوشی سے مجھ سے مصافحہ کیا اور اس کے قریب بیٹھے ہوئے ایک معمر شخص نے میرے لیے کرسی خالی کر دی۔ امیر گوندل بہت سمجھ دار اور متحمل مزاج آدمی معلوم ہوتا تھا — معلوم نہیں اس سے ہماری دشمنی کیوں اتنی آگے چلی گئی تھی۔

بیٹھنے کے بعد میں نے بات شروع کی تو آواز اتنی بلند رکھی کہ ہال میں موجود سب لوگ سن سکیں۔ ویسے بھی سب میری ہی طرف متوجہ اور ہمہ تن گوش تھے۔

"خون ریزی ختم کرنے کے لیے کسی نہ کسی کو پہل ضرور کرنا پڑتی ہے امیر صاحب!" میں نے کہا — "اور میں نے کسی مجبوری کے تحت نہیں، اپنی خوشی سے اس معاملے میں پہل کرنے کا فیصلہ کیا ہے، تم اسے میری کسی مجبوری پر محمول نہ کرنا۔ میں بھی چاہوں تو برسوں مزید اس دشمنی اور خون ریزی کو جاری رکھ سکتا ہوں لیکن میرے خیال میں اب بہت ہو چکی ہے۔ یہ زمین بہت لہو پی چکی ہے۔ اب

یہ سلسلہ بند ہونا چاہیے۔ آدمیوں کے بل بوتے پر لڑتے رہنا بہت آسان ہے۔ انھیں تو صرف حکم دینا پڑتا ہے۔ یہ سب چیزیں میرے مزاج کے مُطابق نہیں ہیں۔ میں نے سب کچھ بیچ کر مستقل طور پر لاہور میں سیٹل ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس لیے میں زمین کا وہ ٹکڑا انھیں تحفتاً پیش کرتا ہوں جس کی وجہ سے ہمارے درمیان ایک احمقانہ سی دشمنی چلی آرہی ہے۔ اس کے علاوہ میں چونکہ ساری ہی زمین بیچ رہا ہوں اور اس علاقے میں ہم اور تم ہی دو بڑے زمیندار ہیں، اس لیے میں نے تمھارا حق مقدّم سمجھا ہے۔ میں تم سے پُوچھنے آیا ہوں کہ کیا تم سب کچھ خریدنے پر تیار ہو..... یا مجھے کسی اور علاقے سے کوئی پارٹی تلاش کرنا پڑے گی ؟"

ایک لمحے کے لیے ہال میں ایسا سکوت چھا گیا کہ سُوئی گرنے کی آواز بھی سنی جا سکتی تھی۔ امیر گوندل ایک ٹک میری آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ اُس کی نظریں ذہن کی گہرائیوں میں اُتر جانے والی تھیں۔

بالآخر وہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔" مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا۔"

" میں بالکل سنجیدہ ہوں۔" میں نے اُسے یقین دلایا۔

وہ صرف ایک لمحے سوچ کر بولا۔" میری طرف سے تو اس سلسلے میں ہاں ہی سمجھو لیکن مجھے اپنے چاروں بھائیوں سے بھی مشورہ کرنا پڑے گا۔ میرا ایک بھائی کراچی میں فیکٹری لگا کر بیٹھا ہوا ہے۔ اس سے میں فون پر بات کروں گا۔ پرسوں میں اس سلسلے میں کوئی حتمی بات کر سکوں گا۔"

" ٹھیک ہے۔ میں پرسوں تک انتظار کر لوں گا۔" میں نے کہا اور جانے کے لیے اُٹھنے لگا لیکن امیر گوندل نے بڑی اپنائیت سے مجھے ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بٹھلاتے ہوئے کہا۔" اب تم ایسے تو نہیں جا سکتے۔ مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ تم اتنے بہادر اور اتنے شاندار آدمی ہو۔ تمھارے سینے میں ایک سنہرا دل ہے۔ ہماری وجہ سے تمھیں آج تک جو بھی تکلیفیں پہنچیں، ان کے لیے میں تم سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتا ہوں۔ بولو تم مجھے معاف کر رہے ہو یا نہیں ؟"

" اگر میں نے تمھیں معاف نہ کیا ہوتا تو میں یہاں نہ آیا ہوتا۔" میں نے کہا۔

وہ اٹھا اور بڑے پُرجوش انداز میں مجھ سے لپٹ گیا۔" آج سے تم میرے جگری یار ہو... میرے بھائی ہو۔ زندگی میں کبھی کوئی کام پڑے، مجھے آواز دینا۔ تمھارے پسینے کی جگہ خون بہاؤں گا۔"

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دشمنی اور دوستی کے درمیان بہت باریک سی لکیر ہوتی ہے۔ لکیر سے اِدھر قدم رکھیے تو خون کی ندیاں بہنے لگتی ہیں۔ اُدھر قدم رکھیے تو محبتوں کے پھول کھلنے لگتے ہیں۔ اور یہ لکیر اتنی مبہم، اتنی نازک ہوتی ہے کہ ذرا ذرا سی غلط فہمیوں سے مِٹ جاتی ہے۔ اس کی بڑی حفاظت کرنا پڑتی ہے۔

میں بیٹھ چکا تو امیر نے ایک شخص کو آواز دی۔" حیاتے ! حویلی جا اور مرغیاں، بکرے وغیرہ ذبح کروا۔ کھانے کا عالیشان انتظام کروا۔ آج خرم ملک کی تشریف آوری کی خوشی میں بڑا کھانا ہو گا۔ ہماری طرف سے عام دعوت کا اعلان کر دے۔ جو بھی چاہے آکر کھا سکتا ہے۔ جا کر فٹافٹ انتظامات کر۔"

☆

زمین وغیرہ کا سودا ہو چکا تھا۔ بیعانہ بھی ہو گیا تھا لیکن باقی کارروائیاں اور لین دین مکمل ہونے میں ابھی دو تین ماہ لگنے تھے۔ اس دوران میرا ارادہ حویلی میں ہی رہنے کا تھا۔ تاہم میں نے لاہور کے دو تین اچھے علاقوں کے پراپرٹی ڈیلروں سے اپنے لیے کوئی کوٹھی تلاش کرنے کے لیے کہہ دیا تھا۔ ہفتے میں ایک آدھ مرتبہ میں لاہور چلا جاتا تھا۔

تنہا تنہا سے روز و شب گزر رہے تھے۔ میں نے اب حویلی کی اوپر کی منزل پر سونا شروع کر دیا تھا۔ رات گئے تک عموماً میں پڑھتا رہتا یا پرانے نغمے سُنتا رہتا۔ میرے پاس بہت پرانے کلاسیکل اور نیم کلاسیکل گانوں اور غزلوں وغیرہ کے ریکارڈز کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ موسیقی سے دل بہلانے کے بعد بھی اگر نیند نہ آتی تو میں طویل و عریض بالکونی میں ٹہلنے نکل جاتا۔ اگر آسمان پر چاند ہوتا تو باہر کا نظارہ خاصا دلکش لگتا۔

اس رات بھی میں بتّیاں بجھانے کے بعد سونے کے لیے لیٹ چکا تھا لیکن نیند نہیں آرہی تھی۔ زندگی کی بے مقصدیت اور روز و شب کا خالی پن کبھی کبھی اپنا کچھ زیادہ ہی اثر دکھاتا تھا۔ میں اُٹھ کر بالکونی میں جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ باہر مجھے بہت ہی خفیف سا کھٹکا سُنائی دیا جیسے کسی درخت کی شاخ چرچرائی ہو پھر ایک نہایت مدّھم آواز سُنائی دی جیسے بالکونی میں بلّی کُودی ہو۔

میں نہایت پھرتی لیکن خاموشی سے اُٹھ کر دروازے تک پہنچا اور بے آواز طریقے سے دروازہ صرف اس حد تک کھولا کہ باہر سے دیکھنے والے کو حرکت کا احساس بھی نہ ہو سکے۔ معمولی سی جِھری سے میں نے باہر دیکھا۔ بالکونی میں گلوب روشن تھا لیکن دیوار کے ساتھ ساتھ کچھ دور تک اندھیرا تھا اور اس اندھیرے میں میں نے اس ہیولے کو دیوار سے چپکے دیکھ لیا۔ وہ بظاہر اندھیرے ہی کا ایک حصّہ بنا ہوا تھا اور بالکل ساکت کھڑا تھا۔ سرسری نظر میں اتنی دور سے شاید اسے کوئی بھی نہ دیکھ پاتا۔ اس کا لباس جو کچھ بھی تھا، اس کا رنگ بھی سیاہ ہی معلوم ہوتا تھا۔

میں چاہتا تو تکیے کے نیچے سے ریوالور لا کر دروازہ مزید ذرا سا وا کر کے یہیں سے اس کا نشانہ لے سکتا تھا لیکن میں دیکھنا چاہتا تھا کہ یہاں اس کی آمد کا مقصد کیا ہے اور آیا وہ تنہا ہی ہے یا اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔

میں نے حویلی میں ملازموں کی تعداد کافی کم کر دی تھی تاہم اب بھی رات کے وقت ایک مسلّح چوکیدار سامنے کے گیٹ پر اور ایک عقبی دروازے پر موجود رہتا تھا۔ ان کی موجودگی میں دونوں طرف کی دیواروں پر تو کسی کا چڑھنا مشکل ہی نظر آتا تھا۔ سیڑھیوں پر بہت مضبوط گرل والا گیٹ تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ شخص سیدھا بالکونی میں کیسے پہنچ گیا تھا۔ ایک ہی طریقہ ممکن نظر آتا تھا۔ حویلی تین طرف سے درختوں میں گھری ہوئی تھی۔ شاید وہ بغلی دیوار کے قریب کسی اونچے درخت پر چڑھا ہو اور اس کی شاخ سے اس نے بالکونی کی دیوار پر چھلانگ لگائی ہو لیکن اس کے لیے بھی اس کا بلّی کی طرح سُبک اور پھرتیلا ہونا ضروری تھا کیونکہ قریب ترین درخت بھی دیوار سے کئی فٹ دور تھا۔ شاخ چرچرانے کی آواز بہرحال میں نے سنی تھی۔

تھوڑی دیر تک وہ ہیولا وہیں اندھیرے میں دیوار سے چپکا رہا۔ شاید وہ جائزہ لینے کی کوشش کر رہا تھا کہ کہیں اس کی آمد کو محسوس کیا گیا ہے یا نہیں۔ پھر دیوار کے ساتھ ساتھ ہی کِھسکتا ہوا وہ کمروں کی طرف بڑھا۔ بالآخر وہ ایک بیڈ روم کے دروازے پر آن رُکا۔

خاصا عرصہ پہلے ابّا جی اس کمرے میں سوتے تھے۔ پھر جب گلشن آراء آئی تھی تو اُنھوں نے نیچے کا ایک بیڈ روم اپنے لیے منتخب کر لیا تھا۔ غالباً امّی کو یہ دکھانے کے لیے کہ باقاعدہ شادی سے پہلے وہ گلشن کے پاس نہیں جا رہے ہیں۔ آج کل یہ کمرہ دوسرے بہت سے کمروں کی طرح خالی پڑا ہوا تھا۔ اور جہاں تک مجھے یاد تھا، اس کا دروازہ مقفل بھی نہیں تھا۔

فاصلہ کم ہو جانے کی وجہ سے اب وہ ہیولا مجھے قدرے واضح دکھائی دینے لگا تھا۔ وہ غالباً کسی گہرے رنگ کی جینز اور جیکٹ میں ملبوس تھا اور حرکات و سکنات کی تیزی سے نوجوان ہی معلوم ہوتا تھا۔ جوتے اس نے یقیناً کوئی بہت ہی نرم اور ہلکے پہنے ہوئے تھے اور کچھ اس کی مشّاقی بھی تھی کہ اس کے قدموں کی آہٹ بالکل نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے ذرا سی بھی آواز پیدا کیے بغیر ناب گھمائی اور پھرتی سے کمرے میں داخل ہو گیا۔

پہلا خیال میرے ذہن میں یہی آیا کہ شاید گلشن آراء نے اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کی حسبِ مقدور کوشش کی ہے اور مجھے قتل کرنے کے لیے کسی کو بھیجا ہے لیکن پھر یہ خیال مجھے کچھ زیادہ قرینِ قیاس محسوس نہیں ہوا۔ گلشن حویلی کے ماحول کو اچھی طرح جان چکی تھی۔ اِکّا دُکّا آدمی کا یہاں کچھ کر کے خیریت سے نکل جانا تقریباً ناممکن ہی تھا۔ دوسرے جب گلشن گئی تھی، اس وقت میرا بیڈ روم نیچے تھا۔ وہ کسی آدمی کو بھیجتے وقت کم از کم اتنا تو سمجھا کر ہی بھیجتی تاکہ وہ اِدھر اُدھر ٹامک ٹوئیاں مارتا نہ پھرتا۔

میں نے ریوالور لینا بھی ضروری نہ سمجھا اور آہستگی سے دروازہ کھول کر اس کمرے کی طرف لپکا۔ ننگے پاؤں اس دروازے تک پہنچ کر میں نے دیکھا کہ اس شخص نے اندر جانے کے بعد دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ جِھری سے آنکھ لگا کر میں نے دیکھا، وہ اس شاندار ماسٹر بیڈ کے پاس کچھ مایوسی کے سے عالم میں کھڑا تھا جس پر کبھی ابّا جی سویا کرتے تھے۔ بیڈ پر بستر آج بھی اسی طرح لگا ہوا تھا۔

نوجوان کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ ملگجے اندھیرے میں بھی اس کا پھل جھلملا رہا تھا۔ چند لمحے وہ نوجوان اسی طرح مایوسی کے عالم میں کھڑا رہا پھر یکدم جیسے اس پر جنون سا طاری ہوا اور وہ خالی بستر پر بے تحاشہ خنجر سے وار کرنے لگا۔ اس کے حلق سے غضبناک سی غراہٹیں خارج ہو رہی تھیں جیسے کسی زخمی درندے کو اپنی درندگی کے نکاس کا رستہ نہ ملا ہو۔

جب وہ اپنے اس مجنونانہ عمل میں اُلجھا ہوا تھا، میں پھرتی سے دروازہ کھول کر اندر سوئچ بورڈ کے قریب دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا اور اسے پتا بھی نہ چلا۔ اس نے خنجر سے میٹرس اُدھیڑ کر رکھ دی اور تب مجھے اس کی گھٹی گھٹی سی آواز میں کچھ بے ربط سے الفاظ بھی سُنائی دیے۔" آج تو بچ گیا شہریار... لیکن تیری... موت میرے

" سمجھ میں نہیں آتا کہ تاج محمد آلنسو جب بھی مچھلی کے شکار پر جاتے ہیں، اپنی بدصورت اور بد رونق بیوی کو کیوں ساتھ لے جاتے ہیں؟"
" شکار کا اپنا اپنا طریقہ ہے۔" بتایا گیا۔
" وہ اپنی بیوی کو دریا میں غوطہ دیتے ہیں تاکہ مچھلیاں ڈر جائیں اور دوسرے غوطے کے بعد جب مچھلیاں خوف زدہ ہو کر سطح پر اُبھر آتی ہیں تو ہاتھ بڑھا کر انہیں پکڑ لیتے ہیں۔"
" دوسرے غوطے کے بعد ؟"
" ہاں، پہلے غوطے پر مچھلیوں کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا۔"

ہی... ہاتھ سے لکھی ہے... میں پھر آؤں گا... میری زندگی... کا واحد مقصد... تجھے جہنم رسید کرنا ہے...!"

تب مجھے معلوم ہوگیا کہ وہ گلشن کا بھیجا ہوا آدمی نہیں تھا۔ وہ تو اباجی کا نام لے رہا تھا۔ یہ کوئی اور ہی قصہ تھا۔

میٹرس کے چیتھڑے اُڑانے کے بعد اسے کچھ قرار سا ملا۔ میرے خیال میں وہ اب تھک چکا تھا۔ تب اچانک میں نے لائٹ آن کرتے ہوئے کہا "کیوں تلاش ہے تمھیں شہریار کی؟"

سوال کا جواب تو ظاہر ہے مجھے فوری طور پر ملنا ہی نہیں تھا لیکن جس طرح بجلی کی سی تیزی سے وہ گھوما وہ میرے لیے ناقابلِ یقین تھی اور اس نے یقیناً صرف آواز ہی کو ہدف بناتے ہوئے خنجر میری طرف پھینکا تھا۔ اگر مجھے جھکائی دینے میں ایک ثانیے کی بھی تاخیر ہوئی ہوتی تو خنجر یقیناً میرے سینے میں پیوست ہوگیا ہوتا۔ خنجر پھینکنے والے میں نے چند ایک اور بھی دیکھے تھے لیکن اسے خنجر پھینکنے میں یقیناً کمال حاصل تھا۔ خنجر دروازے کی چوکھٹ میں پیوست ہوگیا۔

کمرے میں روشنی ہوچکی تھی اور اب ہم ایک دوسرے کو صاف دیکھ سکتے تھے مگر اس سے پہلے کہ میں سنبھل پاتا اُس نے نہایت پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جیکٹ کی جیب سے ایک چپٹا سا پستول بھی نکال لیا۔

"ذرا بھی مت ہلنا!" اس نے سرگوشی نما آواز میں تنبیہہ کی۔ اس کے لہجے میں سفاکی تھی مگر ساتھ ہی مجھے یہ احساس بھی ہوا کہ وہ آواز بدل کر بولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جس ہاتھ سے اس نے ریوالور تھاما ہوا تھا اس میں تھوڑا سا ارتعاش تھا۔ وہ کتنا ہی دلیر سہی لیکن بہرحال نروس تھا۔

اس کی رنگت میں ایک انوکھی سی ملاحت تھی اور موٹی موٹی وحشی آنکھیں بے پناہ کشش رکھتی تھیں۔ بھورے بال روشنی میں چمک رہے تھے اور بھرے بھرے ہونٹ اس وقت اعصابی تناؤ کی وجہ سے عجیب سے انداز میں بھینچے ہوئے تھے۔ وہ خوبصورت جسم کا مالک معلوم ہوتا تھا مگر اس کی ساخت میں مردانگی کی کچھ کمی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ ابھی اس کی مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں لیکن عمر کی مناسبت سے دیکھا جاتا تو اس نے خوب قد کاٹھ نکالا تھا۔ اس کے چہرے پر نسوانی سی ملائمت اور مردانہ سی کرختگی کا کچھ عجیب سا امتزاج تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ جہاں کہیں نسوانی کشش کی حدود ختم ہوتی ہیں اور مردانہ کرختگی کا آغاز ہوتا ہے اسی نقطۂ اتصال سے اس کی شخصیت نے جنم لیا ہے۔ جانے کیوں ایک لمحے کے لیے میں مبہوت سا ہوکر رہ گیا۔

"کون ہو تم...؟" وہ گھٹی گھٹی سی آواز میں بولا۔

"یہ سوال تو مجھے تم سے کرنا چاہیے۔" میں نے کافی حد تک پُرسکون لہجے میں کہا۔

لیکن وہ گویا میری آواز پر توجہ دیے بغیر بولا "تمھاری صورت میں شہریار ملک کی بڑی جھلک ہے... لگتا ہے اسی کے بیٹے ہو...!" اس کا لہجہ خود کلامی کا سا ہوگیا تھا "تم شاید خرم ملک ہو..."

اس کا مطلب تھا کہ وہ اباجی کو صورت سے پہچانتا بھی تھا۔ وہ خود کلامی کے سے انداز میں ہی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے... میں تمھیں بھی ہلاک کرکے کافی خوشی محسوس کروں گا... آخر تم بھی اسی سانپ کے سنپولیے ہو۔" پھر وہ پستول کی حرکت سے اشارہ کرتے ہوئے بولا "ادھر ہٹ جاؤ... اس دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہوجاؤ۔ میں تمھیں خنجر سے ہی ہلاک کرنا چاہتا ہوں تاکہ کوئی آواز پیدا نہ ہو لیکن اگر تم نے کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تو میں نتائج کی پروا کیے بغیر یہ پستول تم پر خالی کردوں گا۔"

میں خاموش رہا اور اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے دوسری دیوار کی طرف کھسک گیا۔ اس کی باتوں اور حرکات و سکنات سے اب.... مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس قسم کی کارروائیاں اور مار دھاڑ وغیرہ اس کے لیے نئی چیز تو نہیں لیکن پھر بھی وہ بہت زیادہ مشاق یا کوئی پیشہ ور قاتل نظر نہیں آتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا تھا کہ شاید وہ کسی خوشحال گھرانے کا بگڑا ہوا آوارہ اور سرکش لڑکا ہے۔

مجھے بدستور پستول کی زد پر لیے وہ ترچھے رُخ دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ چوکھٹ میں پیوست خنجر نکالنا چاہتا تھا لیکن جب وہ چوکھٹ تک پہنچا تو لامحالہ مجھ پر نظر رکھنے کی کوشش میں اس کی پشت دروازے کی طرف تھی۔

اب تک میں دل ہی دل میں بہت پچھتا رہا تھا کہ زیادہ خوش فہمی میں مبتلا ہوکر میں کیوں ریوالور کے بغیر اس کمرے میں آن پہنچا لیکن اب میرا پچھتاوا دور ہوگیا۔ اس نے نادانستگی میں مجھے ایک موقع فراہم کر دیا تھا۔

اس کے اور میرے درمیان فاصلہ کم ہوچکا تھا۔ میں نے ایک پرانا فارمولا استعمال کیا اور اس کے عقب میں دروازے کی طرف دیکھ کر یوں چونکا جیسے کوئی دروازے پر نمودار ہوا ہو۔ پھر میں بدحواسی کی اداکاری کرتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر چلایا "نہیں... مارنا مت۔"

نوجوان دھوکے میں آگیا اور ریوالور کا رُخ دروازے کی طرف کرتے ہوئے مشینی انداز میں گھوم گیا۔ میرے لیے اتنا موقع کافی تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ پر ٹھوکر رسید کی۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر نہ جانے کہاں گرا لیکن وہ اسی طرح پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پلٹا اور اس نے میری گردن پر جوڈو کا وار کرنے کی کوشش کی مگر میں جھکائی دینے میں کامیاب ہوگیا اور اس کے ساتھ ہی اس کی ایک کلائی میری گرفت میں آگئی۔ میں نے اسے جھٹکا دیتے ہوئے ایک داؤ لگا کر گرانے کی کوشش کی مگر وہ گرنے سے بچ گیا۔ وہ زیادہ طاقتور نہیں تھا مگر داؤ پیچ جانتا تھا۔ جوڈو میں البتہ اسے کچھ زیادہ مہارت نہیں تھی۔

ہم گتھم گتھا ہوگئے۔ بالآخر میں نے اسے اس طرح قابو میں کرلیا کہ اس کے دونوں بازو اس کی پشت پر اور میری گرفت میں تھے۔ وہ بھی اس طرح کہ اگر وہ مزید زور آزمائی کی کوشش کرتا تو اس کا کندھا اتر سکتا تھا۔ میں اسے کوئی گزند پہنچانا نہیں چاہتا تھا ورنہ شاید اب تک وہ ڈھیر ہوچکا ہوتا۔ میں نے اسے تباہ شدہ بیڈ پر دھکیل دیا اور لپک کر قریب ہی فرش پر پڑا پستول اُٹھا لیا۔

وہ تڑپ کر میٹرس کے اسپرنگوں پر میری طرف پلٹا لیکن میرے ہاتھ میں پستول دیکھ کر شکست خوردہ سے انداز میں بیٹھ گیا۔ وہ اب یقیناً تھک چکا تھا۔ اب تک کے مرحلوں میں اس نے نہ جانے کتنی مشقت اُٹھائی تھی۔

میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میری قوتِ گویائی سلب ہوچکی ہے کیونکہ اس دوران مجھ پر ایک حیرت انگیز انکشاف ہوچکا تھا کہ وہ لڑکا نہیں، درحقیقت لڑکی تھی۔

"اب تم مجھے بتاؤ گی کہ تم کون ہو؟" بالآخر میں نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

"بتاؤ گی...؟ کیا مطلب؟" اس کی آنکھیں پھیل گئیں "تم میرے لیے مؤنث کا صیغہ کیوں استعمال کر رہے ہو؟ میں کوئی لڑکی تو نہیں ہوں۔"

اس نے اپنے لہجے سے برہمی کا تاثر دینے کی بھی پوری کوشش کی تھی لیکن اس کی خوبصورت آنکھوں نے اس کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ ان آنکھوں کی گہرائیوں میں ایک انجانا سا خوف جھلک آیا تھا جیسے اس کے لڑکی ہونے کا راز افشاء ہوجانا اس کے لیے کسی بہت بڑے نقصان کا باعث بن سکتا ہو۔ اس دوران غیر ارادی طور پر اس نے اپنی چمڑے کی ڈھیلی ڈھالی جیکٹ کو بھی ٹٹولا مگر اس کی زِپ بدستور بند تھی جس سے اسے غالباً کچھ ڈھارس ہوئی۔

"جب تم لڑکی ہو تو لڑکی کہلانے سے اس قدر خوف زدہ کیوں ہو؟" میں نے ملائمت سے کہا۔

اس نے محسوس کرلیا کہ اب تردید کا کوئی فائدہ نہیں۔ یکبارگی اس کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ معلوم نہیں غصے سے یا کسی اور احساس سے۔ وہ گویا فضا میں کسی اَن دیکھی اور غیر مرئی چیز کو ٹھوکر رسید کرتے ہوئے بولی "نہیں کہلانا چاہتی میں لڑکی۔ میرا بس چلے تو دنیا کی ساری لڑکیوں کو لڑکا بننے کی ترغیب دینے کے لیے تحریک چلاؤں۔ نفرت ہے مجھے لڑکی کہلانے سے۔" اس کے لہجے میں کوئی کہانی بول رہی تھی۔

"کیوں؟" میں نے پلک جھپکائے بغیر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" اس نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔

"دلچسپی پیدا ہوگئی ہے تمھاری ذات سے۔" میں نے بلا تامل جواب دیا۔ اور یہ ایک سچا جواب تھا۔

"اپنے پاس رکھو اپنی دلچسپی۔" وہ حقارت سے بولی "اور یہ یاد رکھنا کہ اگر تم نے مجھے زندہ چھوڑ دیا تو میں تمھیں قتل ضرور کردوں گی۔ موت کے ڈر سے میں منافقت سے کام نہیں لوں گی۔"

"لیکن کیوں قتل کرو گی؟ کیا جرم ہے میرا؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔

"تمھارا یہی جرم کیا کم ہے کہ تم شہریار ملک کے بیٹے ہو۔" وہ نفرت بھری نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"اور شہریار ملک کا جرم کیا ہے؟" میں نے بدستور ملائمت سے پوچھا۔

"اس کے بیٹے ہوکر تم یہ بات مجھ سے پوچھ رہے ہو؟" وہ استہزائیہ لہجے میں بولی "اس کے جرائم کی فہرست تو اتنی لمبی ہے کہ شاید فرشتے بھی حشر کے دن اسے پڑھتے پڑھتے تھک جائیں۔"

"میں صرف اس جرم کے بارے میں پوچھ رہا ہوں جس کا تعلق تمھاری ذات سے ہے۔" میں نے کاؤچ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ پستول کا رُخ میں نے اب بھی اس کی طرف ہی رکھا تھا۔

ایک لمحے اس نے کچھ سوچا پھر سر ہلا کر بولی "ہاں... تمھیں تو معلوم نہیں ہوگا... واقعہ بہت پرانا ہے اور بہت معمولی گھرانے سے اس کا تعلق تھا۔ تمھاری 'رعایا' میں سے ایک گھرانہ۔" اس کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔

میں خاموش رہا۔ میرے دل کی دھڑکن معمول سے کچھ تیز تھی۔

ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی "اسی گاؤں کے پرلے سرے پر ایک چھوٹا سا مکان تھا جس میں رہتے تھے وہ لوگ۔ بہت مختصر سا کنبہ تھا۔ میاں بیوی اور پانچ چھ سال کی ایک بچی۔ مرد ذرا بڑی عمر کا تھا اور عام سی شکل و صورت کا مالک تھا جبکہ بیوی نوجوان بھی تھی اور بے حد حسین بھی۔ اس کا حسین ہونا ہی اس کا جرم بن گیا۔ حالانکہ وہ دیگر بہت سی عورتوں کی طرح کھیتوں میں کام بھی نہیں کرتی تھی اور زیادہ تر گھر میں ہی رہتی تھی لیکن نہ جانے کس طرح شہریار ملک کی اس پر نظر پڑ گئی۔ اور بس یہ نظر پڑنا ہی غضب ہوگیا۔ وہ بھوکے درندے کی طرح اس کے پیچھے پڑ گیا۔ پہلے تو اسے پیغامات بھجوا کر، بڑے بڑے لالچ دے کر ڈیرے پر بلانے کی کوشش کی گئی۔ جب اس نے سختی سے مزاحمت کی تو اسے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی مگر کسی طرح وہ بچ گئی۔ ایک بار شوہر پر بھی قاتلانہ حملہ ہوا لیکن اس کی زندگی کچھ زیادہ لکھی تھی۔ وہ بھی بچ گیا اور وحشت زدہ ہوکر اپنی بیوی اور بچی کو لے کر چوری چھپے اس علاقے سے نکل جانے کا پروگرام بنانے لگا مگر اس سے پہلے کہ وہ اس

ارادے پر عمل کر پاتا، ایک رات اس مکان میں خوف ناک طریقے سے آگ لگ گئی۔ وہ شخص بہ مشکل اپنی بچّی کو بچا کر نکل پایا۔ صورتِ حال کچھ ایسی تھی کہ ایک وقت میں وہ کسی ایک کو لے کر ہی بھڑکتے شعلوں کے درمیان سے نکل سکتا تھا۔ اس نے پہلے بچّی کو بچانے کی کوشش کی۔ بچّی کی ماں بھی یہی چاہتی تھی کہ پہلے بچّی کی جان بچائی جائے۔ جب وہ اپنی نیم سوختہ بیوی کو نکالنے کے لیے پلٹ کر آیا تو اندھیرے سے گولیاں برسنے لگیں۔ نہ وہ شعلوں میں گھس سکا اور نہ وہ بدنصیب عورت باہر آ سکی۔ بچّی نے اپنی آنکھوں سے اپنی ماں کو آگ میں جلتے دیکھا اور اس کی آخری کرب ناک چیخیں بھی سنیں۔ اس رات کا وہ منظر اس بچّی کے ذہن میں آج بھی اسی طرح تازہ ہے جیسے یہ کل کی بات ہو اور وہ چیخیں آج بھی اس کے کانوں میں گونجتی ہیں۔ کبھی کبھی تو وہ راتوں کو سوتے میں اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے۔" وہ خاموش ہو گئی جیسے آنسو پینے کی کوشش کر رہی ہو۔

"اور وہ بچّی یقیناً تم ہو۔" میں نے بوجھل لہجے میں کہا۔ میرا دل واقعی بوجھل ہو چکا تھا۔ میں اس قسم کے واقعات کی بازگشت سے فرار حاصل کرنا چاہتا تھا مگر کسی نہ کسی واقعے کی کوئی نہ کوئی پرچھائیں سامنے آن کھڑی ہوتی تھی اور مجھے میری ہی نظروں میں شرمسار کر دیتی تھی۔

"ہاں۔ وہ بچّی میں ہی ہوں۔" اس نے تسلیم کیا۔ "باباجی مجھے سینے سے لگائے کسی نہ کسی طرح اس نامہرباں رات کی تاریکی میں لاہور کی طرف نکل گئے تھے۔ رفتہ رفتہ سر چھپانے کا ٹھکانا بھی میسر آ گیا اور کسی نہ کسی طرح گزر بسر بھی ہونے لگی لیکن اس بچّی کے ننھے سے ذہن پر بہت بڑی اور بھیانک تصویریں نقش ہو کر رہ گئی تھیں۔ اتنی کم عمری میں بھی اسے ایک حقیقت کا ادراک ضرور ہو گیا تھا کہ عورت۔ اور خصوصاً غریب عورت اس معاشرے کا ایک نہایت ہی بے کار حصہ ہے۔ تھوڑی سی بھی طاقت رکھنے والے جس شخص کا جب بھی دل چاہتا ہے اسے کچلتا ہوا، روندتا ہوا گزر جاتا ہے۔ مجھے اپنے لڑکی ہونے سے نفرت محسوس ہونے لگی۔ مرد میری نظر میں بہرحال فائدے میں تھا۔ مرد کتنا بھی کمزور ہو اس پر اتنا ظلم نہیں کیا جا سکتا جتنا عورت پر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ میں بچپن ہی سے لڑکوں میں اٹھتی بیٹھتی آئی ہوں۔ انہی جیسے کپڑے پہنتی ہوں۔ مار دھاڑ میں نے بڑی محنت سے سیکھی ہے۔"

"اور اب شاید تم باپ بیٹی کے مالی حالات بھی اچھے ہیں۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔ اس کی جینز، جیکٹ اور جوتے بیش قیمت تھے۔ پستول بھی معمولی نہیں تھا۔

"مالی حالت تو ہماری وہی ہے لیکن مجھے اب اس کی کوئی خاص فکر نہیں رہی۔ مجھے جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے، وہ میں پستول، خنجر یا پھر زورِ بازو سے حاصل کر لیتی ہوں۔" اس نے بے پروائی سے کہا اور پیشانی پر جھکتے ہوئے بال گردن جھٹک کر پیچھے کیے۔ "ویسے بھی بابا نے میرے طور طریقوں سے خوف زدہ ہو کر مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ وہ الگ رہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جب تک میں سیدھی سادی لڑکی نہیں بن جاتی وہ مجھ سے تعلق نہیں رکھیں گے۔"

اس نے ایک بار پھر ہوا میں کسی غیر مرئی چیز کو ٹھوکر ماری۔ "سیدھی سادی لڑکی! ہونہہ! ایک ایسی لڑکی جس کا ہاتھ پکڑ کر وہ بھیڑ بکری کی طرح کسی کے حوالے کر سکیں۔ یا جیسے جب بھی کوئی بدمعاش چاہے اٹھا کر لے جائے اور اگر وہ مزاحمت کرے تو اسے اس کے اپنے ہی گھر کی آگ میں زندہ جلا دیا جائے۔ لعنت بھیجتی ہوں میں ایسی لڑکی بننے پر۔ اس لیے جہاں میں رہتی ہوں وہاں کسی کو معلوم ہی نہیں ہے کہ میں لڑکی ہوں۔ لڑکے کی حیثیت سے بہت کم لوگ مجھے جانتے پہچانتے ہیں اور جو جانتے ہیں وہ مجھ سے ڈرتے ہیں۔ مجھ سے کوئی ذرا سی اڑی کرے تو دانت توڑ دیتی ہوں۔"

"مجھے یقین ہے۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ اس کی آواز میں ذرا سی تبدیلی آئی تھی تو آواز نسوانی معلوم ہونے لگی تھی۔

وہ کٹی پھٹی میٹریس پر پہلو بدلتے ہوئے بولی۔ "میں نے تمھیں سب باتیں یوں اطمینان سے بتا دی ہیں جیسے میں تمھاری مہمان ہوں اور بطورِ خاص تم سے ملنے اور تمھیں اپنے حالات سے آگاہ کرنے آئی ہوں۔ اب تم بھی مجھے بتا دو کہ شہریار ملک آج اپنی خواب گاہ میں موجود کیوں نہیں ہے... اور دوسری بات یہ بھی بتا دو کہ اب تم مجھ سے کیا سلوک کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

میں نے اس کے سوالوں کا جواب دینے کے بجائے پوچھا۔ "تم نے یہاں آنے سے پہلے یقیناً حویلی کے بارے میں تو معلومات حاصل کی ہوں گی... میں نے تمھیں بالکونی میں کودنے کے بعد سیدھے اسی کمرے کی طرف آتے دیکھا تھا جو کبھی اباجی کا بیڈروم ہوا کرتا تھا۔"

"ہاں۔ میں نے معلومات حاصل کی تھیں حویلی کے ایک سابق ملازم سے۔" اس نے تسلیم کیا۔ "لیکن میری معلومات کچھ پرانی ہیں۔ چھ ماہ پہلے کی۔"

"اب میں تمھاری معلومات کے لیے بتا دوں کہ ان چھ مہینوں میں یہاں بڑا انقلاب آ چکا ہے۔" میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "شہریار ملک اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔"

وہ ایک لمحے کے لیے چونکی مگر پھر اپنی حیرت کو چھپا گئی۔ وہ کسی قسم کے ردِ عمل کا اظہار کرنا شاید اپنی شان کے خلاف سمجھتی تھی۔ میں نے اس کے سپاٹ چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمھیں خوشی نہیں ہوئی اس خبر سے؟"

"نہیں۔" وہ بلاتامل بولی۔ "خوشی مجھے اس وقت ہوتی جب وہ میرے ہاتھ سے مرتا۔"

"اپنے باپ سے محبت مجھے بھی نہیں تھی لیکن اب ان کی موت کے بعد ان کے بارے میں اس قدر نفرت کا اظہار مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔ مرنے والوں کو معاف کر دیا کرتے ہیں۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"میں تو معاف نہیں کر سکتی۔" اس نے بے لچک لہجے میں کہا۔ "میں نفرت کا زہر پی پی کر پلی بڑھی ہوں۔ یہ زہر میرے لہو میں دوڑ رہا ہے۔ خیر... یہ بحث چھوڑو... تم یہ بتاؤ کہ میرے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"تم جانے کے لیے بالکل آزاد ہو۔ جس وقت چاہو اٹھ کر جا سکتی ہو۔" میں نے پستول گود میں رکھتے ہوئے کہا۔ یہ دیکھ کر میں نے اطمینان کی سانس لی کہ اس نے مجھ پر حملہ آور ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"لیکن میں چاہتا ہوں کہ جانے سے پہلے تم میری چند گزارشات ضرور سن جاؤ۔ شاید تمھاری رگوں میں دوڑتے ہوئے لہو کا زہریلا پن کچھ کم ہو سکے۔" میں نے مخلصانہ لہجے میں کہا۔ "اکثر اوقات والدین کی غلطیوں، خامیوں یا گناہوں کا خمیازہ ان کی اولاد کو بھی بھگتنا پڑتا ہے۔ مجھے جتنے گناہوں کا بوجھ اباجی سے ورثے میں ملا ہے، میں اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ اس بوجھ کو اٹھا سکوں یا خود اتنا نیک بن سکوں کہ گناہ و ثواب کا پلڑا برابر ہو سکے۔ اس لیے میں یہ سب کچھ چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ میرا قیام یہاں بہت تھوڑے دنوں کے لیے ہے۔ یہ حویلی، زمینیں سب کچھ میں نے گوندلوں کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے اور ان سے میں نے ہاتھ جوڑ کر یہی درخواست کی تھی کہ ہو سکے تو اپنی ذمّے داری اور فرض سمجھ کر اس علاقے میں انصاف قائم کرنا اور اس بات کا خیال رکھنا کہ کسی کمزور کے ساتھ ظلم نہ ہونے پائے ورنہ تمھارا انجام بھی میرے اباجی سے مختلف نہیں ہوگا۔ مجھے امید ہے وہ میری اس التجا کا خیال رکھیں گے کیونکہ وہ لوگ اباجی سے بہت مختلف ہیں..."

پھر میں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ اباجی کس طرح مارے گئے تھے، میں کس قسم کے خیالات اور نظریات کا آدمی تھا، کیا سوچتا تھا، کیا چاہتا تھا۔ اور یہ کہ اب علاقے کے حالات کتنے مختلف تھے۔

وہ سب کچھ خاموشی سے سنتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں ملائمت کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ آخر میں میں نے کہا۔ "تمھارا دل مانے تو میری مہمان بن کر یہاں رہو۔ گاؤں میں گھومو پھرو۔ حالات کا جائزہ لو اور دیکھو کہ لوگ کتنے خوش ہیں۔ اگر کوئی یہ کہہ دے کہ اسے میری ذات سے کوئی تکلیف پہنچی ہے تو تم آ کر میرا گریبان پکڑ لینا۔"

وہ گہری نظروں سے میرا جائزہ لے رہی تھی۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا۔ "زیادہ نہیں تو اس رات کے جو دو چار گھنٹے باقی رہ گئے ہیں وہ یہیں گزارو اور صبح مجھے بتاؤ کہ میں تمھارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔ یہ درست ہے کہ میں تمھیں تمھاری ماں واپس نہیں دلا سکتا۔ جتنے برس تم نے اذیت و نفرت کی آگ میں جلتے ہوئے گزارے ان کی تلافی نہیں کر سکتا۔ تمھارے ذہن پر جو بھیانک تصویریں نقش ہو کر رہ گئی ہیں انھیں نہیں کھرچ سکتا۔ لیکن بس اپنے اخلاص اور ندامت کے اظہار کے لیے دنیاوی سطح پر تمھارے لیے کچھ کر سکتا ہوں۔ کوئی مکان، زمین کا کوئی ٹکڑا جو تمھیں پسند ہو، وہ تمھیں اور تمھارے بابا کو یہاں دے سکتا ہوں یا کہیں اور کسی بھی طرح کی مدد تمھارے لیے قابلِ قبول ہو، وہ میں کرنے کے لیے تیار ہوں۔ تم اس سلسلے میں ٹھنڈے دل سے سوچو۔ غیر جذباتی ہو کر غور کرو..."

"غیر جذباتی ہو کر سوچنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔" اس نے میری بات کاٹتے ہوئے گویا وضاحت کی۔

"ٹھیک ہے... تم جذباتی رہو۔ جذباتی ہونا کوئی معیوب بات نہیں۔ لیکن اگر کوئی دوسرا اچھے جذبات کا اظہار کرے تو اس پر بھی توجہ دو۔" میں نے ملائمت سے کہا اور پھر اس کا پستول اس کی طرف اچھال دیا۔ "اپنا یہ پستول اور خنجر بھی اپنے پاس رکھو۔ بیڈ کو تو تم نے برباد کر دیا ہے۔ اب اس کاؤچ پر سو جاؤ اور سمجھو کہ تم اپنے ایک مقروض کے گھر میں ہو۔ میں تمھارے کمرے کا دروازہ باہر سے بند نہیں کر کے جاؤں گا۔ برابر والا کمرہ چھوڑ کر اگلا کمرہ میرا ہے۔ اس کا دروازہ بھی غیر مقفّل ہوگا۔ تم آرام سے لیٹ کر بہت اچھی طرح غور کرو۔ اگر تمھارا دل یہ کہے کہ مجھے ہلاک کر کے تمھارے زخم کچھ مندمل ہو سکتے ہیں، تمھیں کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے تو بلا دھڑک آنا اور اپنا پستول میرے سینے پر خالی کر کے یا اپنے خنجر سے میری شہ رگ کاٹ کر یہاں سے فرار ہو جانا۔ اوّل تو میں اس وقت شاید سو رہا ہوں گا اور اگر بیدار بھی ہوا تو کوئی مزاحمت نہیں کروں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ اور اگر تم مجھے بے گناہ محسوس کرو تو صبح اٹھ کر کوئی حکم دینا۔ میں پورا کرنے کی کوشش کروں گا۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ پہلی بار اس کے ہونٹوں پر بہت مدّھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی جیسے پورا ماہتاب حرکت میں آیا ہو مگر گہرے بادلوں نے اس کا راستہ روک لیا ہو، تھوڑی سی کرنیں ہی زمین تک پہنچ پائی ہوں۔

"تم بہت عجیب آدمی ہو۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"جبکہ میرے خیال میں تم بہت عجیب لڑکی ہو۔" میں نے کہا

اور دروازہ کھول کر آہستگی سے باہر آگیا۔ اس نے عقب سے مجھ پر فائر نہیں کیا۔ یہ میری پہلی جیت تھی۔

اپنے کمرے میں آکر میں حسب وعدہ دروازہ غیر مقفل چھوڑ کر لیٹ گیا۔ میں جوا ہی کھیل رہا تھا لیکن یہ کچھ اس قسم کا جوا تھا جس میں بازی جیتنے کا مجھے سو فیصد یقین تھا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ سوتے میں مجھے ہلاک کرنے کے ارادے سے نہیں آئے گی۔

بہت دیر تک میں ساکت لیٹا جاگتی آنکھوں سے ان گنت خواب دیکھتا رہا۔ وہ لوگ جو دوسروں کو غیر جذباتی بن کر سوچنے کے مشورے دیتے ہیں، عموماً اندر سے خود بڑے جذباتی ہوتے ہیں۔ میں خود بیشتر فیصلے بظاہر بڑے پُرسکون انداز میں کرتا تھا لیکن درحقیقت وہ بے حد جذباتی ہوتے تھے۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اب تک کوئی فیصلہ میرے لیے جان لیوا یا نقصان دہ ثابت نہیں ہوا تھا۔

..... اور یہ جو لڑکی تھی۔ جس سے میں اتنے پُرسکون انداز میں سب کچھ کہہ سن کر آگیا تھا، اس نے درحقیقت میرے محسوسات کی دنیا میں ہل چل مچادی تھی۔ میرے اندر کا منظر اتھل پتھل کر کے رکھ دیا تھا۔ میں بچپن سے تنہائیوں کے جس جنگل میں بھٹک رہا تھا، آج اس کے ملگجے اندھیروں میں کسی کے قدموں کی آہٹ اُبھر رہی تھی۔ جاگتی آنکھوں سے خواب تو میں ہمیشہ ہی دیکھتا آیا تھا لیکن آج ان خوابوں میں گویا رنگ بھرنے لگے تھے۔ آج سے پہلے خواہشوں کی دُنیا انوکھے تخیلاتی ہیولوں سے سجی رہتی تھی لیکن آج یہ ہیولے گویا انگڑائی لے کر بیدار ہونے لگے تھے۔ انسانی نفسیات بھی اتنی گنجلک چیز ہے کہ بعض اوقات لفظوں کی گرفت میں بالکل نہیں آتی۔ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، شاید آپ کو سمجھا نہ سکوں۔

میں نے جب سے ہوش سنبھالا تھا، ایک پرچھائیں کا تعاقب کر رہا تھا۔ یہ پرچھائیں میرے خوابوں کی رہگزر پر برسوں سے سفر کر رہی تھی اور جب بھی میں اُسے چھونے کی کوشش کرتا تھا، وہ پلٹ کر، اپنے اچھوتے خدوخال کی ایک جھلک دکھا کر کسی انجانے دیس کی طرف چل دیتی تھی۔ اندھیروں میں کھو جاتی تھی، میرے شعور کو جل دے جاتی تھی۔

لیکن آج کی شب اندھیروں کے بطن سے نکل کر یہ پرچھائیں بالکل روشن اور واضح ہوگئی تھی۔ ایک زندہ سلامت لڑکی کا رُوپ دھار کر میرے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔ بلاشبہ یہی وہ لڑکی تھی جس کے تعاقب میں میرا تخیل برسوں سے بھٹک رہا تھا۔ عالم یہ تھا کہ میں اس کا نام تک نہیں جانتا تھا مگر اس کا وجود خوشبو کی طرح اس وقت بھی میرے آس پاس مہک رہا تھا، جلترنگ کی طرح کانوں میں گونج رہا تھا اور گھٹا کی طرح حواس پر چھا گیا تھا۔

میں تصور ہی تصور میں اس سے باتیں کر رہا تھا ـــ میں صدیوں سے تمھیں ڈھونڈ رہا تھا..... لیکن تم ملی ہو تو اتنے عجیب انداز میں، اتنے غیر دلکش حالات میں ـــ اور پھر آج کل کا یہ ایٹمی دور۔ اس پر مستزاد یہ کہ تم بھی زمانے سے کچھ تیز دوڑ رہی ہو ـــ اب ان تمام حالات میں کس طرح میں یہ فرسودہ جملہ دُہراؤں کہ مجھے تم سے محبت ہے؟ میں تمھیں کس دلیل کے ساتھ سمجھاؤں کہ وہ تمھی ہو جس کے ساتھ میں بچپن میں ریت کے نم آلود گھروندے بناتا رہا ہوں ـــ وہ تمھی ہو جس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے میں نے خوبانیوں اور سیبوں سے لدے درختوں کے درمیان میلوں لمبے سنسان رستوں پر سیر کی ہے۔ وہ تمھی ہو جس کا ملیح چہرہ میں نے نہر کے خنک پانی سے بارہا بھگویا ہے۔ وہ تمھی ہو جس کے رُوٹھے رُوٹھے لبوں پر میں نے ان گنت لطیفوں سے مسکراہٹیں سجائی ہیں ـــ وہ تمھی ہو جس کی آنکھوں میں جھلملاتے ہوئے آنسو میں نے بارہا اپنی اُنگلیوں سے پونچھے ہیں۔ وہ تمھی ہو جو زندگی کے نہ جانے کس کس موڑ پر مجھے مل کر بچھڑتی رہی ہے اور میں موت وحیات کی بھول بھلیوں سے گزرتا ہوا صدیوں بعد ایک بار پھر تم تک آ پہنچا ہوں ـــ مگر یہ سب باتیں میں تمھیں کیسے بتاؤں؟ بہت افسانوی سا لگتا ہے یہ سب کچھ ـــ اور پھر تم یقین بھی کب کرو گی ـــ اتنی بدگمان ہو تم مجھ سے..... اور شاید ساری دُنیا سے۔ لیکن خیر..... اب تم مل گئی ہو تو ساری بدگمانیاں دُور ہو جائیں گی۔ ان محبتوں کی زبان تمھاری سمجھ میں آجائے گی، جنھیں خاموشی سے سینے میں چھپائے میں اب تک بھٹک رہا تھا۔

پھر مجھے نیند آگئی۔ اتنی آسودگی کی نیند میں زندگی میں شاید کبھی نہیں سویا تھا۔ جانے کیوں میں اتنا خوش تھا! شاید وہ عجیب لڑکی اس لیے میرا آئیڈیل تھی کہ اس کی شخصیت، اس کی حرکات و سکنات اور اس کی ہر بات میں ایک جارحیت تھی۔ وہ بپھری ہوئی ایک پہاڑی ندی تھی۔ اور میں ایک پُرسکون جھیل..... شخصیتوں اور مزاجوں کا یہ تضاد ہی شاید اس آئیڈیل ازم کی بنیاد تھا۔ اس میں جتنی تُندی و تیزی تھی مجھ میں اتنا ہی ٹھہراؤ اور رسانیت تھی ـــ اور شاید مقناطیس کے ایک مخالف سرے کو دُوسرا سرا اپنی جانب کھینچ رہا تھا۔

صبح اٹھا تو یوں لگ رہا تھا جیسے میں نے ایک نیا جنم لیا ہے۔ میں ایک نئی مسرت دل میں لیے اس کمرے کی طرف چلا۔ رات اگر اتنے سکون سے گزری تھی تو اس کا مطلب یہی تھا کہ اس نے میری باتوں پر غور کیا تھا۔ میری ندامت کو اہمیت دی تھی۔ شہریار ملک کا بیٹا ہونے کے جرم کے باوجود مجھے معافی دے دی تھی اور شاید میری تلافی کی پیش کش کو بھی قبول کر لیا تھا۔

لیکن جب میں نے کمرے کا دروازہ کھولا تو میرا دل ڈوب گیا۔ وہ کمرے میں نہیں تھی۔ رات کے نہ جانے کون سے پہر کس راستے سے وہ رخصت ہو چکی تھی۔ مجھے ایک دھچکا سا لگا۔ اس نے اچھا نہیں کیا تھا۔ اسے شاید معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ کیسی معصوم خوشی کی کلی کو پیروں تلے مسل کر جا رہی ہے۔ میرا تجربہ ناکام ہو گیا تھا۔ میں نے اسے کسی بندھن کے بغیر روکنا چاہا تھا مگر شاید میرے جذبوں میں اس کے لیے اتنی کشش نہیں تھی۔ میری رُوح پر یہی یخ بستہ سی اُداسی چھا گئی۔

پھر ایک موہوم سی امید نے مجھے سہارا دیا ـــ شاید پھر کبھی وہ لوٹ کر آئے ـــ شاید..... ! اور یہ 'شاید' میری زندگی کی واحد دلچسپی تھی مگر پھر دن گھٹتے رہے اور راتیں رنگتی رہیں لیکن نہ وہ آئی، اور نہ کہیں اس کا نام و نشان دکھائی دیا مگر میں اس کا انتظار کیے جا رہا تھا۔ شاید اندر سے میں بہت افسانوی سا آدمی تھا۔ صرف ایک پرچھائیں، ایک خواب سی ملاقات، کسی اَن کہی بات کی خاطر زندگی کے سنہرے دن رائیگاں بِتائے جا رہا تھا اور نہ جانے کب تک یوں ہی اس کا انتظار کرنے کے لیے تیار تھا جس نے آنے کا کوئی وعدہ بھی نہیں کیا تھا ـــ اور جو ایک بار آئی بھی تھی تو ایک واہمے کی طرح کسی ادھورے خواب کی طرح۔

بالآخر میری جائیداد کی ٹرانزیکشن مکمل ہو گئی۔ روپیہ میرے اکاؤنٹ میں منتقل ہو گیا اور میں بادیدۂ نم اپنے اس آبائی علاقے کو خیرباد کہہ کر لاہور آگیا جہاں گلبرگ میں میں ایک کوٹھی خرید چکا تھا اور اب وہ فرنش بھی ہو چکی تھی۔

☆

لاہور منتقل ہوئے مجھے کئی ماہ ہو چکے تھے۔ دن اچھے ہی گزر رہے تھے۔ آدمی کے پاس روپیہ ہو، فارغ البالی ہو تو حلقۂ احباب خود بخود وسیع ہو جاتا ہے۔ میرے احباب میں بھی ہر طرح کے، ہر عمر کے اور ہر ذوق کے لوگ شامل تھے۔ مشاعرے منعقد کرانے والے، شکار پر جانے والے، پینے پلانے کی محفلیں جمانے والے، زندگی کی تمام رنگینیوں میں دلچسپی لینے والے، خشک قسم کے مباحثوں میں حصہ لیتے لیتے سر دھڑ کی بازی لگا دینے والے، مکمل طور پر بے فکرے یا دن بھر بزنس میں سر کھپا کر شام کو نشاط کی چند گھڑیوں کے متلاشی۔ میں سب کے مشاغل میں شریک تھا۔

لیکن دل کا جو ایک گوشہ ویران تھا، وہ اب بھی ویران چلا آرہا تھا۔ تشنگی اب بھی زندگی میں ہم سفر تھی۔ ایک بے عنوان انتظار اب بھی جاری تھا۔ ایک پرچھائیں اب بھی دل میں مقید تھی۔

ایک روز ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔

میں ایک دوست کے ہاں گیا۔ اس کے پورچ میں پہلے ہی تین گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اِس لیے مجھے اپنی گاڑی گلی میں ہی چھوڑنا پڑی۔ گاڑی کے دروازے وغیرہ لاک کرنے کے معاملے میں میں زیادہ محتاط نہیں ہوں۔ میں اندر پہنچا تو وہاں تاش کی محفل جمی ہوئی تھی۔ میں عموماً زندگی کی ہر چیز میں کچھ نہ کچھ دلچسپی لیتا ہوں لیکن تاش سے عموماً میں جلد بور ہو جاتا ہوں۔ کچھ دیر بیٹھ کر میں وہاں سے نکل آیا۔

رات کے تقریباً گیارہ کا وقت تھا۔ گلی میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ مجھے اندیشہ یہی محسوس ہو رہا تھا کہ آج کی شام تو بوریت ہی میں گزری ہے، اب باقی وقت بھی بوریت میں گزرے گا۔ وہ ایک خاص دوست جن سے میری گاڑھی چھنتی تھی، انھوں نے شام ہی کو فون کر کے اطلاع دے دی تھی کہ وہ کچھ ضروری کاموں میں مصروف ہیں، آج میری طرف نہیں آسکیں گے۔

گاڑی میں بیٹھتے وقت میں یہی سوچ رہا تھا کہ مجھے کس طرف جانا چاہیے۔ اب تو کبھی کبھی فارغ البالی سے اُکتا کر میں سوچنے لگتا تھا کہ مجھے بھی کوئی کاروبار کر لینا چاہیے۔ دو تین کاروبار کرنے والے دوست ہر قسم کی مدد اور رہنمائی کی پیش کش بھی کر چکے تھے لیکن ابھی میں ذہنی طور پر اس کے لیے آمادہ نہیں ہوا تھا۔

کسی فیصلے پر پہنچے بغیر میں گلبرگ کی ایک سنسان مگر کشادہ گلی سے سست رفتاری سے گزر رہا تھا کہ عقب سے پستول یا ریوالور کی سرد نال میری کنپٹی سے آلگی اور کسی نے سرگوشی نما لہجے میں کہا۔
"گاڑی ایک طرف کر کے روک دو۔"

ایک لمحے کے لیے میرے اعصاب میں تناؤ پیدا ہوا لیکن فوراً ہی میں نے اپنے آپ پر قابو پا لیا اور پُرسکون ہو گیا۔ عقب نما آئینے میں بھی دیکھنے کی کوشش کی لیکن ملگجے اندھیرے میں کچھ نظر نہ آیا۔ میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔

گاڑی رکنے پر وہ بولا "— چابیاں اگنیشن میں ہی چھوڑ کر اتر جاؤ۔ اترنے سے پہلے اپنا پرس نکال کر ڈیش بورڈ پر رکھ دو۔ پرس میں کوئی ضروری چیز ہو تو وہ بھی نکال سکتے ہو۔ لیکن زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کرنا.... جان سے جاؤ گے۔" اس نے خود ہی ہاتھ بلند کر کے رُوف لائٹ آن کر دی۔ تاہم زاویہ ایسا تھا کہ اب بھی اس کی شکل عقب نما آئینے میں نظر نہیں آ رہی تھی۔

میں نے ایک لمحے تامل کیا تو وہ گویا مجھے سمجھاتے ہوئے بولا۔ "معمولی سے نقصان کے لیے جان کو داؤ پر لگانا کوئی عقل مندی نہیں ہے۔ گاڑی کل پرسوں کسی سڑک کے کنارے کھڑی مل جائے گی۔ صرف رقم کا ہی نقصان ہو گا۔"

"کیا میں یہ بھی اطمینان رکھوں کہ میری گاڑی کسی واردات میں استعمال نہیں ہو گی؟" میں نے ایک سیدھے سادے اور نہایت شریف شہری کے سے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

"زیادہ امکان تو یہی ہے — لیکن میں کوئی وعدہ نہیں کرتا۔" وہ کوئی بہت ہی راست گو قسم کا لٹیرا معلوم ہوتا تھا۔

میں نے پرس نکالا اور اُسے کھولتے وقت ذرا جوا کھیلنے کا فیصلہ کر لیا، جو میرے لیے خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا، لیکن خطرات کو میں زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔

نہایت تیزی سے گھومتے ہوئے میں نے اُس کے ریوالور والے ہاتھ پر ہاتھ ڈالتے ہوئے اُسے اُونچا کر دیا، تاکہ اگر وہ فائر بھی کرے تو گولی چھت میں لگے۔ ساتھ ہی میں نے اس کی کنپٹی پر گھونسا رسید کر دیا۔ وہ پچھلی سیٹ پر ڈھیر ہو گیا۔ پستول میرے ہاتھ میں آ گیا.... لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے افسوس ہوا کہ میں نے اسے گھونسا کیوں رسید کیا۔ وہ تو وہی دشمنِ جاں تھی، جس کی میرے دل کو ایک مدت سے تلاش تھی۔

ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔ پھر اس نے سر جھٹکتے ہوئے آنکھیں کھولیں اور سنبھل کر بیٹھ گئی۔ بلاشبہ وہ بہت سخت جان تھی ورنہ یہ گھونسا کھا کر اسے ایک آدھ منٹ تو اٹھنا نہیں چاہیے تھا۔ اس کی پی کیپ سر سے اتر کر ایک کونے میں جا گری تھی۔ اس نے اُسے اٹھا کر دوبارہ سر پر رکھا۔ ابھی تک اس نے صحیح طور پر میری طرف نہیں دیکھا تھا۔

"معاف کرنا دوست!" میں نے حقیقتاً معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہ تم ہو تو نہ صرف گاڑی خاموشی سے تمھارے حوالے کر دیتا بلکہ ڈرائیور کے فرائض انجام دیتے ہوئے جہاں تم کہتیں وہیں چھوڑ کر آتا۔"

وہ کنپٹی سہلاتے ہوئے بولی۔ "اور اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہ تم ہو تو میں اتنی لمبی بات کرنے کے بجائے خاموشی سے تمھاری کھوپڑی میں گولی اتار دیتی۔"

"اِتنی بے مروّتی؟" میں نے تاسف سے کہا۔

"مروّت کا میری زندگی میں کوئی دخل نہیں۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

میں نے اس کا پستول اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ رکھ لو اور اگلی سیٹ پر آ جاؤ۔"

اس نے پستول جیب میں رکھ لیا اور اگلی سیٹ پر آ گئی — حسبِ سابق وہ مردانہ لباس میں تھی اور پہلے سے کچھ سلم نظر آ رہی تھی تاہم لہجے کا کھُردراپن کچھ بڑھ گیا تھا۔ شاید وہ اپنی لائن میں پختہ کار ہوتی جا رہی تھی۔

"کیا تم میرا گھر دیکھنا پسند کرو گی؟" میں نے پوچھا۔ "اگر تم چاہو تو مجھے وہاں چھوڑ کر گاڑی لے جانا۔"

"نہیں — اب تم مجھے میرے گھر ہی چھوڑ دو۔" وہ قدرے پُرسکون لہجے میں بولی۔ "سارا پروگرام ہی چوپٹ ہو گیا ہے۔"

"کہاں ہے تمھارا گھر؟" میں نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ میری مایوسی کسی حد تک دُور ہو گئی تھی۔ میں کم از کم اس کا ٹھکانا تو دیکھ ہی سکتا تھا۔ رابطے کا امکان رہ سکتا تھا۔

"یہیں.... گلبرگ ہی میں۔" اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

"اگلے چوراہے سے مین مارکیٹ کی طرف موڑ لینا۔" سڑکیں اُس وقت تقریباً سنسان ہی نظر آ رہی تھیں۔

"میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ زندگی میں کبھی تم سے دوبارہ بھی سامنا ہو گا۔" ایک لمحے کے بوجھل سکوت کے بعد وہ بولی۔

"شاید یہ میری طلب اور جذبے کی صداقت کا کمال ہے۔" میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "میں تم سے دوبارہ ملنے کا بڑی شدت سے خواہش مند تھا۔"

"کیوں؟" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"اگر میں تمھیں یہ بتاؤں کہ میں تمھارے بارے میں کیا محسوس کرتا ہوں تو شاید تم یقین نہ کرو۔" میں نے کہا۔

وہ ایک لمحے خاموش رہی پھر قدرے رکھائی سے بولی — "خرم ملک! تمھارے ذہن میں میرا تاثر ایک آوارہ لڑکی کا ہو گا.... اور بعض پہلوؤں سے شاید میں ایک آوارہ لڑکی ہوں بھی — لیکن یہ مت سمجھنا کہ میں تمھاری دولت مندی دیکھ کر پھسل جاؤں گی اور تم مجھے افسانوی محبّت کا جھانسا دے کر اپنے لیے کھلونا بنا سکو گے۔"

"کیا تمھیں زندگی میں کبھی سچّے جذبوں سے واسطہ نہیں پڑا؟ کیا سچّائیوں کی خوب صورتی نے کبھی تمھیں متاثر نہیں کیا؟" میں نے قدرے افسوس سے پوچھا۔

"میں نے کبھی سچّائیاں تلاش کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔" وہ بے پروائی سے بولی۔ "نہ مجھے اس کی ضرورت پڑی اور نہ ہی دلچسپی محسوس ہوئی۔ میرا اپنا بس ایک لائف اسٹائل ہے اور مجھے اسی میں لطف آتا ہے۔ باقی ساری دنیا کو میں نے ٹھوکر مار دی ہے۔"

"زندگی کی طرف کوئی اچھا روّیہ نہیں ہے یہ — سُود مند طرزِ عمل نہیں ہے۔" میں نے مربیانہ لہجے میں کہا۔

"مجھے سبق پڑھانے کی کوشش مت کرو۔ سبق پڑھانے والوں سے مجھے سخت چڑ ہے۔" وہ بے زاری سے بولی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے چوراہے پر کار موڑتے ہوئے کہا۔ "کتنے افسوس کی بات ہے کہ مجھے تمھارا نام تک نہیں معلوم —"

"کون سا نام؟" اس نے پُوچھا۔ "جو میرے ماں باپ نے رکھا تھا یا جس نام سے میں مشہور ہوں؟"

"دونوں ہی بتا دو۔" میں نے کہا۔

"اصل نام سلطانہ ہے..... لیکن میں لوگوں کے لیے سلطان بن گئی ہوں۔ میرے قریبی دوست مجھے صرف ستو کہتے ہیں۔" اُس نے بتایا۔ "میں نے لڑکیوں کے کالج میں پڑھا ہے۔ وہاں بھی میں صرف کالج میں سُلطانہ ہوتی تھی۔ گھر آ کر سُلطان بن جاتی تھی — کالج چھوڑنے کے بعد تو میں مکمل طور پر ہی سلطان بن گئی۔ سلطانہ کو میں نے مار کر کہیں دفن کر دیا۔"

"اپنے اصل کو کوئی مار کر کہیں دفن نہیں کر سکتا۔ حقیقت میں تم سلطانہ ہو اور ہمیشہ سلطانہ ہی رہو گی۔" میں نے کہا۔

اس دَوران ہم مین مارکیٹ پہنچ چکے تھے۔ اس نے ایک کئی منزلہ عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہاں روک لینا۔"

یہ غالباً بہُت چھوٹے چھوٹے فلیٹوں پر مشتمل عمارت تھی۔ مجھے کبھی اس کے اندر جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ یہاں تمام متصل عمارتوں کے نیچے برآمدہ سا تھا جو فٹ پاتھ کا کام دیتا تھا۔ اسی برآمدے میں دکانوں کی قطار تھی اور کہیں کہیں فلیٹوں میں رہنے والوں کی موٹر سائیکلیں وغیرہ کھڑی تھیں۔

سُلطانہ کچھ کہے بغیر گاڑی سے اُتر گئی۔ لگتا یہی تھا کہ وہ مجھے ساتھ آنے کی دعوت نہیں دے گی۔ میں نے خود ہی کہا۔ "آدمی بیشک اپنا لائف اسٹائل بدل لے، مگر اسے اتنا بد اخلاق تو نہیں ہونا چاہیے کہ گھر آئے مہمان کو ایک کپ چائے بھی نہ پُوچھے۔"

"چائے....؟" وہ جانے کیوں استہزائیہ سے انداز میں ہنس دی۔ "تمھیں میرے ساتھ آنا ہے تو آ جاؤ — لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ تمھیں چائے میسّر آسکے گی یا نہیں۔"

میں اُس کے ساتھ عمارت کے تنگ سے زینے کی طرف بڑھا۔ اس کی چال میں غضب کی دل کشی بھی تھی اور کمال کی تمکنت بھی۔ انداز کچھ کچھ ایسا ہی تھا جیسے اس سارے علاقے کی مالک وہی ہو۔ دکانیں وغیرہ بند ہی تھیں البتہ مین مارکیٹ کے راؤنڈ اباؤٹ کے قریب کڑاہی گوشت وغیرہ کی دکانوں پر کچھ رونق نظر آ رہی تھی۔

برآمدے میں وہ ایک پُرانی سی اسپورٹس موٹر سائیکل کے قریب سے گزرتے گزرتے رُک گئی۔ اس میں سے پٹرول ٹپک ٹپک کر نیچے پختہ فرش پر پھیل رہا تھا۔ اس نے جھک کر ٹنکی کے نیچے لگا ہوا نوزل کا والو بند کیا اور پٹرول ٹپکنا بند ہو گیا۔ سلطانہ نے یوں پیار سے موٹر سائیکل پر ہاتھ پھیرا جیسے وہ کوئی جان دار شے ہو۔

"میری وفادار موٹر سائیکل اب تھک گئی ہے — ساتھ چھوڑ دیا ہے اس نے میرا۔" خود کلامی کے سے انداز میں یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئی۔

سیڑھیوں میں زیرو کا ایک میلا سا بلب مقدور بھر روشنی پھیلا رہا تھا۔ سیڑھیوں کے دونوں طرف دیواروں پر میل کی تہیں اور داغ دھبے نظر آ رہے تھے۔ سیڑھیوں پر مٹی کوڑے کے علاوہ کپڑوں کی بے شمار کترنیں بھی بکھری ہوئی تھیں۔ شاید عمارت میں کوئی درزی خانہ بھی تھا۔

فرسٹ فلور پر پہنچ کر وہ بائیں طرف مڑ گئی۔ تنگ سی بالکونی

سے گزر کر ہم کونے کے فلیٹ کی طرف بڑھے۔ تمام فلیٹوں کے دروازے کھڑکیاں بند تھیں اور ایسا سکوت طاری تھا، جیسے وہاں کوئی نہ رہتا ہو۔ چاروں طرف ملگجا سا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ عمارت کی ساخت ایک چوکور کنوئیں کی سی تھی۔

جس دروازے پر پہنچ کر وہ رُکی اس پر طرح طرح کے اسٹکرز چسپاں تھے۔ شاید اس طرح دروازے کی بوسیدگی اور بدرنگی چھپانے کی کوشش کی گئی تھی۔

سلطانہ نے رازدارانہ سے انداز میں دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلتے ہی چرس کے دھوئیں کا بھبکا میرے نتھنوں سے ٹکرایا لیکن میں سلطانہ کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہو گیا۔ دروازہ کھولنے والا لڑکا تھا لیکن اس کے بال لڑکیوں سے بھی لمبے تھے۔ ماتھے پر اس نے کالی پٹی بھی لپیٹی ہوئی تھی۔ وہ بڑے بڑے پھولوں والی شوخ رنگ کی شرٹ اور کالی بیل باٹم پتلون میں تھا۔ وہ بے حد دُبلا تھا۔ اس کی انگلیوں میں سگریٹ دبی ہوئی تھی۔

ہمارے عقب میں اس نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ وہ ایک ڈربہ نما کمرہ تھا۔ ایک طرف لکڑی کی بوسیدہ سی الماری کھڑی تھی۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ فوم کا گدا بچھا ہوا تھا۔ فرنیچر کے طور پر کمرے میں صرف ایک بے ہنگم سی کرسی اور تین ٹانگ کی تپائی تھی، فرش پر اِدھر اُدھر کتابیں، رسالے اور پرانے اخبار بکھرے ہوئے تھے۔ انھی کے درمیان چائے کے کئی گندے مگ، سگریٹوں سے بھری ہوئی ایش ٹرے، ایک ٹوٹا ہوا ہیٹر، ایک پرانا ریڈیو، چند گلاس، اور المونیم کا جگ بھی لڑھکا ہوا تھا۔ دیواروں پر نہایت جارحانہ قسم کی تصویروں والے پوسٹر چسپاں تھے۔ شکار پر چھلانگ لگاتا ہوا چیتا، اچھل کر ایک چٹان سے دُوسری چٹان پر پہنچتی ہوئی موٹر سائکل، اپنے حریف کو لہولہان کرتا ہوا باکسر اور اسی قسم کی دوسری تصویریں۔

دروازہ کھولنے والے کے علاوہ بھی کمرے میں دو لڑکے موجود تھے۔ وہ بھی تقریباً اسی قبیل کے تھے۔ تینوں کی دُھندلائی ہوئی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی اور وہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ لگتا یہی تھا کہ وہ دیوار سے ہٹے تو لڑھک جائیں گے۔ انھوں نے میرے بارے میں کچھ پُوچھنا تو درکنار، میری طرف غور سے دیکھا بھی نہیں۔ کمرہ چرس کے دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔

سلطانہ دروازے ہی کے قریب تن کر کھڑی تھی۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ چٹکی بجاتے ہوئے ان تینوں سے مخاطب ہوئی "اب تم تینوں دفع ہو جاؤ اور جا کر اپنے اپنے بلوں میں گھُس کر سو جاؤ، آج کا پروگرام غارت ہو گیا ہے۔"

"کیوں؟" تینوں نے بیک وقت مخمور آواز میں، گنگنانے کے سے انداز میں پُوچھا۔

"جس سے گاڑی چھیننے کی کوشش کی وہ دوست نکل آیا۔" سلطانہ نے جواب دیا۔ اور مجھے ایک بے عنوان سی خوشی ہوئی کہ اس نے مجھے دوست کہا تھا۔

"یہ تو اور بھی اچھا ہے۔" پھولدار شرٹ والے نے سگریٹ اپنے ساتھی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "دوست سے تو گاڑی اور پیسے اُدھار بھی مانگے جا سکتے ہیں۔"

"مگر میں مانگنا نہیں چاہتا۔" سلطانہ کی آواز اور انداز بدستور لڑکوں والا تھا۔ اس نے ایک بار پھر چٹکی بجائی۔ "میں نے کہا ہے کہ تم تینوں دفع ہو جاؤ۔"

"یس باس!" ایک لڑکے نے یہ کہتے ہوئے اُٹھ کر باقاعدہ اُسے سلیوٹ کیا۔ دُوسرے نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دی اور وہ تینوں سعادت مندانہ انداز میں رخصت ہو گئے۔

"بیٹھو۔" سلطانہ نے بے ہنگم کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "اور اگر تمھارا بیش قیمت سُوٹ خراب ہو جائے تو شکوہ مت کرنا۔"

میں بیٹھ چکا تو وہ گدّے پر دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گئی اور فرش پر پڑے ہوئے ایک پیکٹ سے سگریٹ نکال کر سُلگانے لگی۔ یہ سگریٹ شاید 'سادہ' ہی تھا۔

فلیٹ دو چھوٹے چھوٹے کمروں پر مشتمل تھا۔ دُوسرے کمرے کی حالت بھی مختلف نہیں تھی۔ درمیانی دروازہ کھُلا تھا اور اُدھر بھی اسی طرح کاٹھ کباڑ اور میلے کپڑوں کے انبار نظر آ رہے تھے۔

"تمھیں یہ فلیٹ مل کس طرح گیا؟" میں نے پُوچھا۔

"اللہ اپنے ناپسندیدہ بندوں کو بھی پیٹ بھرنے کو روٹی اور سر چھُپانے کو ٹھکانہ دے ہی دیتا ہے۔ یہ صرف انسان ہی ہے جس کا بس چلے تو وہ اپنے ناپسندیدہ انسانوں کو نیست و نابود کر دے۔" وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی پھر گویا میری تسلّی کے لیے اصل جواب کی طرف آتے ہوئے بولی "— مدّتوں پہلے یہ فلیٹ کسی شریف آدمی نے کرائے پر لیا ہو گا۔ اس نے غالباً ازراہِ مہربانی اپنے کسی دوست کو دے دیا — اس نے اپنے کسی دوست کو..... اور یوں ہوتے ہوتے اب میں اس میں رہ رہی ہوں۔ مالک اس عمارت کا ملک سے باہر ہے۔ بس چوکیدار آتا ہے۔ کرایہ لے کر رسید دے جاتا ہے۔ اسے کوئی خاص دلچسپی نہیں کہ کہاں کون رہ رہا ہے۔" ایک طویل کش لے کر اس نے ہوا میں دھوئیں سے چھلّے بنا دیے۔

"اچھا..... یہ بتاؤ.....!" میں نے تحلیل ہوتے ہوئے دھوئیں کے چھلّوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر تم مجھ سے گاڑی اور پیسے چھیننے میں کامیاب ہو جاتیں تو کیا کرتیں؟"

"کچھ نہیں — بس ہم سب ذرا آوارہ گردی کرتے۔ کسی اچھے ہوٹل میں کھانا کھاتے۔ ریڈھ لگانے والے انداز میں گاڑی کو رات بھر سڑکوں پر دوڑاتے۔ شاید کہیں کولڈ ڈرنک کی دو چار بوتلیں بھی سڑک پر توڑتے..... اور ممکن ہے کوئی چھوٹی موٹی واردات بھی کر بیٹھتے۔"

"ماشاء اللہ! کیا عمدہ لائف اسٹائل اپنایا ہے تم نے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا اور ایک بار پھر فلیٹ کا جائزہ لیا۔

"زیادہ طنز گو بننے کی ضرورت نہیں۔" وہ قدرے برہمی سے بولی۔ میں چند لمحے ایک ٹک اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کا ملیح سراپا میرے دل کو جانے کیوں اتھل پتھل کر دیتا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ مجھ سے بات کرتے وقت وہ اپنے لیے لڑکی کا ہی صیغہ استعمال کرنے لگتی تھی اور اس کی آواز میں وہ معمولی سی تبدیلی بھی آ جاتی تھی جو اُسے نسوانی بنا دیتی تھی۔

"میں تمھیں ایک اہم بات بتاؤں سلطانہ.....!" میں نے نہایت دھیمی آواز میں کہا۔ "کچھ عرصہ پہلے میں نے اخبار میں چند سطر کی ایک چھوٹی سی خبر پڑھی کہ لڑکے کے بھیس میں پھرنے والی ایک لڑکی کو پولیس نے پکڑا ہے جو کئی وارداتیں کر چکی تھی۔ کبھی کسی ٹیکسی ڈرائیور سے ٹیکسی چھین لیتی تھی۔ کبھی سنسان گلی میں کسی کو روک کر سینے پر چاقو رکھ کر رقم چھین لیتی تھی — میرا ذہن فوراً تمھاری طرف گیا۔ میں ایک بڑے وکیل کو ساتھ لے کر متعلقہ تھانے میں گیا — وہ لڑکی کوئی اور تھی۔ لیکن بہر حال..... یوں سمجھو کہ محض تمھاری یاد کے صدقے میں اس کے لیے بھی جو کچھ ہو سکتا تھا وہ میں نے کیا۔ اس کی جان چھڑا دی اور اس کے بعد وہ غائب ہو گئی — لیکن اصل بات جو میں تمھیں بتانا چاہتا ہوں لیکن صحیح طرح بتا نہیں سکتا، وہ یہ ہے کہ جس وقت ہم نے اس لڑکا سی لڑکی کو حوالات سے نکلوایا، اس کی حالت غیر تھی — وہ سیدھی طرح چل بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کے ساتھ اس قدر تشدد ہوا کہ ناقابلِ بیان ہے — کافی دن اسے اسپتال میں گزارنے پڑے تھے۔"

اس کے ملیح چہرے پر تناؤ آ گیا تھا اور آنکھیں سُلگنے لگی تھیں۔ وہ تُند لہجے میں بولی۔ "میں نے آج تک کوئی سنگین جرم نہیں کیا۔ کسی پر ظلم نہیں ڈھایا — لیکن میں نے تہیّہ کیا ہوا ہے کہ زندہ حالت میں پولیس کے ہاتھ نہیں آؤں گی۔ جس دن بھی مجھے یقین ہو گیا کہ بچ نکلنے کا کوئی رستہ نہیں، میں اپنی کنپٹی پر پستول رکھ کر گولی چلا لوں گی اور اگر میرے پاس پستول نہ ہوا تو چاقو سے اپنی شہ رگ کاٹ لوں گی۔"

"لیکن تمھیں بلاوجہ اپنی جان کے لیے اتنے عذاب مول لینے کی آخر ضرورت کیا ہے؟" میں نے اُلجھن آمیز لہجے میں کہا۔

"اس مُعاشرے میں اکثر لوگوں کی زندگیاں دوسرے لوگ بسر کر رہے ہیں — لیکن یہ میری زندگی ہے اور اسے میں ہی بسر کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے غیر متزلزل لہجے میں کہا۔ پھر گویا اس موضوع سے پیچھا چھڑانے کے لیے بولی۔ "میں تمھارے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔" وہ اُٹھ کر دُوسرے کمرے میں پہنچی۔ میں بھی ٹہلنے کے سے انداز میں اس کے

پیچھے چل دیا۔

دوسرے کمرے کے ایک کونے میں کچن نما حصّہ تھا۔ اس کی حالت بھی تباہ تھی۔ چُولہا گویا سیاہی کے ڈھیر میں دفن تھا۔ سنک پر سنے ہوئے برتن الٹے سیدھے پڑے تھے۔ شیلف میں چند ڈبّے الٹے سیدھے پڑے تھے۔

"برتن وغیرہ دیکھ کر گھن مت کھانا۔" اُس نے گویا مجھے خبردار کیا۔ "تمھارے لیے یہی اعزاز کافی ہے کہ تم سلطانہ کے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے پیو گے۔"

میں اسے اسکاؤٹوں والے انداز میں پھُرتی اور مشّاقی سے چائے بناتے اور مگوں میں اُنڈیلتے دیکھتا رہا۔ پھر ہم اپنے اپنے مگ اٹھائے اپنی اپنی جگہوں پر آ بیٹھے اور میں نے اسٹرانگ چائے کی پہلی چُسکی لی۔ اس میں گویا زندگی کی حرارت شامل تھی۔ جارحیت بھری زندگی کی حرارت۔

چند لمحے بعد میں نے گویا ٹوٹا ہوا سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ "لیکن تم نے کبھی غور کیا سُلطانہ..... کہ یہ زندگی بھی بھلا کوئی زندگی ہے؟"

"تمھیں مجھ پر ترس کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ ایک بار پھر برہم سی ہو گئی۔ "مجھے وہ لوگ زہر لگتے ہیں، جو مجھ پر ترس کھانے کی کوشش کریں — بلکہ شاید ہر ایک کو ہی لگتے ہیں۔" پھر جیسے وہ اپنے غصّے پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ "تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"میں تمھیں بتانا چاہتا ہوں کہ سات بیڈ رُومز کی ایک عالی شان کوٹھی..... زندگی کی بہت سی چمکتی دمکتی آسائشیں..... اور محبت پانے اور محبت لٹانے کا خواہشمند ایک انسان تمھارے آس پاس تمھارا انتظار کر رہا ہے۔ آخر تم یہ سب کچھ ترک کر کے، تج کے اس کی کیوں نہیں ہو جاتیں؟ یقین کرو کسی کا ہو کر رہنے میں بڑی لذت ہے۔" میرے لہجے میں التجا تھی۔

اس نے عجیب سے انداز میں قدرے بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔ "یہ ہماری صرف دوسری ملاقات ہے۔۔اور میں نے پہلی ہی ملاقات پر تمہاری آنکھوں میں خواب بنتے بگڑتے دیکھے تھے۔ ہم لڑکیاں اس معاملے میں بہت حساس ہوتی ہیں۔ میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ایک دولت منداور معزز آدمی کو ایک آوارہ، وحشی اور خود گزیدہ لڑکی میں ایسی مر مٹنے والی کون سی بات نظر آگئی ہے؟"

"میں خود بھی نہیں سمجھ سکا ورنہ تمہیں سمجھانے کی کوشش ضرور کرتا۔" میں نے بے بسی سے کہا۔ "بعض خواب سمجھنے سمجھانے کے لیے نہیں ہوتے اور تم میرا خواب ہو۔"

اس کے چہرے پر صرف ایک ثانیے کے لیے ایک رنگ آیا اور گزر گیا پھر جیسے وہ اپنے پتھریلے قالب میں واپس آتے ہوئے بولی۔ "میں اپنی زندگی سے محظوظ ہو رہی ہوں۔ مجھے کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ میں کسی کی سات بیڈ روم کی کوٹھی یا چلکتی دمکتی آسائشوں میں جاکر پناہ لوں۔ اور نہ ہی مجھے ابھی کسی سے اتنی محبت محسوس ہوئی ہے۔۔۔اور پھر ہم دونوں کی کلاس بہت مختلف ہے۔ ممکن ہے مجھ میں ابھی تمہارے لیے بہت کشش ہو لیکن یہ کشش کچھ ویسی ہی معلوم ہوتی ہے جیسی کوئی بچہ کسی نئی طرز کے کھلونے میں محسوس کرتا ہے لیکن بالآخر ایک دن بچے کا دل اس کھلونے سے بھی بھر جاتا ہے۔ وہ اسے بھی ایک کونے میں پھینک دیتا ہے۔ میں داشتہ بن کر، کھلونا بن کر نہیں رہنا چاہتی۔"

"تمہیں کون سی ضمانت چاہیے کہ تمہارے ساتھ ایسا نہیں ہوگا؟ میں ہر ضمانت دینے کے لیے تیار ہوں۔" میں نے بے چارگی سے کہا۔

"مجھے کوئی ضمانت نہیں چاہیے۔ میرا دل میری ضمانت ہے اور میرا دل ابھی اس معاملے میں خاموش ہے۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میرا دل جیسے سرد سا ہو گیا۔ میں خاموشی سے چائے کے گھونٹ بھرنے لگا۔ ذہن و دل پر یکایک اسی افسردگی کا حملہ ہوا تھا جو شاید ازل سے میرے ساتھ چلی آرہی تھی۔

ہم دونوں چائے کے مگ خالی کر کے رکھ چکے تو وہ نئی سگریٹ سلگاتے ہوئے بولی۔ "اب تم جاؤ۔ اپنے سوا میں نے آج تک اس فلیٹ میں کسی اور کو رات بسر کرنے کی اجازت نہیں دی۔"

"میں جا ہی رہا تھا۔" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "رات بسر کرنا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ مسئلہ زندگی بسر کرنے کا ہے۔" دروازے کی طرف ہاتھ بڑھاتے بڑھاتے رک کر میں نے اپنا وِزیٹنگ کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میں کسی قابل تو نہیں لیکن اگر کبھی ضرورت پڑے۔۔۔یا دل اجازت دے تو اس نمبر پر رِنگ کر لینا۔ اس پر میرا ایڈریس بھی ہے۔"

اس نے وِزیٹنگ کارڈ لے کر بے پروائی سے گدّے پر پھینک دیا۔ میرے دل کو ایک اور دھچکا سا لگا۔ آثار بتا رہے تھے کہ مستقبل قریب میں کبھی اگر اس کمرے میں جھاڑو دی گئی تو میرا وِزیٹنگ کارڈ بھی کوڑے کرکٹ کے ساتھ چلا جائے گا۔ میں نے بس ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور خاموشی سے باہر آگیا۔ چاروں طرف ایک بے نام سی اداسی طاری تھی۔

☆

میں نے کئی دن نہیں بلکہ کئی ہفتے انتظار کیا۔ ایک موہوم سی اُمیّد تھی کہ شاید کوئی سندیسہ آئے۔ کوئی بے عنوان سا پیغام۔ کوئی بے مفہوم سی بات۔ رابطے کی کوئی بھی مبہم سی کڑی۔ کسی بہلنے تو آوازِ دوست سنائی دے۔ لیکن دوسری طرف وہی بے رحم سکوت طاری رہا۔

بالآخر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک روز میں ہی اس کے ہاں پہنچا۔ بہت بے تابی تھی یہ جاننے کی کہ وہ کہاں ہے۔۔کس حال میں ہے۔

کئی مرتبہ دستک دی لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ کمرے کی کھڑکی میں گرل تھی اور اس کے پیچھے شیشہ تھا جس کے عقب میں خاکی کاغذ چپکا ہوا تھا۔ ایک کونے میں ناخن برابر کاغذ اُکھڑا ہوا تھا۔ میں نے وہاں آنکھ لگا کر اندر کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ فلیٹ ویران ویران سا لگ رہا تھا۔ صرف گدّا اور کرسی تپائی نظر آرہی تھی۔ دوسرا کوئی سامان وغیرہ نہیں تھا۔ فرش پر گرد کی تہ جمی ہوئی تھی۔

میں کھڑکی سے ہٹا تو یہ دیکھ کر قدرے شرمندہ سا ہو گیا کہ برابر کے فلیٹ کا دروازہ تھوڑا سا کھول کر ایک دُبلا پتلا سیاہ فام سا، ادھیڑ عمر شخص قدرے خوف زدہ سے انداز میں باہر جھانک رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں نے اگر ذرا سخت نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ فوراً دروازہ بند کرلے گا۔

میں معذرت خواہانہ انداز میں مسکرایا تو گویا اس کا کچھ حوصلہ بڑھا اور اس نے دروازہ تھوڑا اور کھولتے ہوئے پوچھا۔ "ستو کو دیکھنا پڑا؟" وہ غالباً کرسچین تھا۔

"جی ہاں۔ آپ کو کچھ معلوم ہے اس کے متعلق؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"ایک دن اِدھر دو پولیس والا اس کی تلاش میں آیا۔۔اسی دن سے ستو ایکدم گائب ہے۔ اپنا لگیج بھی لے گیا ہے۔ یہ اَم کو بالکل کھبر نہیں کہ کدھر گیا ہے۔" اس نے ایک لمحے توقف کیا پھر ہمدردانہ اور رازدارانہ سے لہجے میں بولا۔ "آپ کا کوئی اُدھار مدھار تو نہیں تھا اس کی طرف؟"

"نہیں جی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بلکہ اس کا میری طرف بہت سا قرض نکلتا ہے۔" میں اس کا شکریہ ادا کر کے نیچے آگیا۔ دل ایک بار پھر بوجھل ہو گیا تھا۔ میں پرچھائیں کے تعاقب میں تھا اور پرچھائیں ہر بار اپنی جھلک دکھا کر غائب ہو جاتی تھی۔

اس کے بعد گزرتے گزرتے پورے تین برس گزر گئے۔

اگر وہ مل جاتی تو شاید یقین نہ کرتی کہ یہ تین برس میں نے اسے تلاش کرتے ہوئے گزارے تھے۔ راہ چلتے، ڈرائیونگ کرتے، کسی دکان میں آتے جاتے، چہروں کی بھیڑ میں، انسانوں کے ہجوم میں میری نظریں اس کی تلاش میں بھٹکتی رہتیں۔ مگر بڑے شہروں کا مزاج کچھ عجیب ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تو برسوں کے بچھڑے ہوئے لوگ اچانک ہی یوں سرِ راہ مل جاتے ہیں کہ آپ مبہوت رہ جائیں اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بھیڑ میں آپ کا ہاتھ کسی کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تو پھر برسوں اس کی صورت دکھائی نہیں دیتی۔

اس دوران میں نے اپنے وقت کا بہتر مصرف تلاش کرتے ہوئے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ ہماری کلاسیں اولڈ کیمپس میں ہوتی تھیں لیکن ہوسٹل میں رہنے والے چند لڑکے میرے دوست بن گئے تھے اس لیے شام کو میں نیو کیمپس چلا جاتا۔ یونیورسٹی، ہوسٹلز کی بکھری بکھری سی عمارت کے قریب سُبک خرامی سے بہتی نہر کے کنارے دو رویہ کھڑے درختوں کے درمیان دھیرے دھیرے کار چلانا مجھے بہت بھلا لگتا۔

میں اپنے اُلجھے اُلجھے سے خیالوں کی ڈوریں بندھا آگے بڑھتا چلا جاتا۔ پھر شیشے کی دیواروں والی کینٹین میں داخل ہو کر کسی لوہے کی کرسی پر بیٹھ جاتا۔ اگر دوست لڑکے اور ان کی کلاس فیلوز موجود ہوتیں تو فوراً پُرجوش گفتگو شروع ہو جاتی ورنہ میں ان کے انتظار میں آہنی میز کی ٹھنڈی سطح پر کہنیاں ٹکائے خوابوں سراب کی دنیا میں بھٹکنے لگتا۔

وہ بھی ایک ایسی ہی شام تھی۔ شیشے کی دیوار پر ہلکی ہلکی دھند چھا رہی تھی اور سامنے نہر کے کنارے کھڑے درخت ملگجے اندھیرے میں سایوں کی طرح لہرا رہے تھے۔ یونیورسٹی میں الیکشن کی آمد آمد تھی اور میرے سوا باقی سب لوگ گویا الیکشن ہی کے کاموں میں مصروف تھے۔ اس وقت بھی الیکشن میں کھڑے ہونے والے امیدواروں کے حامی باہر کنستر اور کتابیں پیٹ پیٹ کر انوکھے انوکھے نعرے لگا رہے تھے۔ لڑکیاں، لڑکے اندر کرسیوں پر بکھرے خورد و نوش میں مصروف تھے، اِدھر اُدھر آجا رہے تھے، جوش و خروش سے باتیں کر رہے تھے۔ فضا میں بڑی گہما گہمی تھی۔

میں نے شور سے اکتا کر ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کیں اور جیسے ہی میں نے دوبارہ آنکھیں کھولیں، میرا دل اچھل کر گویا حلق میں آگیا۔ نہایت آہستگی سے کینٹین کا دروازہ کھول کر سلطانہ اندر آرہی تھی۔ جیسے کوئی چپکے سے خواب نگر کا دروازہ کھول کر اندر قدم رکھ رہا ہو۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔

وہ بہت بدلی ہوئی نظر آرہی تھی۔ اس کی شخصیت میں نسوانیت کا پلڑا جھک گیا تھا اور یوں وہ پہلے سے زیادہ دلکش نظر آنے لگی تھی۔ اس کے بال اب بوائے کٹ نہیں تھے گو کہ اب بھی تراشیدہ ہی تھے مگر کندھوں تک جھکے ہوئے تھے اور اتنی نفاست سے برش کیے گئے تھے کہ گھنیرے ہونے کے باوجود ایک ایک بال علیحدہ نظر آرہا تھا۔ وہ نیوی بلیو شلوار قمیص اور بلوچی واسکٹ میں تھی۔ اس کی شخصیت کی مقناطیسیت کو شاید صرف میں ہی محسوس نہیں کر رہا تھا بلکہ فرفر باتیں کرتے ہوئے لڑکے لڑکیاں بھی ایک لمحے کے لیے مبہوت سی ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی تھیں۔

خالی میز کی تلاش میں بھٹکتی ہوئی اس کی نظریں بالآخر میری میز پر ٹھہر گئیں اور جب اس نے مجھے دیکھا تو ایک لمحے کے لیے اس کی بھی رنگت متغیّر ہو گئی۔ اس ایک لمحے میں وہ گویا گم صُم سی کھڑی رہی پھر دھیرے دھیرے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ طلوع ہوئی۔ بالآخر لاابالی سے انداز میں قدم اُٹھاتی وہ میری ہی میز کی طرف بڑھی۔ میں سحر زدہ سے انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اب مکمل سلطانہ نظر آرہی تھی مگر وہ جو کہیں کہیں سلطان

ایک مخیّر سرمایہ دار نے مقامی پاگل خانے کی انتظامیہ کو اتنی رقم دی جتنے میں پاگلوں کے لیے ایک بڑا سا تالاب تیار کیا جاسکے۔ اس کی خواہش تھی کہ پاگل خانے کے ذہنی مریض پیراکی اور مچھلی کے شکار کا حقیقی لطف اٹھائیں۔

تالاب کی تعمیر کے چند ماہ بعد اس نے ایک ڈاکٹر سے پوچھا۔ "مریضوں نے تالاب کو پسند کیا؟"

"بے حد پسند کیا جنابِ عالی۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "کچھ تو کئی کئی گھنٹے نہاتے رہتے ہیں، کچھ تیرتے رہتے ہیں اور کچھ دن بھر ڈور ڈالے بیٹھے رہتے ہیں۔ ان کی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے انتظامیہ سنجیدگی سے غور کر رہی ہے کہ تالاب میں چند گھڑے پانی اور دو چار مچھلیاں بھی ڈلوا دی جائیں۔"

کے مِٹے مِٹے سے نقوش اب بھی اس کی شخصیت میں مدغم تھے، انھوں نے اسے بالکل منفرد بنا رکھا تھا۔

ہتھیار پھینکنے کے سے انداز میں اس نے اپنا شولڈر بیگ میز پر رکھا اور تھکے تھکے انداز میں بیٹھ گئی۔

"اگر یونیورسٹی میں الیکشن کے دوران اتنا شور شرابا نہ ہوا کرے تو کیا ہرج ہے؟" اس نے دونوں ہاتھ رگڑتے ہوئے جواب طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اس نے یوں بات شروع کر دی تھی جیسے ہم بہت دیر سے یہیں بیٹھے باتیں کر رہے تھے اور وہ چند لمحوں کے لیے اُٹھ کر کہیں چلی گئی تھی۔

"ہرج تو کوئی نہیں" میں نے بھی اسی کی طرح ہموار اور پُرسکون لہجے میں کہا "لیکن یہ جو نوجوانوں کے اندر جوش و خروش ہے، توانائی ہے اسے ذریعۂ اظہار اور ذریعۂ اخراج نہیں ملے گا تو ان میں فرسٹریشن پیدا ہو گی۔"

"فرسٹریشن تو ان میں اب بھی ہے" وہ مُنہ بنا کر بولی "یہ جو لڑکے راہ چلتی لڑکیوں پر آوازے کستے ہیں، سینما ہال میں نعرے لگاتے ہیں، بڑکیں مارتے ہیں، جلوس نکالتے ہیں، بس میں سفر کرتے ہیں تو دوسروں کا سفر کرنا دوبھر کر دیتے ہیں، یہ سب فرسٹریشن ہی کی تو نشانیاں ہیں۔"

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا اُسے گویا کچھ یاد آگیا۔ جوشیلے سے لہجے میں بولی "اب دیکھو... کیسی عجیب بات ہے — زرین شاہجہاں ہے نا؟ وہی جو وائس پریزیڈنٹ کی سیٹ کے لیے کھڑی ہو رہی ہے، وہ میری دوست ہے۔ بے چاری نے کنویسنگ کے لیے اپنی دو مرسڈیز کاریں پینٹ کرا دیں اور ان پر اپنے اشتہار لکھوا دیے۔ انٹر کان میں دو سو لڑکوں کو ٹریٹ دی۔ ہزاروں کا بل بنا اور جب وہ ووٹ کی بات کرنے لڑکوں کے پاس گئی تو انھوں نے ایسی فرمائشیں کیں جو ایک انتہائی فرسٹریٹڈ نسل ہی کر سکتی ہے۔"

"ہاں" میں نے گہری سانس لے کر کرسی کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا "فرسٹریشن ہی انسان کو سلطانہ سے سلطان بنا دیتی ہے..." پھر میں نیم وا آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا "لیکن یہ دوبارہ سلطان سے سلطانہ بننے کی کہانی کیا ہے؟ کیونکر آگیا یہ انقلاب؟"

"بس... آگیا" اس نے مبہم سے لہجے میں کہا اور نظر جھکا کر اپنے ناخن کریدتے ہوئے بولی "تم نے ٹھیک کہا تھا۔ انسان اپنے اصل کو دفن کر کے زندگی نہیں گزار سکتا۔"

"شکر ہے..." میں نے طمانیت سے کہا "کسی طرح بھی سہی لیکن تمھیں میری بات کا اعتبار تو آیا۔ یہ بتاؤ تم یونیورسٹی میں کر کیا رہی ہو؟"

"میں انگلش میں ایم اے کر رہی ہوں" اس نے بتایا۔

"اور تم؟"

"میں پولیٹیکل سائنس میں کر رہا ہوں۔ لیکن میرا کوئی خاص مقصد نہیں ہے۔ بس یونہی... یونیورسٹی کے ماحول میں میرا بہت دل لگتا ہے" میں نے کہا "یہ بتاؤ کہ تم نے وہ سلطان والے سارے دھندے سارے مشاغل، سارے چکر چھوڑ دیے یا نہیں؟"

"سب کچھ چھوڑ دیا۔ میں اب بالکل صحیح قسم کی لڑکی ہوں" اس کے لہجے میں ہلکا سا فخر جھلک آیا۔

"رہ کہاں رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ایک نمبر گرلز ہوسٹل میں" اس نے بتایا۔ اس دوران ہم چائے وغیرہ پی رہے تھے۔ وہ اپنی فائل سے پنکھا جھلتے ہوئے....

"بولی "یہاں کچھ حبس ہو رہا ہے آؤ باہر چلیں۔"

ہم باہر آئے اور لان پر ٹہلتے ہوئے غیر ارادی طور پر سڑک کی طرف چل دیے۔ وہ خنک ہوا میں گہری گہری سانسیں لینے کے بعد بولی "شغلاً پڑھنے کے علاوہ تم کیا کر رہے ہو؟"

"میں تمھارا انتظار کر رہا ہوں" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"ابھی تک؟" میری طرف دیکھتے ہوئے اس کی آنکھیں پھیل گئیں "تم مایوس نہیں ہوئے؟"

"میں اتنی جلدی مایوس ہونے والوں میں سے نہیں ہوں۔ اور پھر انتظار کی طوالت کا انحصار اس پر بھی تو ہوتا ہے نا کہ انتظار کس کا کیا جا رہا ہے۔ لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، سوہنی مہینوال وغیرہ نے عشق کی مثالیں چھوڑی ہیں۔ میں انتظار کی ایک مثال چھوڑ کر جانا چاہتا ہوں" میں نے جواب دیا۔

وہ ایک لمحے کو چپ سی ہو گئی پھر بہت دھیمی آواز میں بولی "تم میرا انتظار چھوڑ دو۔ زندگی کے سنہرے برس ضائع مت کرو۔"

"جو تمھارے انتظار میں گزریں گے ان برسوں کو رائیگاں مت کہو" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "ویسے بائی دا وے تم مجھے یہ مشورہ کیوں دے رہی ہو؟"

"بس یونہی..." وہ جیسے کچھ کہتے کہتے رہ گئی پھر غالباً موضوع بدلنے کے لیے بولی "آج میرا ڈرائیونگ کرنے کا زبردست جی چاہ رہا ہے۔ لیکن افسوس میرے پاس آج کل گاڑی تو کیا سائیکل تک نہیں ہے۔"

میں نے خاموشی سے چابیاں اس کی طرف بڑھا دیں اور روش کی طرف اشارہ کیا جہاں میری مرسڈیز کھڑی تھی۔ اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور میں اس کے برابر بیٹھ گیا۔ گاڑی یوں دھول اڑاتی، اُچھل کر پختہ سڑک پر آئی کہ مجھے سنبھل کر بیٹھنا پڑا۔ پھر وہ طوفانی رفتار سے نہر کے کنارے فرّاٹے بھرنے لگی۔

ہم گویا چشم زدن میں اپر مال پر جا پہنچے جہاں سے واپسی کے لیے اس نے گاڑی دو پہیوں پر ٹرن کی۔ میں بظاہر پُرسکون بیٹھا تھا لیکن سوچ رہا تھا کہ اگر آج ہم زندہ سلامت ہوسٹل واپس پہنچ گئے تو یہ ایک معجزہ ہی ہو گا۔ ایف سی کالج، مسلم ٹاؤن وغیرہ سے نہر کے کنارے کنارے آندھی اور طوفان کی طرح گزرتے ہوئے ہم ہوسٹلوں کے قریب واپس آ پہنچے۔ پُل کے قریب نشیب میں اس نے گاڑی روکی اور ہم پُل پر آ کھڑے ہوئے۔ نیچے مٹیالے اندھیرے میں پانی سُبک خرامی سے بہہ رہا تھا۔

میں نے اطمینان کی گہری سانس لے کر کہا "لوگ خوف زدہ سے انداز میں دل تھامے سوچ رہے ہوں گے کہ یہ کیا بگولا سا تھا جو اُن کے قریب سے گزر گیا۔"

"مجھے اس طرح لوگوں کو شاک کر کے مزہ آتا ہے۔" اس کی خوشی میں عجیب سی معصومیت تھی۔

"اس کا مطلب ہے ابھی تمھارے اندر سلطان کی روح کے کچھ بچے کھچے ٹکڑے باقی ہیں۔" میں نے یونہی سرسری سے لہجے میں کہا۔

"نہیں تو" اس کے لہجے میں خوف جھلک آیا "سلطان کو تو میں نے مکمل طور پر فنا کر دیا ہے۔ اس کی روح سمیت۔"

"روح کبھی فنا نہیں ہوتی" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ پُرخیال سے انداز میں چند لمحے کچھ سوچتی رہی پھر چونک کر گھڑی دیکھتے ہوئے بولی "میں اب چلتی ہوں۔ دیر ہو جائے تو چوکیدار بہت بحث مباحثہ کرتا ہے۔"

پُل عبور کر کے وہ پیدل ہی اپنے ہوسٹل کی طرف چل دی اور میں وہیں بے حس و حرکت کھڑا اسے جاتے دیکھتا رہا۔

دوسرے دن وہ مجھے اولڈ کیمپس میں ملی۔ پیریڈ ختم ہو چکے تھے۔ میں نے اس سے کہا "تم آج دوپہر کا کھانا میرے ساتھ گھر پر کیوں نہیں کھاتیں؟"

اس نے ایک لمحے کچھ سوچا پھر سر جھٹک کر بولی "ٹھیک ہے۔ چلو۔ چلتے ہیں۔"

گلبرگ پہنچ کر وہ جب میرے گھر کے کشادہ ڈرائیو وے میں گاڑی سے اتری تو اس لمبی چوڑی کوٹھی کو دیکھ کر ذرا بھی مرعوب نہیں ہوئی۔ ایک نظر اِدھر اُدھر دیکھ کر اطمینان سے کھٹ کھٹ کرتی ہوئی ماربل کی سیڑھیاں چڑھنے لگی گویا اپنے ہی گھر میں داخل ہو رہی ہو۔

وہ ہر کمرے میں گھومی۔ ہر کمرہ ویران تھا۔ فرنیچر پر گرد کی ہلکی سی تہ نظر آ رہی تھی۔ وہ ہال میں آتے ہوئے بولی "اتنے بڑے گھر میں تم اکیلے رہتے ہو؟" اس کے لہجے میں ہلکی سی حیرت تھی۔

"نہیں۔ تین نوکر بھی ہیں" میں نے جواب دیا "لیکن انھیں معلوم ہے کہ میں ان کی ضرورت کم ہی محسوس کرتا ہوں اس لیے کسی نہ کسی بہانے اکثر ہی غائب رہتے ہیں۔ تاہم شکر کرو کہ کک موجود ہے اور اس نے کھانا بھی تیار کر رکھا ہے۔"

اس دوران اس نے میرے کمرے میں موجود دیوار گیر بار کا دروازہ کھول لیا تھا اور شیلفوں میں سجی ہوئی بوتلوں کو قدرے تعجب سے دیکھنے لگی تھی۔

"تم پیتے ہو" بالآخر وہ آہستگی سے بولی۔ میں اندازہ نہ کر سکا کہ یہ جملہ سوالیہ تھا یا محض اس کی خود کلامی کا ایک حصّہ۔ میں خاموش رہا۔

"مت پیا کرو" اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا "یہ بزدلی کی علامت ہے۔"

"یہ بہت گھسا پٹا جملہ ہے" میں نے کہا "ویسے تمھاری تسلی کے لیے بتا دوں کہ میں عادی پینے والا نہیں ہوں۔ بعض اوقات بہت ڈپریشن کے عالم میں پی لیتا ہوں اور کبھی مہینوں تک بوتل کو ہاتھ بھی نہیں لگاتا۔ شاید میں ادھورا ہوں۔ جس دن مکمل ہو گیا اس دن پینا چھوڑ دوں گا۔"

"اس دنیا میں سب ادھورے ہیں۔ تم کبھی مکمل نہیں ہو گے یہ صرف ایک خواب ہے۔ میں فلسفہ بولنا نہیں چاہتی۔ کتابیں فلسفے سے بھری پڑی ہیں۔ آپس میں باتیں کرنے کے لیے تو دوسرے موضوعات ہونے چاہئیں۔"

چنانچہ ہم نے دوسرے موضوعات پر باتیں شروع کر دیں۔ کھانا کھانے میں بہت لطف آیا۔ ایک مدت سے میں نے اتنے خوشگوار ماحول میں اپنے آپ کو اتنا مسرور محسوس کرتے ہوئے کھانا نہیں کھایا تھا۔ کھانے کے بعد بھی تھوڑی دیر گپ شپ ہوتی رہی۔ پھر وہ اُٹھتے ہوئے بولی "اب تم مجھے چھوڑ آؤ۔"

میں اسے لے کر ایک نمبر ہوسٹل پہنچا تو لان پر دو تین لڑکیاں اپنے ملاقاتیوں سے باتیں کر رہی تھیں۔

"بیٹھو۔ میں تمھیں اورنج جوس پلواتی ہوں" اس نے لان پر پڑی لوہے کی کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر وہاں کی چھوٹی سی کینٹین والے بابا کو آواز دے کر بولی "بابا! دو گلاس جوس بھجوائیے گا۔"

ہم دونوں جامن کے ایک پستہ قد پودے تلے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میں دوسری لڑکیوں اور ان کے ملاقاتیوں کو دیکھنے لگا۔ چند لمحے بعد میں نے کہا "بڑی عجیب سی بات ہے... میں نے پچاسوں لڑکوں کو یہاں لڑکیوں سے ملنے کے لیے آتے دیکھا ہے مگر کوئی لڑکا مجھے ایسا نظر نہیں آیا جو پیدل آتا ہو، جس کا لباس میلا اور شکن آلود ہو یا چہرے مُہرے اور حلیے سے بے حد

غریب نظر آتا ہو۔ میرا مطلب ہے کہ کیا کوئی لڑکی کسی غریب اور مفلوک الحال لڑکے سے ملنا پسند نہیں کرتی ؟"

"اتنی تعلیم حاصل کر کے اور اتنی خود مختارانہ زندگی گزار کر لڑکیوں میں کم از کم اتنا شعور تو آ ہی جاتا ہے کہ وہ زنانہ رسالوں کے افسانوں والے تصوراتی ماحول سے نکل آتی ہیں۔ انھیں مستقبل کے لیے سیکیورٹی درکار ہوتی ہے۔ تحفظ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کے پاس ناکام تجربوں کے لیے وقت نہیں ہوتا۔ اتنی موٹی سی بات تمھاری سمجھ میں نہیں آتی ؟" اس نے مسکراتے ہوئے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

یہ موٹی سی بات میری سمجھ میں تو آتی تھی لیکن میں اس کے مُنہ سے سننا چاہتا تھا اور ایک بے عنوان سا اطمینان محسوس کرنا چاہتا تھا۔ میرے پاس سیکیورٹی تھی۔ مجھ سے زیادہ تحفظ اسے کون دے سکتا تھا ؛ پھر وہ مجھ سے کیوں بھاگ رہی تھی ؟ بابا سے جوس کا گلاس لے کر میں چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرتا رہا اور ان سوالوں پر غور کرتا رہا لیکن کوئی جواب پائے بغیر واپس آ گیا۔

یونہی دن گزرتے رہے حتیٰ کہ سال کا آخری سیمسٹر بھی ختم ہو گیا۔ اس روز میں اس سے ملنے ہوسٹل پہنچا تو وہ اپنا سوٹ کیس لان پر رکھے بیٹھی تھی۔

"میں تمھارا ہی انتظار کر رہی تھی۔" وہ بولی۔

"مگر تم نے تو مجھے یہاں آنے کے لیے نہیں کہا تھا۔" میں نے گویا اسے یاد دلایا۔

"مجھے پھر بھی اُمید تھی کہ تم آؤ گے۔ میں گاؤں جا رہی ہوں۔"

"گاؤں ... ؟ کون سے گاؤں ؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ گو مجھے معلوم تھا کہ تمام ہی ہوسٹلرز اپنے گھروں کو جا رہے ہیں لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کا ہوسٹل کے سوا بھی کوئی ٹھکانا ہو گا۔ میں نے کبھی پوچھا بھی نہیں تھا۔

"کون سے گاؤں میں ٹھکانا بنا لیا تم نے ؟" میں نے اپنا سوال دُہرایا۔

"فرخ آباد ۔ شیخوپورہ کے قریب ہے۔" اس نے بتایا۔

"پھر تو زیادہ دور نہیں۔ چلو میں تمھیں گاڑی میں ہی چھوڑ آؤں، میں تمھارا گاؤں اور تمھارا گھر دیکھنا چاہتا ہوں ۔ کون کون رہتا ہے وہاں ؟"

اس کے چہرے پر پہلی مرتبہ میں نے اضطراب کی جھلک دیکھی۔ ورنہ میرے خیال میں تو اس کے اعصاب فولاد کے بنے ہوئے تھے۔ میں نے اسے کبھی کسی حال میں پریشان نہیں دیکھا تھا۔ ایک لمحے کے لیے کسی سوچ میں غلطاں رہ کر وہ گویا کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے امریکیوں کے سے انداز میں کندھے اُچکا کر بولی۔

"چل کر خود ہی دیکھ لینا۔"

تھوڑی دیر بعد گاڑی سڑک پر فراٹے بھر رہی تھی۔ اس کے ریشم سے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ میں کبھی کبھار کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھ لیتا۔ وہ میرے ساتھ بیٹھی ہوئی بہت جچتی تھی، بہت خوبصورت لگتی تھی حالانکہ وہ خوبصورتی کے مروّجہ پیمانوں پر کچھ زیادہ پوری نہیں اترتی تھی۔ میرا مطلب ہے کہ نہ اس کی رنگت گلاب کو شرماتی تھی اور نہ ہی اس کے لب پنکھڑی سے تھے۔

راوی کے پُل پر میں نے ٹول ٹیکس دینے کے لیے ایک لمحے کو گاڑی روکی تو ایک بھکارن نہ جانے کہاں سے نمودار ہو کر کار کی کھڑکی سے تقریباً لٹک ہی گئی۔

"بابو جی ! اللہ جوڑیاں سلامت رکھے۔" اس نے روایتی دعا دی۔

"یہ لوگ غالباً پُل صراط پر بھی پہنچ جائیں گے۔" میں نے کہا۔

"اور وہاں بھی یہی افسانوی دعا دیں گے۔" اس نے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ "میں نے کئی افسانوں میں اس قسم کی صورتِ حال پڑھی ہے کہ ہیرو اور ہیروئن سیر کو نکلے تو راستے میں ملنے والی کسی بھکارن نے انھیں میاں بیوی سمجھتے ہوئے یہی دُعا دی۔"

"چلو آج تجربہ بھی ہو گیا۔" میں نے بھکارن کے ہاتھ پر دس کا نوٹ رکھتے ہوئے کہا۔

"مگر مجھے صرف اس چیز سے الجھن ہوتی ہے کہ بھکاریوں کی دعائیں خلوص سے خالی ہوتی ہیں۔ ان کے لبوں پر دعائیں اس طرح گردش کرتی رہتی ہیں جیسے کسی نے ٹیپ ریکارڈر کا سوئچ آن کر دیا ہو۔" سلطانہ کے لہجے میں ناپسندیدگی تھی۔

"ہاں ۔ اس میں تو کوئی شک نہیں۔" میں نے اس کی تائید کی۔ "دعاؤں کی مشین ہوتے ہیں یہ لوگ ۔ اِدھر سِکّہ ڈالو، اُدھر ریڈی میڈ دعائیں برآمد۔"

کار اب لاہور شیخوپورہ روڈ پر فراٹے بھر رہی تھی۔ سڑک ناہموار تھی مگر دیوپیکر کار میں ہمیں دھچکے نہیں لگ رہے تھے۔ سلطانہ اب بالکل خاموش تھی اور سامنے سڑک کی سُرمئی پٹی پر نظر جمائے بیٹھی تھی۔

میں تصوّر ہی تصوّر میں اس کے گھر جا پہنچا۔ اس کے بابا نے بڑی گرمجوشی سے میرا استقبال کیا اور رات کو کھانے کی میز پر دیر تک میرے بارے میں، میرے مستقبل کے ارادوں کے بارے میں پوچھتے رہے۔ ساتھ ساتھ وہ اپنی بیٹی کی ذہانت اور خوش اخلاقی کے بارے میں بتلاتے رہے۔ پھر انھوں نے وعدہ کیا کہ بہت جلد وہ مجھ سے ملنے شہر آئیں گے۔ باتوں باتوں

میں انھوں نے یہ بھی بتا دیا کہ فائنل ایئر کا رزلٹ آتے ہی وہ اپنی بیٹی کے ہاتھ پیلے کر دینا چاہتے ہیں . . . .

" ادھر مڑنا ہے " سلطانہ نے میرا بازو ہلاتے ہوئے کہا اور تب مجھے احساس ہوا کہ ہم شیخوپورہ کی حدود سے نکل آئے ہیں۔ میں نے کار کچی سڑک پر موڑ دی۔

چار چھ میل کے سفر کے بعد سلطانہ نے جس گھر کے سامنے کار رکوائی وہ خاصا معقول قسم کا ایک پختہ مکان تھا اور اس کی چار دیواری سے دو تین درختوں کی شاخیں باہر جھانک رہی تھیں جن پر نارنجی مالٹے لگے تھے۔ مکان کا دروازہ بالکل کوتاہ تھا۔ میں دہلیز پر ہی رک گیا۔

سلطانہ نے اندر داخل ہو کر مڑتے ہوئے کہا "آجاؤ۔ آجاؤ "

میں اندر پہنچا تو چارپائی پر سامنے وہی بوڑھا بیٹھا تھا جو سلطانہ کے ہوسٹل میں چھوٹی سی کینٹین چلاتا تھا۔ اس نے کھڑے ہو کر میرا استقبال کیا۔ میں اسے وہاں دیکھ کر متعجب تھا۔

سلطانہ نے سوٹ کیس چارپائی پر رکھتے ہوئے بڑے اطمینان سے کہا "یہ بابا ہیں . . . میرے والد صاحب "

"تم نے پہلے کبھی نہیں بتایا" میں اپنی حیرت کو پی گیا۔

" دنیاداری کی مصلحتوں نے اجازت نہیں دی تھی" سلطانہ سرد لہجے میں بولی " اور پھر بابا کی خود بھی یہی خواہش تھی کہ میں ہوسٹل میں ان کے ساتھ غیروں ہی کی طرح ملوں تاکہ دیگر لڑکیوں میں میری سبکی نہ ہو کیونکہ یونیورسٹی پہنچ کر بھی سوشل اسٹیٹس کے بارے میں لڑکیوں کے ذہن کشادہ نہیں ہوتے "

پھر وہ اندر ایک کمرے کی طرف بڑھی اور مجھے بھی ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ اندر کمزور سی روشنی کا ایک بلب چھت سے لٹک رہا تھا اور اس روشنی میں ایک معمولی مگر صاف ستھرے بستر پر ایک نوجوان لیٹا نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک دبلا پتلا نہایت پرکشش نوجوان تھا۔ مگر اس کی آنکھوں میں مصر کے اہراموں کا سا سونا پن اور چہرے پر تاج محل کی سی سفیدی تھی۔ زندگی سے عاری تھا اس کا چہرہ۔ وہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے ہوئے تھا۔ اس کے سینے تک لحاف تھا اور اس کی سونی آنکھیں دروازے پر ہی جمی تھیں۔

" شاہ زیب! میں آگئی ہوں " سلطانہ یہ کہتے ہوئے لپک کر بستر تک پہنچی اور والہانہ انداز میں اس نوجوان کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ پھر اس نے میری طرف مڑ کر کہا۔ "ان سے ملو خرم! یہ میرے شوہر شاہ زیب ہیں "

نوجوان کا ہاتھ مصافحے کے لیے میری طرف بڑھا۔ میں نے تنویمی سی حالت میں اسے تھام لیا۔ ہاتھ برف کی طرح سرد تھا یا پھر شاید میرے اندر ہی کہیں جذبوں کی چٹانوں پر برف باری ہو رہی تھی۔

" یہ خرم ملک ہیں . . " سلطانہ نے اپنے شوہر کو بتایا " یہ بھی پنجاب یونیورسٹی میں ہی پڑھتے ہیں۔ یہ ہمارے اس گاؤں کے ہیں جہاں میں بچپن میں رہتی تھی۔ بہت بڑے زمیندار کے بیٹے ہیں مگر زمینیں بیچ دی ہیں انھوں نے "

شاہ زیب کچھ نہ بولا۔

" یہ بیمار ہیں کیا؟" میرے حلق سے سرسراتی ہوئی سی آواز نکلی۔

" کافی دن پہلے ایک حادثے میں شاہ زیب کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ ورنہ پہلے یہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھے بلکہ کبڈی کے کھلاڑی بھی تھے " سلطانہ نے کہا اور یوں خاموش ہو گئی جیسے بس یہی کل داستان تھی۔ یہی آغاز تھا یہی انجام۔ یہی تفصیل تھی، یہی اختصار۔ میں بھی مزید کچھ نہ پوچھ سکا۔

نوجوان کی آنکھوں کا سونا پن کچھ بڑھ گیا تھا اور وہ انھی ساکت آنکھوں سے مجھے پلکیں جھپکائے بغیر دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اجنتا اور الورا کے غاروں کی طرح تھیں جن میں شکوک و شبہات کی پرچھائیاں کھڑی مجھے گھور رہی تھیں۔

" بیٹھ جائیے " نوجوان کے سفید ہاتھ نے جنبش کی۔

" بس . . شکریہ۔ میں چلتا ہوں۔ میں صرف سلطانہ کو چھوڑنے آیا تھا " میرے دل کے قبرستان سے آواز ابھری اور میں دروازے کی طرف مڑ گیا۔ سلطانہ مجھے چھوڑنے باہر تک آئی۔ کار کچے میں ایک درخت تلے کھڑی تھی۔ سلطانہ درخت سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا چہرہ پتھرایا ہوا سا لگ رہا تھا۔

" یہ تم نے کیا کیا سلطانہ؟" میری آواز ان آنسوؤں کے انبار تلے دبی ہوئی تھی جو بہہ نہیں پا رہے تھے۔

" میں نے . . . ؟ کوئی ایسا غلط کام تو نہیں کیا میں نے۔ شادی ہی تو کی تھی " وہ بڑی سادگی سے بولی " شاہ زیب بالکل ٹھیک تھا اس وقت۔ صحتمند اور خوبصورت۔ معمولی سی زمین بھی تھی اس کی۔ اتنی کہ جس سے گزر بسر سفید پوشی سے ہو جاتی تھی۔ وہ زمین اب بک چکی ہے۔ اس کے علاج پر لگ چکی ہے . . "

اسی سادگی آمیز بے چارگی سے ہاتھ پھیلاتے ہوئے وہ بولی " اب کیا کریں . . . حادثہ ہو گیا . . . حادثوں پر تو کسی کا زور نہیں چلتا نا "

" ہاں ۔ حادثوں پر کسی کا زور نہیں چلتا۔ اور جذبوں پر بھی " میں نے سرگوشی میں کہا اور کئی لمحے تک ایک ٹک اسے دیکھتا رہا۔ وہ سر جھکائے، پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدتی رہی۔

بالآخر میں اسے خدا حافظ کہہ کر کار میں بیٹھا اور نہایت کم رفتار کے ساتھ واپس روانہ ہو گیا۔ میرے ہاتھ پیروں پر ایک خفیف سی کپکپاہٹ طاری تھی۔ جیسے میں نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہو۔ پھر رفتہ رفتہ یہ کپکپاہٹ ختم ہو گئی اور میرے اندر ایک عجیب سی یخ بستگی اور سناٹا چھا گیا۔ میرے ہونٹوں سے کوئی آہ تک نہ نکلی۔ میں بس سوچتا رہا . . . سوچتا رہا۔ اور جب میں اپنے گھر کے ڈرائیو وے میں داخل ہوا تو مجھے بجا طور پر حیرت ہوئی کہ راستے میں میرا ایکسیڈنٹ کیوں نہیں ہوا۔

ساری رات مجھے نیند نہیں آئی اور دوسرے دن میں بغیر کچھ کھائے پیے نیو کیمپس کے ویران ہوسٹلوں کے قریب نہر کے کنارے جا بیٹھا اور گھاس کی پتیاں توڑ توڑ کر نہر میں پھینکتا رہا۔ میں شاید غمزدہ بھی نہیں تھا۔ میرا مطلب ہے، اس طرح غمزدہ نہیں تھا جس طرح لوگ ہوتے ہیں، روتے ہیں، دل ہی دل میں ساری دنیا کو برا بھلا کہتے ہیں۔ میرے اندر تو بس ایک ہولناک سناٹا چھا گیا تھا جس سے مجھے خوف آ رہا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ نہ تو مجھے دل کا دورہ پڑا اور نہ ہی میں رویا۔ نہ میں نے پی اور نہ ہی مجھے سلطانہ پر غصہ آیا۔ شاید میرے احساسات سو گئے تھے یا پھر میری روح منجمد ہو گئی تھی۔

چھٹیاں ختم ہونے پر ہوسٹلز آباد ہو گئے۔ بابا بھی اپنی کینٹین پر آ گئے اور سلطانہ سے بھی ملاقات ہونے لگی۔ ہم اسی طرح ملے جس طرح پہلے ملتے تھے۔ میں نے کسی شکستگی کا اظہار نہیں کیا اور نہ ہی اس نے کچھ پوچھا یا بتایا۔ ہم حسب معمول باتیں کرتے اور کبھی کبھی باتیں کرتے کرتے اچانک یوں خاموش ہو جاتے جیسے ہمارے درمیان کوئی اجنبی آن کھڑا ہوا ہو۔

میرے دل کے سناٹے میں کوئی زور زور سے چیخیں مارنے لگتا اور اس کا چہرہ بھی پتھرا جاتا مگر ہم میں سے کوئی اس تبدیلی کے بارے میں کچھ نہ کہتا۔ وہ پتھر کی عورت تھی اور میں موم کا مجسمہ۔ میں اس طرح کی باتیں کرتا جیسی وہ پسند کرتی، اس طرح رہتا جس طرح وہ مجھے دیکھنا پسند کرتی۔ ایک عرصے تک میں نے اس کے شوہر کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔ اس نے بھی اپنے چہرے کے پتھریلے پن کے بارے میں ایک لفظ نہ کہا۔ میں نے بھی اپنے محسوسات کو بدستور بے زبان ہی رہنے دیا۔ اس نے بھی دل کا کوئی بھید کھلنے نہ دیا۔

ایک بار میں نے اس سے صرف اتنا پوچھا "تم نے کیا سوچ کر شاہ زیب سے شادی کی تھی؟"

" میں کوئی بھی کام زیادہ غور و خوض کر کے نہیں کرتی " اس نے پرسکون لہجے میں جواب دیا " یہی کیا کم تھا کہ اسے مجھ سے اور مجھے اس سے محبت ہو گئی تھی۔ اسی نے درحقیقت مجھے سلطان سے دوبارہ سلطانہ بنایا تھا اور پھر وہ تھا بھی میری ہی کلاس کا آدمی۔ وہ اتنا زیادہ دولتمند نہیں تھا کہ میں اس سے خوف محسوس کرتی کہ اس کے گھر میں کسی دن میری حیثیت کھلونے کی سی ہو جائے گی "

معلوم نہیں کیوں اس نے کچھ اندیشے خود ہی گھڑ کر کیوں دل میں بٹھا رکھے تھے؟ بہرحال اب بات کرنے کا، بحث کرنے کا فائدہ بھی کیا تھا؟ کارواں بہت آگے نکل چکا تھا۔ اب تو صدائے جرس بھی نہیں رہی تھی۔

ایک روز ہم گلبرگ کے ایک چائنیز ریستوران سے کھانا کھا کر نکلے۔ کیمپس پہنچ کر اس نے ہوسٹل سے ذرا دور ہی گاڑی رکوا کر اچانک کہا "جمی، مجھے چار لاکھ روپیہ چاہیے"۔

میں نے اس سے ایک لفظ بھی نہ کہا کہ کیوں چاہیے۔ شاید مجھ میں کچھ پوچھنے کی حس ختم ہو گئی تھی یا شاید میں انسانی صفتیں کھو چکا تھا اور ویسے ہی میں اس کا مقروض بھی تو تھا۔ اس کا قرض تو شاید میں زندگی بھر بھی نہیں اتار سکتا تھا۔

میں نے خاموشی سے سیٹوں کے درمیان پڑا ہوا بریف کیس اٹھایا، چیک بک نکالی اور اسے چار لاکھ کا چیک لکھ دیا۔ چیک لے کر اس نے اپنے پرس میں رکھ لیا۔

کار کی کھڑکی سے الیکٹرک پول پر لگے ہوئے مرکری بلب کی دودھیا روشنی ترچھے رخ سے اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی ایک لمحے کے لیے جھلملائی تھی۔ یہ نمی میں نے پہلی اور آخری مرتبہ اس کی آنکھوں میں دیکھی تھی۔

اس سے اگلے روز وہ نہ جانے کہاں چلی گئی۔ کئی دن تک وہ مجھے نظر نہ آئی۔ رزلٹ بھی کب کا آ چکا تھا۔ بابا سے

بھی میں نے کچھ نہ پوچھا۔ میں نے بتایا ناکہ مجھ میں شاید پوچھنے کی صلاحیت ہی ختم ہو چکی تھی۔ میں کچھ بھی پوچھنا نہیں چاہتا تھا۔ مبادا کسی سوال کے پردے سے کوئی بھیانک حقیقت سانپ کی طرح پھن پھیلائے مجھ پر جھپٹ پڑے۔ ناآگہی میں پھر بھی کچھ نہ کچھ سکھ تھا۔

بابا عجیب شکستہ اور مضمحل انداز میں سر جھکائے کینٹین میں اپنے کام میں مصروف رہتا۔ نہ وہ میری طرف دیکھتا اور نہ ہی میں اس کی نظر میں آنے کی کوشش کرتا۔

میں سلطانہ کے بارے میں سوچا کرتا۔ وہ کہاں گئی؟ مجھے بتائے بغیر۔ پھر میں نے سوچا کہ وہ کیوں مجھے بتا کر جاتی؟ کیا لگتا تھا میں اس کا؟ کیا حق تھا اس پر میرا؟ میں روز اس سے ملنے کی آس لے کر ہوسٹل جاتا اور مایوس واپس آتا۔

ایک روز بابا نے خود اشارے سے مجھے بلایا۔ ان کی آنکھیں سرخ اور متورم تھیں جیسے وہ ساری رات روتے رہے ہوں۔ انھوں نے ایک دبیز سا لفافہ میری طرف بڑھا دیا۔ "سلطانہ نے یہ تمھارے لیے دیا تھا"۔

"مگر سلطانہ ہے کہاں؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

بابا نے مجروح سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ جیسے میں نے ان کا کوئی خوابیدہ زخم چھیڑ دیا ہو پھر لرزتی سی آواز میں بولے۔ "معلوم نہیں وہ کہاں چلی گئی ہے"۔ انھوں نے شاید آنسو ضبط کرنے کے لیے منہ پھیر لیا اور اسی عالم میں بولے "شاہ زیب کو یقین تھا کہ وہ تمھارے ساتھ گئی ہوگی۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تمھارے خلاف تھانے میں رپٹ درج کراؤں لیکن میں نے اسے سمجھایا۔ مجھے معلوم ہے، وہ تمھارے ساتھ نہیں گئی۔ وہ کسی کے ساتھ بھی نہیں جا سکتی۔ وہ میری بیٹی ہے۔ اسے میں ہی سمجھ سکتا ہوں"۔ ان کی آواز رُندھ گئی اور وہ کینٹین کے پچھلے حصے میں چلے گئے۔

میں لفافہ لے کر باہر گاڑی میں آ بیٹھا اور اسے چاک کیا۔ کئی صفحات پر مشتمل ایک خط برآمد ہوا جس کے ایک کونے پر میرا دیا ہوا چار لاکھ کا چیک بھی جوں کا توں پن کے ذریعے منسلک تھا۔ میں نے چیک علیحدہ کیا اور خط پڑھنے لگا۔

خرّم! میرے درد آشنا!

تم ایک ایسے مرد ہو جیسے آج کے دور میں لوگوں کو صرف خوابوں میں مل سکتے ہیں۔ مجھے آج بھی یقین نہیں آتا کہ میں تم سے اسی نامہرباں، بے رحم اور وفا ناآشنا دنیا میں ملی تھی۔

خرّم! تم نے میرے شوہر شاہ زیب کو دیکھا ہی ہے نا۔ وہ میری زندگی کا پہلا اور شاید آخری مرد ہے جسے میں نے اپنے دل کے اس قدر قریب محسوس کیا تھا۔ اس سے اتنی محبت کی جتنی کوئی بھی کسی سے کر سکتا ہے لیکن اس سے زیادہ محبت نہیں کر سکتا۔ اس کی خاطر میں نے زندگی تج دی۔ میرے پاس خواب بھی زیادہ نہیں تھے۔ جو تھوڑے بہت خواب تھے ان سب کا محور و مرکز شاہ زیب تھا۔

جب شاہ زیب کو حادثہ پیش آیا تو میں نے ان خوابوں کو بھی بالائے طاق رکھ دیا اور ایک بار پھر اپنے حوصلے کو مجتمع کر کے تعلیم کے میدان میں نکل آئی کہ پڑھ لکھ کر کوئی اچھی ملازمت کر سکوں یا بیرونِ ملک جا سکوں اور اس طرح میرے پاس چار پیسے جمع ہو سکیں کیونکہ یہاں کے سرجنوں نے بتایا تھا کہ شاہ زیب کا آپریشن امریکا میں ممکن ہے جس کے بعد وہ ٹھیک ہو جائے گا۔

دو سال سے میں گِھسٹ گِھسٹ کر اس منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ تعلیم کے دوران بھی میں امریکا میں شاہ زیب کا علاج کرانے کے لیے ایک ایک پیسہ جمع کرتی رہی۔ بابا جو کچھ بھی کماتے، میں اسے حتی الامکان کنجوسی سے خرچ کرتی۔ میں نے چند بسکٹ کھا کر اور پانی پی کر دو دو دن گزارے ہیں۔ میں نے سہاگن ہو کر بھی دو سال ۔۔ دو صدیوں سے بھی زیادہ طویل سال۔ کانٹوں پر لوٹتے اور بیواؤں کی طرح گزارے ہیں۔ میں نے اپنی طرف بڑھتا ہوا ہر ہاتھ نفرت سے جھٹکا ہے خواہ وہ کتنا ہی توانا تھا یا کتنا ہی پُرکشش۔

یہ سب کچھ میں شاہ زیب کے لیے کر رہی تھی جس سے میں نے ۔۔ ایک عورت نے محبت کی تھی۔ وہ صحرا کی طرح بکھر گیا تھا اور میں اس کا ریزہ ریزہ جمع کر رہی تھی لیکن شاہ زیب کی معذوری کو جتنا عرصہ گزرتا جا رہا تھا اس کے اندر سے میرا محبوب مٹتا جا رہا تھا۔ بلکہ شاید اس کے اندر کا انسان بھی دم توڑنے لگا تھا۔

اس کے دل میں نہ جانے کب سے اندیشوں کے سانپ پرورش پا رہے تھے کہ میں اس کی معذوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے باہر نہ جانے کیا کچھ کرتی پھر رہی ہوں۔ مجھے ان سانپوں کی بھنک تک نہیں تھا کیونکہ یہ کبھی اس کے دل سے رینگتے ہوئے زبان تک نہیں آئے تھے اور میں اپنی دُھن میں مگن، اپنے متعین کردہ راستے پر ناک کی سیدھ میں چلی جا رہی تھی۔

البتہ میں یہ ضرور محسوس کرنے لگی تھی کہ اس کی معذوری کو جتنے زیادہ دن گزرتے جا رہے ہیں، وہ اندر ہی اندر گُھلتا جا رہا ہے۔ مجھے بے چینی سی رہنے لگی کہ وہ جتنی جلدی بستر سے اٹھ کھڑا ہو اتنا ہی اچھا ہے۔ وہ میرے شانہ بہ شانہ کھڑے ہو کر جتنی جلدی اس دنیا کو ازسرِنو دیکھ سکے اتنا ہی میرے حق میں بہتر ہے۔ یہی دنیا جہاں میں اس کی بقا کی جنگ لڑ رہی تھی، یہی دنیا جس سے اس کا رابطہ ٹوٹ گیا تھا۔

تم مجھے خوابوں کے آدمی لگے۔ وہ آدمی جن کے ہونٹوں پر تالے اور جن کے دل سمندر ہوتے ہیں۔ تمھارے پاس روپیہ بھی تھا۔ ایک رات اچانک ہی مجھے خیال آیا کہ بقا کی جس جنگ کے لیے میں تنکا تنکا کر کے اسباب جمع کر رہی ہوں اس کا فیصلہ تم چٹکی بجاتے ہی کر سکتے ہو۔ میں نے اپنی خودداری کے سارے بُت مسمار کر کے تم سے چار لاکھ کی بھیک مانگ لی۔ کچھ رقم میرے پاس پس انداز ہو چکی تھی۔ مجھ پر تمھاری اچھی رفاقتوں کا قرض ہی کافی تھا کہ میں نے تمھارا مالی قرض بھی سر چڑھا لیا کیونکہ میری تاب ختم ہو گئی تھی۔ میرے اندر کوئی غیبی طاقت سرگوشیاں کر رہی تھی کہ جتنی جلد ممکن ہو سکے، شاہ زیب کو اس کے قدموں پر کھڑا کر دو، کہیں یہ قدم غلط فہمیوں کے راستوں پر بہت آگے نہ نکل جائیں۔

میں نے بڑے مسرور لہجے میں اسے اطلاع دی "تمھارے علاج کا بندوبست ہو گیا ہے۔ میں نے ایک بہت اچھے انسان سے قرض لے لیا ہے"۔

"کون ہے وہ انسان؟" اس نے چیک کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ میں اتنی احمق تھی کہ اب بھی اس کے لہجے میں چھپا ہوا خنجر مجھے چونکا نہ سکا۔

"خرّم ملک"۔ میں نے جواب دیا۔

تب دو سال سے شاہ زیب کے دل میں پلتی ہوئی ساری کمینگی، ساری بداعتمادی، سارا بغض اور سارا تعفن منہ کے راستے اُبل آیا۔ وہ سب کچھ جو اس نے کہا، اتنا شرمناک ہے کہ میں لکھ نہیں سکتی۔ مبادا تمھاری نظریں اس سے آلودہ ہو جائیں۔ مجھے تمھاری داشتہ قرار دیتے ہوئے اس نے چیک اٹھا کر میرے منہ پر مار دیا۔ اس آدھے گھنٹے میں اس کا بولا ہوا ایک ایک لفظ میرے ذہن پر انگارے کی طرح پیوست رہے گا۔

میں نے اپنا دل پتھر کا بنا لیا تھا خرّم! جو بالآخر ٹوٹ گیا اور پتھر کا دل ٹوٹ کر کبھی نہیں جڑتا۔ میں اپنی محبت، وفا اور ایثار کی لاشوں پر قدم رکھتی ہوئی اس چار دیواری سے نکل آئی ہوں۔

شاہ زیب نے جو کچھ کیا، بالکل ٹھیک کیا۔ کیونکہ وہ انسان ہے۔ بالکل عام سا انسان لیکن میں اپنی روح پر سے یہ داغ کبھی نہیں مٹا سکتی کہ میں اتنے طویل عرصے تک ایک بالکل عام اور سطحی سے انسان کو دیوتا سمجھ کر اس کی پرستش کرتی رہی۔ محبت میں انسان اتنا بھی بے وقوف ہو جاتا ہے؟

خرّم! میرے خیال میں تو جب انسان کی محبت فنا ہو جائے تو اس کے لیے کوئی ٹھکانا نہیں رہتا۔ اس لیے اب میں ایسے سفر پر جا رہی ہوں جس میں کہیں کوئی پڑاؤ، کوئی منزل نہیں آتی۔ کوئی ساتھی نہیں ہوتا۔ بس تنہائی ہی اپنے زخموں کا مرہم ہوتی ہے۔ میں وہ بدنصیب ہوں جسے اس کی اپنی آستین سے محبت نے ڈس لیا۔ اب کوئی قیامت باقی نہیں جس کا مجھے انتظار ہو۔ تم سے بس اتنی سی درخواست ہے کہ مجھے ڈھونڈنا مت۔ میں اپنے آپ سے بھی منہ چھپا لینا چاہتی ہوں۔ فقط اک خوابِ گم گشتہ!

سلطانہ

میرا خیال تھا کہ یہ کہانی اپنے انجام کی تلاش میں بھٹکتی رہے گی مگر تین برس بعد اس نے ایک اور موڑ لیا۔

میں ان دنوں لندن میں تھا۔ ایم بی اے کرنے کے لیے آیا ہوا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ اس کے بعد پاکستان واپس جا کر کوئی کاروبار کر لوں گا۔

اس دن چند انگریز دوستوں کی فرمائش پر اردو فلم دیکھنے

جانا پڑا۔ فلم کے دوران مترجم کے فرائض انجام دیتے ہوئے میرے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ یہ آخری شو تھا جسے دیکھ کر ہم ہال سے نکلے تو بکنگ پر بیٹھنے والی لڑکیاں ٹیرس پر کھڑی اپنے کوٹ اور ٹوپیاں سنبھال رہی تھیں۔

ٹیرس کے جنگلے پر کافی دور ایک دراز قد لڑکی فرکا کوٹ پہنے قدرے ترچھی کھڑی تھی۔ اور اتنی تیزی سے سگریٹ پھونک رہی تھی جیسے اسے اندیشہ ہو کہ کوئی اس کے ہاتھ سے سگریٹ چھین لے گا۔ جنگلے سے ذرا ہی آگے برف کے ذروں کی سفید چادر زمین کی طرف گر رہی تھی۔ اس کے باوجود لڑکی ننگے سر تھی۔ اس کی ٹوپی جنگلے پر ٹنگی ہوئی تھی.... اور ان بالوں کو میں ہزاروں کے مجمع میں بھی پہچان سکتا تھا۔

"سلطانہ.... !" میں دوستوں کے حلقے سے نکل کر اندھوں کی طرح لڑکھڑاتا ہوا اس کی طرف لپکا۔ اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ اس کا جسم یکبارگی کپکپا گیا۔ یہ کپکپاہٹ میں نے اس کے دبیز کوٹ کے باوجود دیکھ لی۔ سیدھی کھڑی ہو کر اس نے ہیٹ سر پہ رکھ لیا۔

"سلطانہ.... !" میں اس سے آگے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ اسی ایک لفظ میں گویا سارے سوال تھے اور اسی ایک لفظ میں سارے جواب۔

اس کا ملیح چہرہ کچھ زرد ہو گیا تھا۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں اور جس ہاتھ سے وہ سگریٹ پی رہی تھی اس پر ابھری ہوئی نیلی نیلی رگیں مجھے نیم تاریکی میں بھی نظر آ رہی تھیں۔

"سلطانہ.... ! آؤ گھر چلیں۔" بالآخر میں نے بڑی مشکل سے کہا۔

"گھر.... ؟ کون سا گھر.... ؟ میرا کوئی گھر نہیں ہے۔" یہ کہتے ہوئے اسے کھانسی آ گئی۔ "بلکہ دنیا میں کسی بھی لڑکی کا کوئی گھر نہیں ہوتا۔"

"میرا گھر آج بھی سُونا ہے سلطانہ !" میں بولنے کی سکت محسوس نہیں کر رہا تھا۔

"تمہارا صرف گھر سُونا ہے۔ میری روح تک سُونی ہے خرم !" اس کی آواز باہر برستی برف سے بھی زیادہ سرد تھی۔

"میرا ہاتھ تھام لو سلطانہ ! یہ میرا اعتراف شکست ہے۔ میں تمہارے سوا کسی کو زندگی کا ساتھی نہیں بنا سکتا۔"

میری ٹانگوں میں گویا جان نہیں رہی تھی۔ میں باہر برستی برف کی طرح ریزہ ریزہ ہو کر بکھر رہا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اگر اس نے میرا ہاتھ نہ تھاما تو میں ریت کے گھروندے کی طرح گر پڑوں گا۔

"میں اب کسی مرد کا ہاتھ نہیں تھام سکتی۔" اس نے سرگوشی کے سے لہجے میں جواب دیا اور پھر وہ اتنی تیزی سے سیڑھیاں اُتر گئی کہ میں اس کے پیچھے اتنی تیزی سے نہ جا سکا۔

جب میں نیچے پہنچا تو لوگوں کے ہجوم میں اس کا کہیں پتا نہیں تھا۔

میں نے اسے تلاش کرنے کی بہت کوشش کی لیکن ایسا لگتا تھا کہ میں پولیس اور امیگریشن والوں کے تعاون سے اس کا سراغ لگاتا ہوا جہاں بھی پہنچتا ہوں وہ وہاں سے آگے روانہ ہو چکی ہوتی ہے۔ بڑا مشکل ہے اس سے ملنا جو آپ سے ملنا ہی نہ چاہتا ہو۔ میں نے اپنے دل کو سمجھانے کی کوشش کی۔

پھر میں نے ایم بی اے بھی کر لیا اور پاکستان واپس آ گیا۔ دو سال سے زیادہ عرصہ گزر گیا۔ اس دوران میں نے ایک چھوٹی سی انڈسٹری لگالی تھی جو ابھی رفتہ رفتہ سیٹ ہونے کے مراحل میں تھی۔

ایک روز میں ریگل کے قریب سروس روڈ پر اپنی گاڑی دوسری چند گاڑیوں کے ہجوم سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا کہ فضل دین کیمسٹ کے ہاں وہ مجھے کھڑی نظر آ گئی۔ جن لوگوں نے اسے پہلے دیکھا ہوا تھا ان میں سے میرے سوا شاید ہی اسے کوئی پہچان پاتا۔ حالاں کہ موسم زیادہ سرد نہیں تھا مگر اس نے لمبا سا اوورکوٹ پہن رکھا تھا۔ سر پر انگریز عورتوں کی طرح چھوٹا سا ہیٹ تھا۔ اور اس کا چہرہ.... ! خدا کی پناہ ! وہ کسی مردہ عورت کا چہرہ معلوم ہوتا تھا۔ کہتے ہیں کھنڈر دیکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ عمارت کبھی کتنی حسین اور پُرشکوہ تھی۔ مگر اس کھنڈر کو دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس عمارت کو دیکھ کر لوگ کبھی مبہوت ہو جایا کرتے تھے۔ وہ اتنا سوکھ چکی تھی کہ اوورکوٹ میں بھی اس کے کندھوں کی ہڈیاں نمایاں نظر آ رہی تھیں۔ سیلزمین اسے کچھ دوائیں لفافے میں ڈال کر دے رہا تھا اور وہ منہ پہ ہاتھ رکھ کر بار بار اپنی کھانسی روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں نے گاڑی دکان کی سیڑھیوں کے ساتھ لگا دی اور یوں دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا جیسے کوئی ڈرائیور اپنی مالکن کے انتظار میں کھڑا ہو۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر سیڑھیاں اُترنے لگی لیکن آخری سیڑھی پہ قدم رکھتے وقت اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھ لیا اور یکدم وہ گویا لڑکھڑا کر گرتے گرتے بچی۔ ساتھ ہی اسے زوردار کھانسی آئی۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا۔

سنبھلنے کے بعد وہ تھکے تھکے سے انداز میں مسکراتے ہوئے بولی "تم کیا زندگی کے ہر موڑ پہ مجھ سے ٹکراتے رہو گے؟"

"یہ میرے جذبے کی صداقت کا ایک ثبوت ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا "کوئی نہ کوئی چیز تو ہے جو مجھے کھینچ تان کر تمہارے سامنے لا کھڑا کرتی ہے۔"

"اور میں اب دوڑتے دوڑتے تھک گئی ہوں۔" اس نے یوں دھیمے لہجے میں کہا گویا کوئی شرمناک سا اعتراف کر رہی ہو۔ کھانسی اسے بار بار اٹھ رہی تھی۔

"شکر ہے تمہیں بھی احساس ہوا کہ انسان کبھی تھک بھی جاتا ہے۔" میں نے کہا۔

اس نے افسردہ سے انداز میں گردن ہلائی "اور زیادہ تیز دوڑنے والے تو بہت ہی جلدی تھک جاتے ہیں۔"

"آخر مجھ سے فرار حاصل کرنے کی تمہیں کیا ضرورت تھی؟" میں نے دکھ سے پوچھا۔

"جب احساس ہوا تھا کہ مجھے تمہارا ہاتھ تھام لینا چاہیے اس وقت دراصل اپنا آپ تمہارے قابل نظر نہیں آیا تھا۔" وہ پژمردہ سے لہجے میں بولی "اب یہ تو کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا نا کہ ایک ایماندار آدمی کو وہ پروڈکٹ دی جائے جسے گھٹیا انسان بھی ٹھکرا چکے ہوں۔"

"انسان اور پروڈکٹ میں بہت فرق ہوتا ہے۔" میں نے دھیمے لیکن قدرے غصے سے کہا "تم کبھی اپنے آپ کو صحیح خطوط پہ سوچنے کے قابل نہیں بنا سکیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ تمہاری بربادیوں کے نقطۂ آغاز پر میرے باپ کا نام لکھا ہے لیکن اس کے بعد سے اپنے آپ کو تم نے خود ہر طرح سے برباد کیا ہے۔"

"اب اتنی تاخیر سے فردِ جرم عائد کرنے کا کیا فائدہ؟" وہ افسردہ سے انداز میں مسکرائی پھر اس نے یوں اِدھر اُدھر دیکھا گویا اسے اندیشہ ہو کہ کوئی ہماری باتیں سُن رہا ہو گا۔ میں نے اسے گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بلا حیل و حجت بیٹھ گئی۔

"میرے گھر یا تمہارے گھر؟" میں نے پوچھا۔

"میں تو آج کل جہاں رہ رہی ہوں وہ کمرہ مکان مالکن نے اس شرط پہ مجھے دیا تھا کہ کوئی مرد ملاقاتی مجھ سے ملنے نہیں آئے گا۔" وہ تھکے تھکے انداز میں سیٹ پہ سر ٹکاتے ہوئے بولی۔

"بابا کہاں ہوتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ان کا انتقال ہو چکا ہے۔" اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"افسوس ہوا سُن کر۔ باقی باتیں میرے ہی گھر چل کر ہوں گی۔" میں نے کہا۔

"تمہاری بیوی بُرا نہیں منائے گی؟" اس نے سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

"ہوتی تو شاید بُرا مناتی۔" میں نے کہا۔

"تو کیا تم نے اب تک شادی نہیں کی؟" اس نے بُری طرح چونک کر میری طرف دیکھا اور اسے ایک بار پھر کھانسی آ گئی۔

"اس میں اتنی حیرت کی کیا بات ہے؟ بعض لوگ مجھ سے بھی کہیں بڑی عمر تک شادی نہیں کرتے۔ ویسے بھی میں نے کہا تھا نا کہ میں انتظار کی ایک مثال قائم کرنا چاہتا ہوں۔ میں اب بھی تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

"لیکن میں صرف موت کا انتظار کر رہی ہوں۔"

"ہم موت کی بھی منت خوشامد کر لیں گے۔" میں نے کہا۔
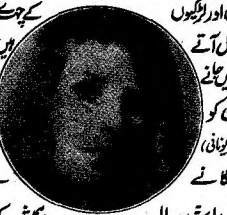
"کسی کو حاصل کرنے کے معاملے میں تم بہت ضدّی ہو۔" اس کی مسکراہٹ میں پہلی بار زندگی کی رمق دکھائی دی۔ "بنیادی طور پر زمیندار ہونا آخر۔ اور وہ بھی شہریار ملک کے بیٹے۔ ولدیت کا کچھ نہ کچھ اثر تو آنا ہی تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس کی ضد، جنجتی، دہاڑتی اور ہر رکاوٹ کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جانے والی تھی جب کہ تمھاری ضد ٹھنڈی، پُرسکون اور انتظار کرنے والی ہے۔"

"لندن سے واپس آنے کا فیصلہ کیوں کر لیا تھا تم نے؟" میں نے موضوع ذرا بدلتے ہوئے پوچھا۔

"میں بہت زیادہ بیمار ہو گئی تھی.... اور چوں کہ مجھے وہاں کی سٹیزن شپ نہیں ملی تھی اس لیے سوشل سیکیورٹی کے تحت میرا علاج نہیں ہو سکتا تھا۔ اور پرائیویٹ علاج میں افورڈ نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے میں واپس آ گئی۔ لوگ یہاں بھی ایک سے ایک بڑھ کر سفّاک ہیں لیکن کسی نہ کسی کونے کھدرے سے کوئی خدا ترس بھی نکل ہی آتا ہے۔ میں نے سوچا یہاں مروں گی تو خواہ چندہ کر کے ہی سہی لیکن کوئی نہ کوئی عزت آبرو سے دفن تو کر دے گا۔ مُردہ خانے میں تو نہیں پڑی رہے گی لاش۔ انگریز بھی کیا سوچیں گے کہ کیسی لاوارث لڑکی ہے، کوئی لاش بھی لینے نہیں آ رہا۔" وہ خود استہزائی کے سے انداز میں ہنسی "میں انگریزوں کو اپنی لاش پر ہنسنے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔"

میرے دل کو بار بار کوئی مٹھی میں لے کر مسل رہا تھا۔ مگر میں بظاہر سکون اور خاموشی سے کار ڈرائیو کیے جا رہا تھا۔

گلبرگ پہنچ کر میں نے پہلے گھر جانے کے بجائے کار ایک اور جگہ لے جا روکی۔ یہ ایک چھوٹا سا مگر نہایت مہنگا پرائیویٹ اسپتال تھا۔ اس کا مالک ڈاکٹر بلال میرا جاننے والا تھا۔

"یہ تم مجھے کہاں لے آئے ؟" اس نے اسپتال کا بورڈ پڑھتے ہوئے کہا۔ پڑھتے وقت وہ یوں آنکھیں سکیڑ رہی تھی جیسے اس کی نظر بہت کمزور ہو گئی ہو۔

"تمھاری حالت بتا رہی ہے کہ تمھیں بہت زیادہ اور بہت اچھے علاج کی ضرورت ہے۔" میں نے کہا۔

وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی "میں خود گزیدہ ہوں۔ میرا علاج ڈاکٹروں کے پاس نہیں۔"

"زیادہ افسانوی بننے کی کوشش نہ کرو۔" میں نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے گاڑی سے اتارا۔ اس کا ہاتھ برف کی طرح سرد تھا۔

"خاموشی سے میرے ساتھ چلو۔" میں نے اسے ہدایت کی اور اندر لے گیا۔ اسے پرائیویٹ ویٹنگ روم میں بٹھا کر میں جا کر ڈاکٹر بلال سے ملا۔

"ٹھیک ہے میں ابھی اس کے ٹیسٹ اور ایکسرے وغیرہ کرا لیتا ہوں۔" ڈاکٹر بلال بولا "اس کے بعد ہی کوئی مشورہ دے سکوں گا۔"

میں خصوصی ویٹنگ روم میں واپس آ گیا۔ ایک اٹنڈنٹ میرے ساتھ تھا۔ وہ سلطانہ کو اپنے ساتھ لے گیا۔ میں وہیں بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ تقریباً پون گھنٹے بعد سلطانہ کی واپسی ہوئی۔ وہ اب اور بھی نڈھال نظر آ رہی تھی۔

"خدا کی پناہ !" وہ ہانپتے ہوئے بولی اور صوفے پر ڈھیر ہو گئی "میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ زندگی میں میرے اتنے ٹیسٹ اور ایکسرے ہوں گے۔ جو دو چار بوند خون جسم میں باقی تھا کم بختوں نے وہ بھی نکال لیا۔" وہ اپنی کلائی سہلانے لگی۔ اس کی گداز کلائی اب بالکل سوکھی ہوئی نظر آ رہی تھی اور اس پر نیلی نیلی نسوں کا جال پھیلا ہوا تھا۔

"لندن میں تم کیا کرتی تھیں ؟ میرا مطلب ہے گزر بسر کیسے ہوتی تھی ؟" میں نے پوچھا۔

"مروّجہ معاوضوں سے آدھے معاوضے پر ایک چھوٹی سی فیکٹری میں مزدوری کرتی تھی۔ کینوس کی جیکٹیں بنتی تھیں وہاں۔" اس نے جواب دیا۔ اس ویٹنگ روم میں ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر اس نے کوٹ کی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ سلگا کر ندیدے پن سے گہرے گہرے کش لینے لگی۔ نہایت گھٹیا برانڈ کا سگریٹ تھا اور اس کا تلخ دھواں مجھے بُرا لگ رہا تھا لیکن میں نے اسے سگریٹ پینے سے منع نہیں کیا۔

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر بلال نے مجھے اپنے آفس میں بلایا۔ ساری رپورٹیں اور ایکسرے اس کی میز پر پہنچ چکے تھے۔

"میں حیران ہوں خرّم ...!" وہ حد سے زیادہ سنجیدہ اور متفکر لہجے میں بولا "کہ یہ عورت اب تک اپنے ساتھ کیا کرتی رہی ہے ... اور میں اس پر بھی حیران ہوں کہ تم اسے اتنی تاخیر سے میرے پاس کیوں لائے ہو! دنیا کی مہلک ترین منشیات استعمال کر کر کے اس نے اپنا بیڑہ غرق کر لیا ہے۔ اس کے پھیپھڑے، گردے اور دیگر تمام جسمانی اعضا تقریباً ناکارہ ہو چکے ہیں۔ اس کے بچنے کی امید مجھے کم ہی نظر آتی ہے لیکن میں محسوس کر رہا ہوں کہ اس سے تمھارا کوئی جذباتی تعلق ہے اس لیے میں اسے بچانے کی پوری پوری کوشش کروں گا اور ذاتی توجہ سے اس کا علاج کروں گا۔ اسے بہت طویل اور سخت نگہداشت اور علاج کی ضرورت ہے اور اس کے بعد بھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

"تمھیں یہ بازی جیتنے میں میری مدد کرنا ہو گی بلال۔" میرے لہجے میں ہزاروں التجائیں چھپی ہوئی تھیں۔

"اس وقت میرے ہاں گنجائش نہیں ہے لیکن کل تک میں اس کے لیے کمرے وغیرہ کا انتظام کرا دوں گا۔ تم اسے کل شام لے آؤ، میں ایڈمٹ کر لوں گا۔" وہ بولا۔

"تھینک یو بلال !" میں نے کہا اور واپس ویٹنگ روم میں آیا۔ سلطانہ اب قدرے پُرسکون بیٹھی تھی۔ میں اسے گھر لے آیا۔

کھانے کے وقت تک وہ کئی سگریٹیں پی چکی تھی، کھانا اس نے برائے نام ہی کھایا۔ البتہ دوائیں کئی کھائیں پھر غنودگی زدہ لہجے میں بولی "مجھے سخت نیند آ رہی ہے۔"

میں نے ایک کمرہ اسے دکھاتے ہوئے کہا "یہ تمھارا کمرہ۔ کسی بھی چیز کی ضرورت ہو، وہ گھنٹی کا بٹن دبا دینا۔ ملازم فوراً آ جائے گا۔ مجھ سے کچھ کہنا ہو تو اسی کے ذریعے بلوا لینا۔ میں بھی فوراً آ جاؤں گا۔ ملازم ہی کی طرح۔"

وہ مخمور سے انداز میں مسکرا دی "تم اتنے مہربان ہو کہ بعض اوقات تمھارے احسانوں کے بوجھ تلے دم گھٹنے لگتا ہے۔"

"بکواس مت کرو اور سو جاؤ۔" میں نے اس کے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

دوسری صبح ملازم نے مجھے اطلاع دی کہ وہ اپنے کمرے میں نہیں ہے۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں دوڑ کر اس کے کمرے میں پہنچا۔ وہ واقعی وہاں نہیں تھی۔ بالکل اسی طرح غائب ہو چکی تھی جس طرح برسوں پہلے، پہلی ملاقات کے بعد غائب ہو گئی تھی اور حویلی کے کمرے میں میرے لیے ایک ہولناک سناٹا چھوڑ گئی تھی۔

گزشتہ رات تو مجھے بالکل اندیشہ نہیں تھا کہ وہ کہیں جا سکے گی۔ میرا خیال تھا کہ بستر پر گرنے کے بعد اس میں اُٹھنے کی بھی سکت نہیں ہو گی۔ تاہم اس بار یہ فرق ضرور تھا کہ سائیڈ ٹیبل پر وہ میرے لیے ایک خط چھوڑ گئی تھی۔ ٹیڑھے میڑھے اور شکستہ سے لفظوں میں لکھا تھا !

مسیحا !

تم خوامخواہ پریشان ہو۔ میرے بچنے کی امید کم ہی ہے۔ زندگی کے آخری دنوں میں مجھے تم بے کار کی پابندیوں میں مت جکڑو۔ تم بھی حیران ہو گے کہ میں کیا آسیب بن کر تمھاری زندگی میں گھس گئی ہوں۔

جہاں تک تمھارا سوال ہے تو میں آج تک فیصلہ نہیں کر سکی کہ مجھے تم سے بے پناہ محبت ہے یا بے انتہا نفرت۔ جب تم میرے روبرو ہوتے ہو.... میں تمھیں دیکھتی ہوں تو میرا دل چاہتا ہے کہ تمھارے قدموں میں سر رکھ کر جان دے دوں یا تمھارے لیے کوئی ایسا کام کروں جو آج تک کسی نے نہ کیا ہو۔ لیکن کبھی کبھی راتوں کو میں ایک ڈراؤنا... خواب دیکھتی ہوں کہ شعلوں میں گھری ہوئی ایک عورت دلدوز چیخیں مار رہی ہے، مدد کے لیے چلا رہی ہے مگر جواب میں گولیوں کی تڑتڑ سنائی دے رہی ہے۔ اور وہ عورت میری ماں ہے۔ میں پسینے میں شرابور اٹھ کر بیٹھ جاتی ہوں۔ اس لمحے میرا دل چاہتا ہے کہ کلہاڑی لے کر دوڑتی ہوئی جاؤں اور تمھارا سر تن سے جدا کر دوں کیوں کہ شہریار ملک اس دنیا میں نہیں ہے۔

میں سوچتی ہوں اچھا ہی ہوا کہ میری شادی تم سے نہیں ہوئی ورنہ شاید ایک صبح ایسی بھی طلوع ہوتی کہ میرے قریب بستر میں تم مردہ پائے جاتے اور اخبار میں خبر آتی "سفاک بیوی نے سوتے میں شوہر کا گلا کاٹ دیا۔" میں کسی طرح بھی دنیا کو سمجھا نہ پاتی کہ جس کا میں نے گلا کاٹا ہے اس سے مجھے بے پناہ محبت تھی، اس کے قدموں میں سر رکھ کر میرا جان دینے کو جی چاہتا تھا۔

خرّم ! میرا خیال ہے میرے ذہن میں کوئی گرہ پڑ گئی ہے۔ مجھے جانے ہی دو... بہت بے کار سی چیز ہوں میں۔ خدا حافظ۔ اور ہاں... کوئی اچھی سی لڑکی دیکھ کر شادی

ضرور کر لینا۔ مجھ جیسی نہیں ہونی چاہیے وہ۔

فقط: تمہاری سلطانہ

اس کے پورے بائیس دن بعد شام کو مجھے ایک فون آیا۔ کوئی عورت لرزاں سی آواز میں بول رہی تھی "آپ خرم ملک صاحب ہیں نا؟"

"جی ہاں۔ فرمائیے؟"

"وہ جی.... دراصل... کنیز فاطمہ میرا نام ہے۔" وہ کچھ پریشان لگتی تھیں "میں بیوہ ہوں۔ اپنے مکان کے چار کمرے میں نے ضرورت مند لڑکیوں کو کرائے پر دیے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام سلطانہ ہے...."

"جی ہاں۔ جی ہاں... کہاں ہے وہ؟ کیا حال ہے اس کا؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"تو آپ اسے جانتے ہیں" خاتون نے گویا قدرے اطمینان کی سانس لی۔

"جی ہاں۔ مسئلہ کیا ہے؟" میری بے تابی بڑھتی جا رہی تھی۔

"وہ جی.... دراصل دو دن سے اس کے کمرے کا دروازہ ہی نہیں کھلا تھا۔ دستک دینے پر بھی کوئی جواب نہیں آ رہا تھا۔ آج میں نے ڈپلیکیٹ چابی سے کھولا تو سلطانہ بستر میں بے ہوش پڑی تھی۔ اس کی حالت بہت خراب لگتی ہے.... بالکل مرنے کے قریب.... میرا.... مطلب ہے اگر آپ اس کے جاننے والے ہیں تو پلیز اسے یہاں سے لے جائیں.... دیکھیں نا... میں ایک مجبور بیوہ ہوں.... اگر وہ یہاں مر گئی تو میرے لیے کوئی الجھن کھڑی نہ ہو جائے۔ برا مت منائیے گا...."

"آپ مجھے صرف اپنا ایڈریس سمجھا دیجیے" میں نے ان کی مزید معذرتیں سنے بغیر بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"میں سمن آباد سے بول رہی ہوں...." وہ اپنے گھر کا محل وقوع سمجھانے کے بعد بولیں "پلیز ذرا جلدی آیئے گا۔ اس کی نبض بالکل ڈوب رہی ہے۔"

میں ریسیور رکھنے لگا پھر مجھے کچھ خیال آیا۔ میں نے پوچھا "آپ کو میرا فون نمبر کہاں سے ملا؟"

"میں نے اسی قسم کی کسی چیز کی تلاش میں سلطانہ کے پرس کی تلاشی لی تھی" وہ بولیں اور ساتھ ہی گویا انہیں صفائی پیش کرنے کا خیال آ گیا "اس کے پرس میں کوئی قیمتی چیز کوئی روپیہ پیسہ نہیں تھا۔ میں نے تو دو ماہ سے اس بے چاری سے کرایہ بھی نہیں لیا۔ اس کے پرس میں بہت پرانا.... مڑا تڑا سا بس ایک وزیٹنگ کارڈ تھا جو آپ کا تھا۔ اسی پر نمبر دیکھ کر میں آپ کو فون کر رہی ہوں...."

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ چند لمحے بعد میری گاڑی... آندھی طوفان کی طرح سمن آباد کی طرف جا رہی تھی اور میں ہر موڑ پر دو پہیوں پر ٹرن لے رہا تھا۔ کئی دیکھنے والوں نے شاید گالی دیتے ہوئے کہا بھی ہو "نو دولتیے کہیں کے...!"

میری آنکھیں بار بار آنسوؤں سے دھندلائی جا رہی تھیں اور میں انہیں آستین سے پونچھ رہا تھا۔

جب میں نے پیلی سی اس سالخوردہ کوٹھی کے پورچ میں گاڑی روکی تو ادھیڑ عمر کی ایک فربہ اندام سی عورت تقریباً دوڑتی ہوئی باہر آئی اور پچھلے راستے سے مجھے انیکسی کے ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گئی۔

دونوں ہاتھ سینے پر رکھے سلطانہ ایک چھوٹے سے بیڈ پر ساکت پڑی تھی۔ میرا جی چاہا اسے بازوؤں پر اٹھا کر اڑتا ہوا کسی مافوق الفطرت مسیحا کے پاس پہنچوں جو اس لڑکی کے اندر چھپے ہوئے سارے زخموں کو مندمل کر کے اس میں ایک نئی روح پھونک دے۔

مگر مجھے دیر ہو چکی تھی!

اس کی نبض معدوم تھی۔ دھڑکن رک چکی تھی۔ دل سو چکا تھا۔

مگر اس کے چہرے پر بلا کا سکون تھا۔ وہ ایک وحشی و جہاندیدہ لڑکی کے بجائے ایک معصوم اور کم سن بچی لگ رہی تھی۔

میں اس کے پلنگ کی پٹی پر سر ٹکا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

(بنیادی خیال پاکیزہ کی ایک کہانی سے ماخوذ)

In order to Join WhatsApp group

1. Go to an individual or group chat.
2. Tap the camera icon.
3. Select the image with the QR code to scan.
4. Tap Add to contacts.

THE BOOK'S HIVE

WhatsApp group